تلاش حق

جلد اوّل

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین، ایم-اے، پی ایچ-ڈی

مقامات اشاعت

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - قرولباغ - دہلی (ناشر)
انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) (سول ایجنٹ جنوبی ہند)
فرینک برادرس اینڈ کمپنی - چاندنی چوک - دہلی (سول ایجنٹ یو پی)
ایس حید اینڈ برادرس متصل فوارہ - دہلی (سول ایجنٹ دہلی)
یونیورسل بک اینڈ اسٹیشنری ہاوس۔ کشمیری گیٹ دہلی (سول ایجنٹ پنجاب)
قیمت ایک روپیہ

تہدیہ

میں اس ترجمہ کو اپنے دوست اور سردار ذاکر صاحب کی
خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

حدیث اہل دل با اہل دل گو

عابد

فہرست مضامین

حصہ دوم

حصہ سوم

ہم محب قوم سیٹھ لچھمی نراین صاحب گاڈودیا کا دل سے شکریہ ادا کرتے
ہیں کہ ان کے ایک ہزار روپیہ کے گرانقدر عطیہ نے اس کتاب کی اشاعت کے
ابتدائی مراحل کو بہت آسان کر دیا۔

ناشر

۳

تمہید

چار پانچ سال ہوئے میں نے اپنے چند عزیز رفیقوں کے کہنے سے اپنی زندگی کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا۔ ابتدا تو میں نے کر دی مگر ابھی پہلا ورق الٹنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی کہ بمبئی میں بلوے شروع ہو گئے اور یہ کام رک گیا۔ اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جن کا انجام یہ ہوا کہ میں قید ہو کر یراؤدا کے جیل میں پہنچ گیا۔ اسی جیل میں میرے ساتھ جیرام داس جی بھی قید تھے۔ انہوں نے فرمایش کی کہ تم سب کام چھوڑ کر آپ بیتی کو ختم کر دو۔ میں نے کہلا بھیجا کہ میں اپنے لئے مطالعے کا پروگرام بنا چکا ہوں اور جب تک اسے پورا نہ کر لوں "کسی اور کام کا خیال" بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اگر میں قید کی پوری میعاد یراؤدا میں گذارتا تو آپ بیتی ضرور ختم ہو جاتی کیونکہ جب میں چھوٹا ہوں تو پورا ایک سال اس کام کے لئے باقی تھا۔ اب سوامی آنند جی نے پھر اصرار شروع کیا ہے۔ اور میں بھی جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ سے فارغ ہو گیا ہوں اس لئے جی چاہتا ہے کہ نوجیون میں چھاپنے کے لئے آپ بیتی لکھنا شروع کر دوں۔ سوامی جی یہ چاہتے تھے کہ میں اسے الگ لکھوں اور کتاب کی صورت میں چھپواؤں۔ مگر مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا کر سکتا ہوں کہ ہفتہ وار ایک باب لکھتا جاؤں۔ آخر نوجیون کے لئے ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ پھر آپ بیتی ہی کیوں نہ لکھ دیا کروں۔ سوامی جی اس پر راضی ہو گئے۔ لیجئے میں نے بھی محنت سے کام شروع کر دیا۔

مگر میرے ایک باخدا[1] دوست کو اس بارے میں کچھ شبہے تھے جو انہوں نے
میری خاموشی کے دن[2] مجھ سے بیان کئے۔ انہوں نے کہا "یہ آپ کو کیا سوجھی کہ
اس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ بیتی لکھنا مغربی ملکوں کا دستور ہے۔ میں نے
آج تک نہیں سنا کہ مشرق میں سوا ان لوگوں کے جن پر مغرب کا اثر ہو گیا ہے کسی
نے آپ بیتی لکھی ہو۔ اور آپ لکھیں گے کیا؟ فرض کیجئے آج آپ جن اصولوں
کے قائل ہیں انہیں کل ترک کر دیں یا اب جو تجویزیں آپ کے سامنے ہیں وہ آئندہ
بدل جائیں تو کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ جو لوگ آپ کی تحریر اور تقریر پر عمل کرتے ہیں وہ دھوکے
میں پڑ جائیں گے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ابھی اس قسم کی کتاب
نہ لکھیں بلکہ کبھی نہ لکھیں؟

ان دلیلوں کا مجھ پر کچھ اثر ضرور ہوا لیکن اصل میں میرا مقصد اُس قسم کی کتاب
لکھنا نہیں ہے جو آپ بیتی کہلاتی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے
حق کی تلاش میں جو تجربے کئے ہیں اُنکی کہانی سنا دوں۔ یہ سچ ہے کہ میری ساری
عمر انہی تجربوں میں گزری ہے اس لئے یہ کہانی آپ بیتی بن جائے گی۔ لیکن
اگر کتاب کے ہر صفحے میں سوا ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں (ایسی
آپ بیتی لکھنے میں) کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ اب چاہے یہ میرے نفس کا فریب
ہو مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا ایک مسلسل بیان پڑھنے والوں کے لئے

---

(۱) انگریزی ترجمے میں ہے God fearing ہے جس کا ترجمہ خدا ترس کرنا چاہیے
مگر مہاتما جی جب اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو متقی پرہیزگار کی جگہ باخدا کا لفظ استعمال کرتے ہیں
اس لئے ہم نے بھی یہی لفظ رکھا۔

(۲) ہفتہ میں ایکدن دوشنبہ کو مہاتما جی کسی سے بات نہیں کرتے اور یہ دن ینگ انڈیا اور نوجیون کیلئے
مضمون لکھنے میں صرف کرتے ہیں (ع)

فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ سیاست کے میدان میں جو تجربے میں نے کئے ہیں وہ ہندوستان میں بلکہ ایک حد تک "مہذب" دنیا میں بھی مشہور ہوگئے ہیں، میری نظر میں نہ ان تجربوں کی کوئی وقعت ہے اور نہ "مہاتما" کے لقب کی جو ان کی بنا پر مجھے لوگوں نے دے رکھا ہے۔ مجھے اکثر اس لقب سے بہت دُکھ پہنچا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس نے میرے دل کو نہیں لبھایا۔ البتہ ان روحانی تجربوں کو میں خوشی سے بیان کروں گا جو صرف مجھی کو معلوم ہیں اور جن کی بدولت مجھے سیاسی میدان میں کام کرنے کے لئے تھوڑی بہت قوت حاصل ہوئی۔ اگر یہ تجربے واقعی روحانی ہیں تو خودستائی کی ذرا بھی کچھ گنجایش نہیں۔ ان کا کچھ اثر میری ذات پر ہو سکتا ہے تو یہی کہ میری عاجزی اور بڑھ جائے۔ گزرے ہوئے زمانے پر میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اتنی ہی مجھ پر اپنی نارسائی کھلتی جاتی ہے۔

وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے جس کی آرزو اور سعی میں تیس سال سے بےچین ہوں، معرفت نفس، دیدار الٰہی، حصول "موکشا"[1] ہے۔ یہی تلاش، یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے، یہی میری زندگی ہے۔ میری تحریر و تقریر کا، میری ساری سیاسی جد و جہد کا یہی مقصد ہے۔ لیکن چونکہ مجھے ہمیشہ سے یقین ہے کہ جو کام ایک شخص کے لئے ممکن ہے وہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس لئے میں نے جتنے تجربے کئے وہ خلوت کی تاریکی میں نہیں بلکہ جلوت کی روشنی میں کئے؛ اور میرے خیال میں اس سے اُن کی روحانی قدر و قیمت میں کوئی

---

(۱) لفظی معنی پیدایش اور موت سے چھٹکارا (م) اردو میں نجات ابدی کہہ سکتے ہیں۔ (ع)

(م) سے مراد ہیں مہادیو دیسائی جنہوں نے اسکا گجراتی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور (ع) سے

کمی نہیں ہوئی بعض معاملے بندے اور خدا کے درمیان ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی اور کو خبر نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بیان میں نہیں آسکتیں۔ جن تجربوں کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ایسے نہیں ہیں۔ مگر ہیں یہ بھی روحانی بلکہ یوں کہئے کہ اخلاقی تجربے، کیونکہ اخلاق ہی مذہب کی جان ہے۔

اس کہانی میں صرف اُن مذہبی باتوں کا ذکر ہوگا جنہیں بچّے اور بوڑھے دونوں اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر میں ان کو جذبات سے الگ ہو کر سچائی اور عاجزی سے بیان کر سکا تو ان سے اور بہت سے تجربہ کرنے والوں کو روحانی ترقی میں مدد ملے گی۔ میرا ہرگز یہ دعوےٰ نہیں کہ یہ تجربے مکمل ہیں۔ میں انہیں اس سے زیادہ قابل وثوق نہیں سمجھتا جتنا ایک دیانت دار سائنس داں اپنے تجربوں کو سمجھتا ہے۔ وہ بہت صحت کے ساتھ، خوب سمجھ بوجھ کر، ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتے ہوئے تجربے کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے یہ دعوےٰ نہیں ہوتا کہ جو نتیجے اُسے حاصل ہوئے وہ آخری اور قطعی ہیں بلکہ وہ ان میں ترمیم اور اصلاح کی گنجایش سمجھتا ہے۔ میں نے بہت گہرے مشاہدۂ باطن سے کام لیا ہے اپنے نفس کو اچھی طرح ٹٹولا ہے اور ہر نفسیاتی حالت کی تحلیل کی ہے لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں وہ آخری اور قطعی یا خطا سے بری ہیں۔ البتہ اتنا دعوےٰ مجھے ضرور ہے کہ میری ذات کے لئے یہ نتیجے بظاہر بالکل صحیح اور فی الحال قطعی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان پر اپنے عمل کی بنیاد نہ رکھتا لیکن میں نے ہمیشہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے غور کر لیا ہے کہ کس نتیجے کو قبول کروں اور کسے رد کروں اور اس کے بعد جو رائے قائم ہوئی اُس پر عمل کیا ہے۔ جہاں تک میرے افعال میری عقل اور میرے دل کو مطمئن کر سکیں میرا فرض ہے کہ اپنے پچھلے فیصلوں پر مضبوطی سے قائم رہوں۔

اگر مجھے محض علمی اصولوں پر بحث کرنا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مجھے آپ بیتی لکھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے تھی لیکن چونکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں پر جس طرح مختلف صورتوں میں عمل کیا گیا اس کا حال سناؤں اس لئے میں نے ان چند بابوں کا جو میں لکھ رہا ہوں، یہ نام رکھا ہے "ان تجربوں کی کہانی جو میں نے تلاش حق میں کئے"[1]۔ ظاہر ہے کہ اس میں عدم تشدد، تجرد کی زندگی وغیرہ اخلاقی اصولوں کے تجربے بھی شامل ہیں جنہیں لوگ حق سے جدا سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک حق اصل اصول ہے جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں۔ یہاں حق سے مراد محض لفظوں کی سچائی نہیں بلکہ خیال کی سچائی بھی ہے؛ اور سچائی بھی ہمارے ادراک کی اعتباری[2] سچائی نہیں بلکہ حق محض[3] جو ہر ابدی یعنی خدا کی بیشمار تعریفیں کی گئی ہیں کیونکہ اس کے نور کی تجلیاں بیشمار ہیں۔ انکے تصور سے مجھ پر رعب اور حیرت طاری ہو جاتی ہے اور میں ایک لمحے کے لئے ان میں محو ہو جاتا ہوں لیکن خدا کی پرستش میں اسے حق محض سمجھ کر کرتا ہوں۔ میں نے اسے اب تک نہیں پایا مگر میں اسے برابر ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں اس جستجو کی راہ میں ان سب چیزوں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں جو مجھے عزیز ہیں یہانتک کہ اگر میری جان کی قربانی طلب کیجائے تو انشاء اللہ مجھے اس میں بھی تامل نہ ہوگا۔ لیکن جب تک میری رسائی حق محض تک نہ ہو اس وقت تک مجھے لازم ہے کہ اعتباری حق کا جو تصور میرے ذہن میں ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہوں۔ اس وقت

---

(۱) ہم نے اختصار کے خیال سے اردو ترجمے کا نام "تلاش حق" رکھا ہے۔ (ع)

(۲) Relative

(۳) Absolute

تک یہی اعتباری حق میرے لئے شمع ہدایت ہے اور یہی میرا زرہ بکتر۔ اگرچہ یہ راہ کٹھن ہے اور تنگ اور تلوار کی دھار کی طرح تیز مگر میرے لئے یہی سب سے سیدھی اور سہل ثابت ہوئی ہے۔ میری ہمالیہ کے برابر غلطیاں بھی میری نظر میں ہیچ ہیں کیونکہ میں نے اس راہ سے ذرا بھی قدم نہیں ہٹایا۔ اسی راہ نے مجھے ہلاکت سے بچایا اور میں اپنے ایمان کی روشنی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اکثر مجھے اس سفر میں حق محض یعنی خدائے برحق کی جھلک نظر آئی اور مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ صرف اس کی ذات حقیقی وجود رکھتی ہے اور سب چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ جس کا جی چاہے دیکھے کہ مجھے یہ یقین کیونکر حاصل ہوا ہے۔ آئیے اور میرے تجربوں میں شریک ہو اور اگر اس سے ہو سکے تو میرے اس یقین میں بھی۔ اسکے علاوہ مجھے یہ بھی یقین ہوتا جاتا ہے کہ جو چیز میرے لئے ممکن ہے وہ ایک بچے تک کے لئے ممکن ہے اور میرے اس قول کی معقول وجہیں ہیں۔ تلاش حق کی راہیں دشوار بھی ہیں اور آسان بھی، ممکن ہے کہ ایک مغرور آدمی کے لئے ان راہوں پر چلنا ناممکن ہو اور ایک معصوم بچے کے لئے ممکن ہو۔ طالب حق کو خاک راہ سے بھی زیادہ خاکسار ہونا چاہئے۔ دنیا خاک کو پیروں سے کچلتی ہے لیکن طالب حق کو ایسی عاجزی اختیار کرنا چاہئے کہ خاک بھی اسے کچل سکے۔ تبھی اس کو حق کی جھلک دکھائی دے گی۔ بے اس کے کبھی نہیں۔ واسشٹا اور وشوامترا کی گفتگو میں یہ بات خوب ثابت کی گئی ہے عیسائیت اور اسلام بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

•

جو کچھ میں ان صفحوں میں لکھ رہا ہوں اگر اس میں سے کسی چیز میں پڑھنے والوں کو غرور کا شائبہ بھی نظر آئے تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ میری تلاش میں

جیسے سیکڑوں کی شہرت خاک میں ملجائے مگر حق کا بول بالا رہے۔ مجھ جیسے فانی انسانوں کے اعمال کا محاسبہ کرنے میں آپ کو حق کے معیار سے بال برابر بھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔

مجھے امید ہے کہ کوئی شخص ان نصیحتوں کو جو آئندہ بابوں میں جا بجا کی جائیں گی محض میرے قول یا فعل کی سند پر قبول نہ کرے گا اور میری دعا ہے کہ کوئی ایسا نہ کرے۔ جن تجربوں کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں مثال کے طور پر سمجھنا چاہیئے اور انکی روشنی میں ہر شخص کو اپنی خواہش اور اپنی استعداد کے مطابق خود تجربے کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ۔ یہ تھوڑی سی مدد میرے تجربوں سے لوگوں کو ضرور ملے گی کیونکہ میں کسی ناگوار بات کو جس کا بیان کرنا ضروری ہے۔ نہ تو چھپاؤں گا اور نہ گھٹا کر بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں پڑھنے والوں کو اپنے سارے عیبوں اور ساری خطاؤں سے آگاہ کر دوں گا۔ میرا مقصد لوگوں کو یہ بتانا نہیں کہ دیکھو میں کتنا اچھا ہوں بلکہ فن ستیاگرہ کے تجربوں کو بیان کرنا ہے۔ میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے میں حق کی طرح سخت گیر ہونے کی کوشش کروں گا اور یہی میں دوسروں سے چاہتا ہوں۔ جب میں اپنے آپ کو اس پیمانے پر ناپتا ہوں تو مجھے بے اختیار سورداس کا ہمزبان ہو کر کہنا پڑتا ہے:۔

کہاں ہے کوئی ایسا کمبخت
قابل نفرت گنہگار جیسا میں ہوں؟
میں نے چھوڑ دیا اپنے خالق کو
یہ حال ہے میری بیوفائی کا۔

کیونکہ یہ خیال میرے لئے ہمیشہ سوہان روح رہتا ہے کہ میں اب تک اپنے خدا سے اتنا دور رہوں جو، مجھے خوب معلوم ہے، میری زندگی کی ہر سانس کا مالک و مختار ہے، جس کے دریا کا میں ایک قطرہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ میری ہوائے نفس ہی ہے جو مجھے اس سے دور رکھتی ہے لیکن پھر بھی مجھ سے یہ نہیں ہوتا کہ اس سے دامن چھڑا لوں۔

اب یہ تمہید مجھے ختم کر دینا چاہیئے۔ اصل کہانی آئندہ باب میں شروع ہو گی۔

م۔ ک۔ گاندھی

سابرمتی آشرم

۲۶ نومبر ۱۹۲۵ء

تلاش حق

حصہ اول

پہلا باب

پیدائش اور نسب

گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنئے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دکان کرتے تھے۔ لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاوار کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرے دادا اُتم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصول کے بڑے پکے تھے۔ ریاست کی سازشوں سے مجبور ہو کر انہیں پوربندر سے جہاں وہ دیوان تھے، جوناگڑھ جانا پڑا۔ وہاں انہوں نے نواب صاحب کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا۔ کسی شخص کی نظر اس حرکت پر پڑ گئی جو بظاہر بے ادبی معلوم ہوتی تھی اُس نے اس کی وجہ پوچھی تو میرے دادا نے کہا "سیدھا ہاتھ پوربندر کے راجہ کی خدمت کا پابند ہو چکا ہے" اوتا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اور اُنہوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے اُن کے چار لڑکے تھے اور دوسری سے دو لڑکے، جہاں تک مجھے یاد ہے بچپن میں مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اوتا گاندھی کے یہ سب لڑکے ایک ماں سے نہیں ہیں۔ ان چھ بھائیوں میں تلسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے اور ان سے بڑے کرم چند گاندھی عرف کبا گاندھی تھے۔ یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پوربندر کے دیوان رہے۔ کبا گاندھی میرے والد تھے۔ وہ راجستانی عدالت کے رکن بھی تھے۔ یہ عدالت اب ٹوٹ گئی ہے مگر ان دنوں والیان

ریاست اور ...

بڑی بااثر جماعت تھی۔ کبا گاندھی کچھ دن راجکوٹ میں دیوان رہے اور اس کے بعد وانکانیر میں بھی۔ جب ان کا انتقال ہوا اس زمانے میں وہ ریاست راجکوٹ سے پنشن پاتے تھے۔

انہوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں کیونکہ انکی تین بیویاں ایک ایک کر کے مر گئیں۔ ان کی پہلی اور دوسری بیوی سے دو لڑکیاں ہوئیں چوتھی بیوی سے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہوئے جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔

میرے والد اپنی برادری کے بڑے خیر خواہ اور بہادر اور فیاض آدمی تھے لیکن نازک مزاج بھی بہت تھے۔ شاید وہ کسی حد تک جسمانی لذتوں کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ چالیس برس سے زیادہ کی عمر میں انہوں نے چوتھی شادی کی۔ لیکن وہ کبھی رشوت نہیں لیتے تھے اور اپنوں اور بیگانوں میں اُن کی منصف مزاجی کی دھوم تھی۔ ریاست کے ساتھ انکی وفاداری مشہور تھی۔ کسی اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ نے اُنکے سردار ٹھاکر صاحب راجکوٹ کا ذکر توہین آمیز الفاظ میں کیا تو انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ایجنٹ کو غصہ آ گیا اور اُس نے کہا کہ معافی مانگو۔ کبا گاندھی نے صاف انکار کیا اس لئے وہ چند گھنٹے تک حراست میں رکھے گئے۔ لیکن جب ایجنٹ نے ان کی ثابت قدمی دیکھی تو اُسے رہائی کا حکم دینا پڑا۔

میرے والد کو دولت جمع کرنے کی ہوس نہ تھی۔ انہوں نے ہمارے لئے بہت کم جائداد ترکے میں چھوڑی۔ انہوں نے سوائے تجربے کے مدرسے کے کہیں تعلیم نہیں پائی۔ زیادہ سے زیادہ ان کی لیاقت گجراتی کے پانچویں درجے کے برابر ہوگی۔ تاریخ اور جغرافیہ سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ لیکن عملی کاموں

یں بہت وسیع تجربے رکھتے تھے جس سے انہیں بڑی بڑی پیچیدہ گتھیوں کو
لجھانے اور سیکڑوں آدمیوں سے نبٹنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ ان کی مذہبی
علیم بہت کم تھی لیکن ان میں وہ دینداری موجود تھی جو مندروں میں آنے جانے
ور مذہبی تقریروں کے سننے سے بہت سے ہندوؤں میں پیدا ہو جاتی ہے۔
خر عمر میں وہ ایک عالم برہمن کے کہنے سے جو ہمارے خاندان کے دوست تھے
بھگوت گیتا کی تلاوت کرنے لگے تھے اور پوجا کے وقت اس کے چند اشلوک زور
ورسے پڑھا کرتے تھے۔

والدہ صاحبہ کے متعلق میرے حافظے میں سب سے گہرا نقش انکی عبادت
ور پرہیزگاری کا ہے۔ وہ بڑی پکی دیندار تھیں: ناممکن تھا کہ وہ کبھی ان
دعاؤں کے بغیر جو وہ روز پڑھا کرتی تھیں، کھانا کھالیں "حویلی"، یعنی وشنو
مندر میں جانا انکے روزانہ فرائض میں داخل تھا۔ جہانتک میری یاد کام
رتی ہے انہوں نے کبھی "چتر ماس (۱)" قضا نہیں کیا۔ وہ سخت سے سخت
ریاضتوں کی نذر مان لیتی تھیں اور اُسے انتہائی ثابت قدمی سے پورا کرتی تھیں
بیماری کے سبب سے وہ کبھی اس میں ڈھیل نہیں ڈالتی تھیں۔ بیمار ہونا ان
کے نزدیک کوئی عذر نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ "چندرائنا (۲)" کی نذر ماننے
کے بعد بیمار ہوگئیں مگر انہوں نے اپنی نذر میں خلل نہ پڑنے دیا۔ دو تین دن

---

(۱) لفظی معنی چار مہینے کا زمانہ۔ اس نذر کو کہتے ہیں جس کی رو سے برسات کے چار مہینوں
میں برابر پورے یا آدھے روزے رکھے جاتے ہیں۔ (م)

(۲) ایک طرح کا روزہ جس میں کھانے کی مقدار چاند کے گھٹنے بڑھنے کے حساب سے
گھٹتی بڑھتی ہے۔ (م)

روزنے پر روزہ رکھنا اُنکے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ "چترماس" میں دن میں صرف ایک وقت کھانا انکی عادت میں داخل تھا۔ ایک "چترماس" میں انہیں اس سے تسکین نہ ہوئی تو انہوں نے ایک دن بیچ پورا روزہ رکھنے کی نذر مان لی۔ ایک بار اسی زمانے میں انہوں نے یہ نذر مانی کہ جب تک سورج نہ دیکھ لوں گی کھانا نہیں کھاؤنگی ہم سب بچے اُن دنوں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ سورج نکلتے دیکھیں تو والدہ کو خبر دیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب برسات کا موسم شباب پر ہوتا ہے تو سورج اکثر بے التفاتی سے منہ چھپا لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ یک بیک سورج کو بادلوں سے نکلتے دیکھکر ہم لوگوں نے دوڑ کر انہیں خبر دی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئیں کہ اپنی آنکھ سے دیکھیں مگر اتنی دیر میں سیاب وش سورج غائب ہوگیا اور انہیں کھانا نصیب نہ ہوا۔ مگر وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے یہی کہتی تھیں "کوئی ہرج کی بات نہیں، خدا کی مرضی نہ تھی کہ میں آج کھانا کھاؤں" اور جاکر روزمرہ کے دھندے میں مصروف ہوجاتی تھیں۔

میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں۔ انہیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھی اور محل کی خواتین انکی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔ میں اکثر بچپن کے حقوق سے فائدہ اٹھاکر انکے ساتھ محل میں جایا کرتا تھا اور مجھے ابتک یاد ہے کہ ان سے اور ٹھاکر صاحب کی والدہ سے بارہا خوب خوب بحثیں ہوئیں۔

میں ان ماں باپ کے گھر میں ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بہ مقام پوربندر جسے سدامپری بھی کہتے ہیں پیدا ہوا۔ میرا بچپن کا زمانہ پوربندر ہی میں گذرا۔ مجھے یاد ہے کہ میں مدرسے میں بٹھایا گیا تھا۔ مجھے پہاڑے یاد کرنے میں کسی قدر دقت ہوئی۔ مجھے اس زمانے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے اُستاد کو بُرا بھلا کہا کرتا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا ذہن کند تھا اور میرا حافظہ کمزور۔

دوسرا باب

بچپن

میری عمر سات برس کی ہوگی کہ میرے والد راجستانی عدالت کے رکن ہوکر پوربندر سے راجکوٹ گئے۔ وہاں میں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں اور استادوں کے نام اور انکی اور بہت سی باتیں بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ پوربندر کی طرح یہاں بھی میری پڑھائی کے متعلق کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میں معمولی سا طالب علم تھا اس مدرسے سے میں مضافات کے ایک اسکول اور وہاں سے بارہ برس کی عمر میں ہائی اسکول گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس قلیل عرصے میں میں کبھی اپنے استادوں سے، اپنے ہم مکتبوں سے جھوٹ نہیں بولا۔ میں بہت شرمیلا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ میری کتابوں اور میرے کام کے کوئی میرا رفیق نہ تھا۔ گھنٹہ بجتے ہی اسکول پہنچ جانا اور چھٹی ہوتے ہی گھر بھاگنا میرا روزمرہ کا معمول تھا۔ میں سچ مچ بھاگتا ہوا جاتا تھا کیونکہ مجھے کسی سے بات کرنے کی تاب نہ تھی۔ یہ بھی خوف رہتا تھا کہ کوئی میری ہنسی نہ اڑائے۔

ہائی اسکول میں پہلے سال امتحان کے موقعے پر ایک واقعہ پیش آیا جو قابل ذکر ہے۔ مسٹر جائلس انسپکٹر اسکول معائنے کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہجے کی مشق کے لئے پانچ لفظ لکھوائے انمیں سے ایک لفظ Kettle[1]

---

[1] انگریزی میں کیتلی کو کہتے ہیں۔ (ع)

تھا۔ میں نے اس کے ہجے غلط لکھے۔ استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھکرا کر آگاہ کرنا چاہا مگر میں باخبر نہ ہوا۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجے نقل کر لوں کیونکہ میرے خیال میں استاد وہاں تھے ہی اس لئے کہ ہمیں نقل نہ کرنے دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب لڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے ہجے صحیح نکلے۔ ایک میں ہی بیوقوف ثابت ہوا۔ بعد میں اُستاد نے مجھے میری یہ بیوقوفی سمجھانا چاہی مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مجھے "نقل کرنے" کا فن کبھی نہ آیا۔

تاہم استاد کی جو عزت میرے دل میں تھی اُس میں اس واقعے سے کوئی فرق نہ آیا۔ مجھ میں یہ قدرتی بات تھی کہ بڑوں کی بُرائی نظر نہ آتی تھی۔ آگے چل کر مجھے ان استاد کی اور کمزوریاں بھی معلوم ہوئیں مگر میں اسی طرح اُنکا ادب کرتا رہا کیونکہ میں نے بڑوں کی فرمانبرداری سیکھی تھی ان کے کاموں پر نکتہ چینی کرنا نہیں سیکھا تھا۔

اس زمانے کے دو اور واقعات میرے حافظے میں ہمیشہ نقش رہے۔ عام طور سے سوائے اسکول کی کتابوں کے اور کسی کتاب میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ مجھے اپنا روزانہ سبق چار و ناچار یاد کرنا پڑتا تھا۔ مجھے استاد کی خفگی بری لگتی تھی اور انہیں دھوکا دینا بھی پسند نہ تھا اس لئے میں سبق یاد تو کر لیتا تھا لیکن بید لی سے۔ غرض جب سبق ہی جیسا چاہئے یاد نہ ہوتا تھا تو اور کتابوں کے پڑھنے کا کیا ذکر ہے۔ مگر خدا جانے کیونکر میری نظر ایک کتاب پر پڑی جو میرے والد نے خریدی تھی یہ شرون پتری بھکتی ناٹک (شرون کے احترام والدین کا ناٹک) تھا۔ میں نے اسے بیحد شوق سے پڑھا۔ اُسی زمانے میں ہمارے یہاں سفری ناٹک والے آئے۔ میں نے جو سین دیکھے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ شرون

اپنے کندھوں پر ایک بہنگی رکھے اپنے اندھے ماں باپ کو جاترا کے لئے لے جا رہا ہے
یہ کتاب اور یہ منظر میرے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ مٹائے نہ مٹیں۔ میں نے اپنے
دل میں کہا " دیکھ یہ مثال ہے جس کی تجھے تقلید کرنا چاہئے " شرون کے مرنے
پر اس کے والدین جو دردناک بین کئے تھے انکی یاد بھی میرے دل میں اب تک
تازہ ہے۔ اس دلگداز سے نے مجھے تڑپا دیا اور میں اسے اپنے ارگن باجے پر
جو مجھے میرے والد نے خرید دیا تھا بجایا کرتا تھا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ایک اور ناٹک کا ہے۔ اسی زمانے میں اپنے والد
کی اجازت سے میں ایک ناٹک کی کمپنی کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس تماشے " ہریش چندر "
نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں اُسے بار بار دیکھتا تھا اور نہ تھکتا تھا۔ مگر آخر مجھے
کہاں تک جانے کی اجازت ملا کرتی ؟ یہ تماشا میرے جی میں بس گیا تھا اور خدا
جانے کتنی بار میں نے دل ہی دل میں ہریشچندر کا پارٹ کیا ہوگا۔ " سب لوگ
ہریش چندر کی طرح سچے کیوں نہ ہو جائیں ؟ " یہ سوال میں اپنے دل میں دن
رات کیا کرتا تھا۔ حق کی پیروی کرنا اور وہ سب کچھ سہنا جو ہریش چندر نے سہا
تھا بس یہی ایک نصب العین تھا جس کی لگن اس تماشے نے میرے دل کو
لگا دی تھی۔ میں ہریش چندر کے قصے کو نقط بہ نقط سچ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال کرکے
میں رونے لگتا تھا۔ آج میری عقل مجھ سے کہتی ہے کہ ہریش چندر کوئی تاریخی
شخص نہیں ہو سکتا۔ مگر میرے لئے ہریشچندر اور شرون دونوں جیتی جاگتی
حقیقت ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اب اُن ناٹکوں کو پھر پڑھوں تو مجھ پر
اتنا ہی اثر ہو جتنا پہلے ہوا تھا۔

تیسرا باب

بچپنے کی شادی

میرا بہت جی چاہتا ہے کہ مجھے یہ باب لکھنا نہ پڑے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کہانی کے دوران میں مجھے بہت سے ایسے تلخ گھونٹ پینا ہے۔ اور اگر مجھے حق کی پرستاری کا دعوے ہے تو سوا اس کے چارہ بھی نہیں۔ میرا دردناک فرض ہے کہ اپنی شادی کا ذکر کروں جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں جو میری نگرانی میں ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں مبارکباد دوں کہ وہ اس مصیبت سے محفوظ رہے ہیں جو مجھ پر پڑی تھی۔ مجھے اتنی کمسنی کی شادی کے لئے کوئی اخلاقی دلیل نظر نہیں آتی۔

کہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو غلط فہمی نہ ہو۔ میری منگنی نہیں بلکہ شادی ہوئی تھی۔ کاٹھیاواڑ میں منگنی اور شادی دو الگ الگ رسمیں ہیں۔ منگنی اسے کہتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکی کے والدین انکی شادی کا وعدہ کرلیں اور یہ ہونے کے بعد چھوٹ بھی سکتی ہے۔ منگنی کے بعد لڑکا مرجائے تو لڑکی بیوہ نہیں ہوتی یہ معاہدہ دونوں کے والدین آپس میں کرلیتے ہیں۔ لڑکے لڑکی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اکثر انہیں اس کی اطلاع تک نہیں دی جاتی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میری منگنی تین بار ہوئی حالانکہ مجھے مطلق خبر نہیں کہ یہ کب ہوا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا کہ دو لڑکیاں جو میرے لئے پسند کی گئی تھیں مرگئیں۔ اس سے میں نے

نتیجہ نکالا کہ میری نسبت تین بار ہوئی۔ مجھے کچھ خفیف سا یاد ہے کہ میری تیسری منگنی
اس وقت ہوئی جب میں ساتویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔ مگر جہاں تک میرا حافظہ
کام کرتا ہے کسی نے مجھ سے اسکا ذکر نہیں کیا۔ اس باب میں میں اپنی شادی کا
ذکر کر رہا ہوں جو مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میرے دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کی شادی پہلے ہی ہو چکی
تھی۔ اب بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے منجھلے بھائی کا جو مجھ سے دو تین سال
بڑے تھے۔ میرے ایک رشتے کے بھائی کا جو شاید ایک سال بڑے تھے اور
میرا بیاہ ساتھ ساتھ کر دیا جائے۔ اس فیصلہ میں ہماری بہتری کا کوئی خیال
نہیں رکھا گیا اور ہماری مرضی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ انہیں تو محض اپنی آسانی اور
کفایت سے بحث تھی۔

ہندوؤں کے یہاں شادی کوئی کھیل نہیں ہے۔ اکثر دولہا اور دلہن کے
والدین اس میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا دھن دولت برباد کرتے ہیں، اپنا وقت
ضائع کرتے ہیں۔ مہینوں تیاری ہوا کرتی ہے، کپڑے اور زیور بنائے جاتے ہیں، دعوتوں
کے خرچ کا حساب لگایا جاتا ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اتنے بہت سے اور
اتنی قسم کے کھانے پکوائے کہ اوروں سے بڑھ جائے۔ عورتیں چاہے انکی آواز اچھی
ہو یا نہ ہو، اتنا گاتی ہیں کہ انکا گلا بیٹھ جاتا ہے اور ہمسایوں کی جان عذاب میں پڑ جاتی
ہے لیکن یہ لوگ چپ چاپ سارا شور وغل برداشت کرتے ہیں انکے گھروں میں
دعوت کا بچا کھچا سڑا گلا کھانا پھینکا جاتا ہے اور وہ دم نہیں مارتے کیونکہ وہ جانتے
ہیں کہ ایک دن خود انہیں بھی یہی حرکتیں کرنا ہے۔

میرے بزرگوں نے سوچا بہتر یہ ہے کہ یہ سارا بکھیڑا ایک ہی مرتبہ ہو جائے۔ اس
میں خرچ کم ہے اور شہرت زیادہ۔ کیونکہ اگر تین بار خرچ کرنے کے بجائے ایک بار خرچ

کرنا ہو تو آدمی خوب دل کھول کر کر سکتا ہے۔ میرے باپ اور چچا دونوں بوڑھے تھے اور ہم تینوں کے سوا انہیں کسی اور بچے کی شادی کرنا باقی نہ تھا۔ غالباً وہ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی کی آخری رنگ رلیاں منالیں۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اکٹھی تینوں شادیوں کا فیصلہ کیا گیا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مہینوں تیاری ہوتی رہی۔

ہمیں انہیں تیاریوں سے آنیوالی تقریب کی خبر ہوئی۔ میرے نزدیک اسکی اہمیت بس اتنی تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے، ڈھولک بجے گی، بارات نکلے گی، عمدہ عمدہ کھانے پکیں گے اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی۔ شہوانی خواہش آگے چلکر پیدا ہوئی۔ میں اپنی اس شرمناک حالت پر پردہ ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ البتہ دو ایک باتیں جن کا بیان کرنا ضروری ہے آگے چل کر بیان کرونگا لیکن یہاں ان باتوں کو اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں۔

غرض مجھ کو اور میرے بھائی کو لوگ راجکوٹ سے پوربندر لے گئے۔ آخری ناٹک سے پہلے جو ابتدائی تماشے ہوئے ان میں بعض باتیں دلچسپ ہیں مثلاً ہمارے سارے جسم پر پانی میں پسی ہوئی ہلدی کا ملا جانا — لیکن انہیں نظر انداز کرنا پڑے گا۔

میرے والد دیوان سہی مگر پھر بھی نوکر تھے اور چونکہ ان پر ٹھاکر صاحب کی خاص نظر عنایت تھی اس لئے ان کی نوکری اور بھی سخت تھی۔ ٹھاکر صاحب نے انہیں آخر وقت تک جانے نہیں دیا۔ پھر جب اجازت دی تو انکے لئے گاڑیوں کی ڈاک بٹھادی کہ سفر میں دو دن کم لگیں۔ مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پوربندر سے راجکوٹ ایک سو بیس میل ہے۔ بیل گاڑی میں پانچ دن کا سفر ہے۔ میرے والد نے یہ راہ تین دن میں طے کی لیکن تیسری منزل میں گاڑی الٹ گئی اور انہیں بہت سخت چوٹ آئی۔ جب وہ آئے تو ان کے سارے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی

تھیں۔ انہیں اور ہم سب کو شادی کی جو خوشی تھی وہ آدھی رہ گئی مگر رسم تو پوری کرنا ہی پڑی۔ کیونکہ بھلا شادی کی تاریخ کیسے ٹل سکتی تھی؟ شادی کی طفلانہ دلچسپیوں میں میں اپنے والد کے زخمی ہونے کا رنج بھول بھال گیا۔

مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی اور دل وجان سے انکی اطاعت کرتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ نفسانی خواہشوں کا بندہ بھی تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سیکھا تھا کہ مجھے اپنے والدین کی بندگی اور خدمت کی خاطر اپنی راحت و مسرت قربان کر دینا چاہیے مگر ایک واقعہ جسے میری لذت پرستی کی سزا سمجھنا چاہیے ایسا ہوا جس کی چبھن میرے دل سے آجتک نہیں گئی۔ اسے میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ نشکل آنند کا ایک دوہا ہے: "دنیا کی چیزوں کا ترک بغیر خواہشوں کے ترک کے کاغذ کی ناؤ ہے، تھوڑی دیر سے زیادہ نہیں چلتی، تم لاکھ کوشش کرو۔" میں جب کبھی اسے گاتا ہوں یا دوسروں کو گاتے سنتا ہوں تو یہ ناگوار تلخ واقعہ مجھے یاد آجاتا ہے۔ اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

میرے والد کو بہت چوٹ آئی تھی مگر انہوں نے ہمت اور ضبط سے کام لیکر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور شادی میں پورا حصہ لیا۔ آج بھی میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ان جگہوں کی تصویر پھرتی ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے شادی کی مختلف رسمیں انجام دیں۔ اس وقت مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن میں اپنے والد پر سختی سے نکتہ چینی کروں گا کہ انہوں نے میری شادی بچپن میں کر دی۔ اس روز تو مجھے ہر چیز درست اور بجا اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آج بھی وہ سماں میری نظر میں ہے۔ ہمارا شادی کی چوکی پر بیٹھنا، "سپتبدی[1]" کی رسم ادا کرنا،

---

(۱) سپتبدی سے مراد ہے ہندو دولہا دلہن کا مل کر سات قدم چلنا اور چلتے میں ایک دوسرے سے محبت اور وفاداری کا عہد و پیمان کرنا جس کے بعد دونوں کا عقد کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

دولھا دلھن کا ایک دوسرے کو میٹھا کنسر[1] کھلانا، اور پھر ہم دونوں کی خلوت۔ آہ وہ پہلی رات! دو معصوم بچے بے جانے بوجھے زندگی کے سمندر میں کود پڑے۔ میری بھاوج نے مجھے اچھی طرح سکھا دیا تھا کہ مجھے پہلی رات کیا کیا کرنا چاہیئے مجھے معلوم نہیں کہ میری بیوی کو کس نے سکھایا تھا۔ میں نے ان سے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا اور نہ اب پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے جاتے ہوئے کس قدر جھجکتے تھے۔ ہماری شرم حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اپنی بیوی سے کیسے باتیں کروں گا اور کیا کہوں گا۔ جو کچھ مجھے سکھایا گیا تھا اس سے کہاں تک کام چلتا۔ مگر سچ پوچھئے تو ان باتوں میں سکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پہلے جنم کے نقش اس قدر قوی ہیں کہ سکھانا پڑھانا بالکل فضول ہے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو گئے اور بے تکلف بات چیت کرنے لگے۔ ہم دونوں ہمسن تھے۔ مگر میں نے بہت جلد شوہرانہ حکومت سے کام لینا شروع کر دیا۔

---

(۱) کنسر گیہوں سے بنتا ہے اور عقد کے بعد اسے دولھا دلھن ساتھ ساتھ کھاتے ہیں۔

چوتھا باب

شوہری کے ٹھاٹھ

جب میری شادی ہوئی اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے ایک پیسہ یا ایک پائی کو (مجھے ٹھیک یاد نہیں) بکا کرتے تھے جن میں بیوی میاں کی محبت کفایت شعاری بچپن کی شادی اور اسی قسم کی اور باتوں پر بحث ہوتی تھی۔ جب مجھے کوئی اس قسم کا رسالہ ملتا تھا تو میں اُسے شروع سے آخر تک پڑھتا تھا اور میری عادت تھی کہ جو بات پسند نہ آتی اُسے بھول جاتا اور جو پسند آتی اس پر عمل کرتا۔ ان رسالوں میں شوہر کا یہ فرض بتایا گیا تھا کہ عمر بھر بیوی کا وفادار رہے اور یہ بات ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو گئی۔ اس کے علاوہ حق کا عشق میرے خمیر میں تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو دھوکہ دوں۔ پھر اس چھوٹی سی عمر میں مجھے بیوفائی کا موقع ملنا بھی مشکل تھا۔

مگر اس وفاداری کے سبق کا ایک بُرا نتیجہ بھی ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اگر میں اپنی بیوی سے وفاداری کرنے کا پابند ہوں تو انہیں بھی اسکا پابند ہونا چاہئے کہ مجھ سے وفاداری کریں۔ اس خیال نے مجھے بدگمان شوہر بنا دیا۔ وفاداری کرنا ان کا فرض تھا مگر میں نے اسے اپنا حق بنا لیا کہ اُن سے وفاداری کا مطالبہ کروں اور اس مطالبے کو پورا کرانے کے لئے ہر وقت چوکسی رکھنا ضروری سمجھا۔ مجھے اپنی بیوی کی پاکدامنی پر شبہہ کرنے کی مطلق کوئی وجہ نہ تھی لیکن بدگمانی وجہ اور سبب کی پابند نہیں۔ میں ہمیشہ ان کی حرکات و سکنات

کی نگرانی کرتا تھا اس لئے وہ بغیر میری اجازت کے کہیں جا نہیں سکتی تھیں۔ اس نے ہمارے آپس میں سخت نزاع کا بیج بو دیا۔ میری نگرانی اصل میں ایک طرح کی قید تھی اور کستور آبائی وہ لڑکی نہ تھی جو ان چیزوں کو چپ چاپ برداشت کرے۔ انہوں نے ابتدا کے یہ کرنا شروع کیا جس وقت جہاں جی چاہا چلی گئیں۔ میں نے زیادہ سختی کی تو انہوں نے اور بیباکی سے کام لیا۔ اور میری جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں شادی شدہ بچے اکثر ایک دوسرے سے بول چال ترک کر دیتے تھے۔ سچ پوچھئے تو میری بندشوں کی خلاف ورزی کرنے میں کستور آبائی پر کوئی الزام نہیں آتا۔ بھلا ایک صاف دل لڑکی یہ کیونکر گوارا کر سکتی تھی کہ اس کے مندر جانے یا ہمجولیوں سے ملنے جلنے پر روک ٹوک کیجائے۔ اگر مجھے ان پر بندشیں عائد کرنے کا حق تھا تو کیا انہیں اس کا حق نہ تھا؟ آج میں یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر اس زمانے میں تو مجھے شوہرانہ اختیارات برتنے کا خبط تھا۔

مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ ہماری زندگی میں سوائے تلخی اور ناکامی کے کچھ نہ تھا۔ میری سختیوں کی بنیاد آخر محبت ہی تو تھی؟ میں اپنی بیوی کو زبردستی زوجیت کا مکمل نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ میں انہیں اس پر مجبور کرنا چاہتا تھا کہ عفت کی زندگی بسر کریں، جو میں سیکھوں وہی وہ بھی سیکھیں اور اپنی زندگی کو میری زندگی میں اپنے خیالات کو میرے خیالات میں ضم کر دیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ کستور آبائی کی بھی یہ آرزو تھی یا نہیں۔ وہ ان پڑھ تھیں اُنکے مزاج میں خلقی طور پر سادگی، خودداری، استقلال اور کم سخنی تھی یا کم سے کم مجھ سے وہ زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ انہیں اپنی جہالت کا کوئی غم نہ تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی انہیں میری دیکھا دیکھی پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں ہوا۔ اس بنئے میں سمجھتا ہوں کہ میرے حوصلے یکطرفہ تھے۔ میرے سارے جوش الفت کا مرکز

یہی ایک عورت تھی اور میں چاہتا تھا کہ ادھر سے بھی ایسی ہی محبت کا اظہار ہو۔ جانبین سے گرمجوشی نہ سہی پھر بھی ہمارے تعلقات سراسر رنج وکلفت پر مبنی نہ تھے کیونکہ کم سے کم ایک طرف سے تو بیقراری محبت تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں ان پر دل وجان سے فریفتہ تھا اسکول میں بھی میں انہیں کے خیال میں محو رہتا تھا اور آنیوالی رات اور خلوت کا تصور ہر وقت میرے دل ودماغ پر مسلط رہتا تھا انکی جدائی ناقابل برداشت تھی۔ رات کو میں بڑی دیر تک فضول باتیں کرکے انکی نیند حرام کر دیتا تھا۔ اگر اس جوش جنوں کے ساتھ ساتھ میرے دل میں فرض شناسی کی لگن نہ ہوتی تو یا تو میں بیماریوں میں مبتلا ہوکر قبل از وقت موت کا شکار ہو جاتا یا میری زندگی ایسی ہو جاتی جس سے موت بہتر ہو مگر روزمرہ کے فرائض ادا کرنا ضروری تھا اور یہ مجھ سے ممکن نہ تھا کہ جھوٹ بولوں۔ اسی آخری چیز نے مجھے بہت سے گڑھوں میں گرنے سے بچایا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کستورا بائی ان پڑھ تھیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انہیں پڑھاؤں مگر شہوانی محبت سے فرصت نہ ملتی تھی۔ پھر ایک دقت یہ تھی کہ مجھے انکی مرضی کے خلاف پڑھانا پڑتا تھا اور وہ بھی رات کے وقت۔ بزرگوں کے سامنے گفتگو تو درکنار میری اتنی مجال نہ تھی کہ انہیں دیکھ بھی سکوں ان دنوں کاٹھیاواڑ میں ایک خاص قسم کا بیکار اور وحشیانہ پردہ رائج تھا اور ایک حد تک اب بھی ہے غرض پڑھائی کے لئے صورت حال ہر طرح ناموافق تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں میں نے کستورا بائی کو پڑھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ زیادہ تر ناکام رہیں۔ جب میں ہوائے نفس کی نیند سے چونکا تو میری قومی خدمت کی زندگی شروع ہو چکی تھی جس سے مجھے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ میں نے چاہا کہ اتالیق رکھ کر انہیں پڑھواؤں مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اسکا نتیجہ یہ ہے

کہ کستورآبائی کو سیدھے سادے خط لکھنے میں اور آسان گجراتی سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہو کہ وہ محبت جو مجھے ان سے تھی، ہوائے نفس سے پاک ہوتی تو وہ آج ایک تعلیم یافتہ خاتون ہوتیں کیونکہ اس صورت میں میں انکی بدشوقی دور کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ مجھے معلوم ہے کہ پاک محبت کے آگے کوئی چیز ناممکن نہیں۔

میں نے ایک چیز کا ذکر کیا ہے جس نے مجھے شہوانی محبت کے مہلک نتیجوں سے کم و بیش محفوظ رکھا۔ اس سلسلے میں ایک اور امر بھی قابل ذکر ہے۔ بہت سی مثالیں دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا ہے کہ جس شخص کی نیت خالص ہو اُسے خدا ایک نہ ایک دن ضرور نجات دیتا ہے۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادی کی ظالمانہ رسم کے ساتھ ایک اور رسم ہے جس کی وجہ سے اس کے برے نتائج میں ایک حد تک کمی ہوجاتی ہے۔ والدین نوجوان میاں بیوی کو زیادہ دن تک ساتھ نہیں رہنے دیتے۔ کمسن بیوی سال کے آدھے سے زیادہ دن میکے میں بسر کرتی ہے۔ یہی صورت میں بھی پیش آئی یعنی شادی کے پہلے پانچ سال میں (تیرہ برس سے اٹھارہ برس کی عمر تک) ہم دونوں سب ملا کر تین سال سے زیادہ اکٹھے نہ رہے ہونگے۔ ہماری جائی کو چھ مہینے بھی نہیں ہونے پاتے تھے کہ میری بیوی کے میکے سے بلاوا آجاتا تھا۔ اُس زمانہ میں یہ بہت گراں گزرتا تھا لیکن اسی نے ہم دونوں کو بچالیا۔ اٹھارہ برس عمر میں میں انگلستان چلا گیا۔ اس طرح ایک عرصے کے لئے جدائی ہوگئی اور یہ ہم دونوں صحت کے لئے بہت مفید تھی۔ انگلستان سے میری واپسی کے بعد بھی ہم دونوں ساتھ چھ مہینے سے زیادہ نہیں رہا۔ کیونکہ مجھے اکثر راجکوٹ سے بمبئی آنا جانا پڑتا اس کے بعد مجھے جنوبی افریقہ سے بلاوا آیا اور وہاں سے واپسی کے بعد میں بڑی نفسانی خواہشوں سے نجات پاچکا تھا۔

پانچواں باب
ہائی اسکول کی تعلیم

میں کہہ چکا ہوں کہ جس زمانے میں میری شادی ہوئی میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم تینوں بھائی ایک ہی اسکول میں تھے۔ بڑے بھائی بہت اونچے درجے میں تھے اور جس بھائی کی شادی میری شادی کے ساتھ ساتھ ہوئی وہ مجھ سے صرف ایک درجہ آگے تھے۔ شادی کے سبب سے ہم دونوں کا ایک سال ضائع ہوا۔ بلکہ میرے بھائی کے لئے اسکا نتیجہ اور بھی برا ہوا کیونکہ انہوں نے پڑھنا بالکل چھوڑ ہی دیا۔ خدا جانے کتنے لڑکوں پر یہ مصیبت آتی ہے جو ان پر آئی۔ یہ صرف آج کل کی ہندو سماج ہی کا دستور ہے کہ طالب علمی اور شادی کی زندگی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی تعلیمی ترقی اور چال چلن کے سارٹیفکیٹ ہر سال لڑکوں کے والدین کے پاس بھیجے جایا کرتے تھے مجھے کبھی خراب سارٹفکیٹ نہیں ملا۔ بلکہ دوسرا درجہ[1] پاس کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے۔ پانچویں درجے میں مجھے چار روپے کا اور چھٹے میں دس روپئے کا وظیفہ ملا اس میں میری قابلیت سے زیادہ میری خوش قسمتی کو دخل تھا کیونکہ وظیفے عام نہ تھے بلکہ کاٹھیاوار

---

(۱) معلوم ہوتا ہے ان دنوں کاٹھیاوار کے ہائی اسکولوں میں آٹھ درجے ہوتے تھے اور آٹھواں انٹرنس تھا۔

کے علاوہ سورٹھ کے لڑکوں میں جو سب سے اچھے طالب علم تھے انکے لئے مخصوص تھے۔ اور ان دنوں پچاس ساٹھ طالب علموں کی جماعت میں سورٹھ کے لڑکے زیادہ نہ ہوں گے۔

مجھے تو یہ یاد پڑتا ہے کہ میرا خیال اپنی قابلیت کے متعلق کچھ اچھا نہ تھا۔ مجھے انعام اور وظیفے پاکر بہت تعجب ہوا کرتا تھا۔ لیکن اپنے چال چلن کی دیکھ بھال میں بہت سختی سے کرتا تھا۔ اس پر اگر خفیف سا دھبہ بھی آگیا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے جب کبھی میری کوئی حرکت واقعی یا استاد کے خیال میں قابل سرزنش ہوتی تو مجھے ایسا دکھ ہوتا تھا کہ میں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے جسمانی سزا دی گئی۔ سزا کی مجھے اتنی پروا نہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں سزا کا مستحق ٹھہرا۔ میں اس رنج میں بہت رویا یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب میں پہلی یا دوسری جماعت میں تھا۔ ساتویں جماعت میں مجھے اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ان دنوں داراب جی ایڈل جی جیمی ہیڈ ماسٹر تھے وہ ادب قاعدے میں بہت سخت اور اپنے اصول کے بڑے پابند تھے اور پڑھاتے بھی خوب تھے اس لئے لڑکے اُن سے خوش رہتے تھے۔ انہوں نے اونچی جماعتوں کے لڑکوں کے لئے کرکٹ اور جمناسٹک کو لازمی کردیا تھا مجھے دونوں چیزیں ناپسند تھیں۔ میں کسی ورزش یا کرکٹ فٹ بال میں انکے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک نہیں ہوا تھا اس علیحدگی کی جس کے بیجا ہونے کا مجھے اب احساس ہے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں جھینپتا تھا ان دنوں میں اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ جمناسٹک کو تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اب مجھ پر روشن ہوگیا ہے کہ نصاب تعلیم میں جسمانی تربیت کا بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہئے جتنا دماغی تربیت کا۔

مگر ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے فوائد پڑھے تھے اور یہ ہدایت

مجھے پسند آگئی تھی اس لئے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی جو اب تک چلی جاتی ہے۔ پابندی سے ٹہلنے کی وجہ سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

میں جمناسٹک کو اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ مجھے اپنے والد کی تیمار داری کی دل سے خواہش تھی۔ اسکول بند ہوتے ہی میں سیدھا گھر پہنچتا تھا اور ان کی خدمت میں مصروف ہو جاتا تھا۔ لازمی ورزش اس خدمت میں حائل ہونے لگی۔ میں نے جیمی صاحب سے درخواست کی مجھے جمناسٹک سے مستثنےٰ کر دیں تاکہ میں اپنے والد کی تیمار داری کر سکوں۔ مگر انہوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ ہر سنیچر کو صبح کا مدرسہ ہوا کرتا تھا ایک سنیچر کو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے سہ پہر کو چار بجے جمناسٹک کرنے گھر سے اسکول جانا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور بادل کے سبب سے وقت کا اندازہ غلط ہوا۔ جب میں اسکول پہنچا تو دیکھا سب لڑکے جا چکے ہیں۔ دوسرے دن جیمی صاحب نے حاضری کا رجسٹر دیکھا تو مجھے غیر حاضر پایا۔ جب انہوں نے مجھ سے غیر حاضری کا سبب پوچھا تو میں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہیں میری بات یقین نہ آئی اور انہوں نے مجھ پر ایک آنہ یا دو آنے (مجھے ٹھیک یاد نہیں) جرمانہ کر دیا۔

مجھ پر جھوٹ کا الزام! اس بات سے مجھے بہت سخت دکھ پہنچا۔ میں اپنی بیگناہی کیسے ثابت کرتا؟ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ سچے آدمی کو چوکس بھی رہنا چاہئے۔ اسکول میں میری غفلت کی یہ پہلی مثال تھی اور یہی آخری بھی تھی مجھے کچھ دھندلا سا خیال ہے کہ آخیر میں میں نے جرمانہ معاف کرا لیا۔

میں ورزش سے مستثنےٰ کر دیا گیا کیونکہ خود میرے والد نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو [لکھ] دیا کہ انہیں مدرسے کے وقت کے بعد گھر پر میری ضرورت ہوتی ہے۔ ورزش [میں] غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک اور غفلت کی سزا میں [اب تک] بھگت رہا ہوں۔ خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آگیا کہ خط اچھا

ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جز نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ انگلستان جانے تک میں اس
خیال پر قائم رہا۔ اس کے بعد، خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب میں نے وہاں کے وکیلوں
اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوبصورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم
آئی اور اپنی غفلت پر بہت پچھتایا مجھے معلوم ہوگیا برے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا
چاہئے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی کوشش کی لیکن وقت گذر چکا تھا۔ لڑکپن
کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہوسکی۔ ہر نوجوان مرد اور عورت کو میری مثال سے عبرت
حاصل کرنا چاہئے اور یہ جان لینا چاہئے کہ اچھا خط تعلیم کا لازمی جزو ہے۔ اب میری
رائے یہ ہے کہ بچوں کو لکھنا سکھانے سے پہلے ڈرائنگ سکھانا چاہئے۔ وہ حرفوں کو
مشاہدے سے اسی طرح پہچانیں جیسے مختلف چیزوں، مثلاً پھولوں، چڑیوں وغیرہ کو
پہچانتے ہیں اور لکھنا اس وقت سیکھیں جب انہیں چیزوں کی تصویر بنانا آجائے۔
تب انکا خط خوبصورت ہوگا۔

مجھے اسکول کے زمانے کی جو باتیں یاد ہیں ان میں سے دو اور قابل ذکر ہیں۔
میں نے اپنی شادی کے سبب ایک سال ضائع کر دیا تھا اور میرے استاد کی خواہش تھی
کہ میں اس کی تلافی میں ایک سال میں دو درجے چڑھا دیا جاؤں۔ یہ رعایت عموماً محنتی
لڑکوں کے ساتھ کیجاتی ہے اس لئے میں تیسرے درجے میں صرف چھ مہینے رہا
اور ششماہی امتحان پاس کرکے جس کے بعد گرمیوں کی چھٹی ہوتی ہے، چوتھے
درجے میں چڑھا دیا گیا۔ اس درجے میں اکثر مضمون انگریزی میں پڑھائے جاتے
تھے۔ میں بدحواس ہوگیا اقلیدس بالکل نیا مضمون تھا جس میں میں کمزور تھا اور
چونکہ پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی اس لئے اور بھی دقت تھی۔ اُستاد اپنے مضمون
کو خوب پڑھاتے تھے مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اکثر میرا جی چھوٹ جاتا تھا
اور میں سوچتا تھا کہ پھر تیسرے درجے میں چلا جاؤں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو

سال کی پڑھائی ایک سال میں سمیٹنا میرے بس کی بات نہیں۔ مگر اس میں نہ صرف میری ذلت تھی بلکہ میرے استاد کی بھی سبکی ہوتی تھی کیونکہ انہوں نے میری محنت پر بھروسا کرکے میری ترقی کی سفارش کی تھی۔ اس دُہری ذلت کے خوف سے میں میدان میں جما رہا آخر جب بڑی کوششوں سے میں اقلیدس کی تیرھویں شکل تک پہنچا تو مجھ پر یک بیک یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ مضمون بالکل سہل اور سادہ ہے۔ جس مضمون میں انسان کو محض اپنی سمجھ سے کام لینا ہو وہ ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد سے ہمیشہ اقلیدس مجھے سہل بھی معلوم ہوئی اور دلچسپ بھی۔

البتہ سنسکرت ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ اقلیدس میں کوئی چیز زبانی یاد کرنے کی نہ تھی اور سنسکرت میں میں سمجھتا تھا کہ سب کچھ حفظ یاد کرنا پڑتا ہے۔ یہ مضمون بھی چوتھے درجے سے شروع ہوتا تھا۔ چھٹے درجے میں پہنچکر میری ہمت نے جواب دے دیا۔ جو استاد اس مضمون کو پڑھاتے تھے وہ کام لینے میں بہت سخت تھے اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکوں پر بڑا جبر کرتے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی کے استادوں میں باہم ایک طرح کی رقابت تھی فارسی کے استاد لڑکوں کے ساتھ نرمی کرتے تھے۔ لڑکے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ فارسی بہت آسان ہے اور فارسی کے استاد بڑے اچھے آدمی ہیں اور طالب علموں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس "آسانی" نے مجھے لبھا لیا اور ایک دن میں فارسی کی جماعت میں جا بیٹھا۔ سنسکرت کے استاد کو اس سے رنج پہنچا۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا "تم یہ بھول گئے کہ تم وشنو باپ کے بیٹے ہو؟ اپنے مذہب کی زبان نہیں پڑھوگے؟ اگر تمہیں کوئی بات مشکل معلوم ہوتی ہے تو میرے پاس آکر کیوں نہیں پوچھتے میں تم سب طالب علموں کو سنسکرت پڑھانے میں اپنے مقدور بھر پوری کوشش کرتا ہوں جب تم آگے بڑھوگے تو اس میں بڑی دلچسپ چیزیں نظر آئیں گی۔ دیکھو ہمت نہ ہارو۔ آؤ پھر سے سنسکرت کی جماعت میں شریک ہو جاؤ۔"

اس مہربانی نے مجھے شرمندہ کردیا۔ بھلا کیسے ممکن تھا کہ مجھے استاد کی اس محبت کا
لحاظ نہ ہو۔ اب میں کرشن شنکر پانڈیا کو ہمیشہ شکر گذاری کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ کیونکہ
جو تھوڑی بہت سنسکرت میں نے اس زمانے میں سیکھ لی اگر وہ نہ سیکھتا تو ہندو دھرم
کی مقدس کتابوں میں میرا دل مشکل سے لگتا۔ بلکہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے
اس سے زیادہ استعداد حاصل نہیں کی کیونکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہر ہندو لڑکے
اور لڑکی کو سنسکرت اچھی طرح جاننا چاہیئے۔

اب میری یہ رائے ہے ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں مقامی
زبان کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی کی بھی جگہ ہونا چاہیئے
کوئی صاحب اس لمبی فہرست کو دیکھ کر نہ ڈریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم
کے نظام پر زیادہ توجہ کی جائے اور لڑکوں پر سارے مضامین غیر زبان کے ذریعے پڑھنے
کا بوجھ نہ ڈالا جائے تو ان زبانوں کے حاصل کرنے میں دقت نہ ہوگی بلکہ ہنستے کھیلتے
سیکھ لی جائیں گی۔ اگر کوئی شخص ایک زبان علمی اصول کے مطابق سیکھ لے تو اسے
اور زبانیں آسانی سے آجاتی ہیں۔

اصل میں ہندی، گجراتی اور سنسکرت کو ہم ایک زبان سمجھ سکتے ہیں اور اسی
طرح عربی فارسی کو بھی۔ اگرچہ فارسی آری اور عربی سامی خاندان السنہ سے ہے
لیکن عربی فارسی دونوں کی پوری نشوونما اسلام کی ترقی کے طفیل میں ہوئی
اس لئے ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اردو کو میں کوئی علٰحدہ زبان نہیں سمجھتا ہوں
کیونکہ اس نے صرف و نحو ہندی کی اختیار کی ہے اور الفاظ زیادہ تر عربی فارسی
سے لئے ہیں اسلئے جو شخص اچھی اردو سیکھنا چاہے اُسے لازم ہے کہ عربی فارسی پڑھے
اور جو شخص اچھی ہندی گجراتی، بنگالی یا مرہٹی سیکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ سنسکرت
پڑھے۔

چھٹا باب

ایک المناک واقعہ

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے مجھے مختلف اوقات میں دوستی رہی اُن میں سے دو قلبی دوست کہے جا سکتے ہیں۔ ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی۔ میں نے اُسے نہیں چھوڑا بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا اس قصور پر کہ میں نے دوسرے سے میل جول پیدا کیا۔ اس دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک المناک واقعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بہت دن قائم رہی۔ میں نے اسے اصلاح کے جوش میں شروع کیا تھا۔

میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا۔ یہ دونوں ہم سبق تھے میں اسکی کمزوریوں سے واقف تھا مگر اُسے وفادار دوست سمجھتا تھا۔ میری ماں نے، میرے بڑے بھائی نے، میری بیوی نے مجھے متنبہ کیا کہ تمہاری صحبت خراب ہے۔ بیوی کی بات تو میں شوہری کے غرور میں کب سنتا تھا لیکن ماں اور بڑے بھائی کی رائے کے خلاف عمل کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے اُن سے عذر معذرت کی اور کہا " میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ کمزوریاں ہیں جو آپ نے بتائیں مگر آپ کو اس کی اچھائیوں کی خبر نہیں۔ وہ مجھے گمراہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے اس نیت سے ملتا ہوں کہ اسکی اصلاح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے اطوار درست کرلے تو بڑا اچھا آدمی ہو جائے گا۔ میری التجا ہے کہ آپ میری طرف سے تردد نہ کریں "

اس سے انکا اطمینان تو نہیں ہوا مگر انہوں نے میری توجیہہ مان لی اور مجھے میری راہ چلنے دیا۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ جو شخص کسی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اس کے ساتھ شیر و شکر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ سچی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے جو اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔ صرف انہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو، دوستی پوری طرح مکمل اور پائدار ہو سکتی ہے۔ دوستوں میں ہر ایک کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ اس لئے دوستی میں اصلاح کی گنجایش بہت کم ہے۔ میری رائے میں کسی ایک شخص سے یک جان و دو قالب ہو جانے سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے اور جو شخص خدا کا دوست ہونا چاہتا ہے اُسے لازم ہے کہ یا تو اکیلا رہے یا ساری دنیا سے دوستی کرے۔ ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو مگر مجھے تو قلبی دوستی پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

ان دنوں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی راجکوٹ میں 'ریفارم' کا بڑا زور تھا، اُس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت استعمال کرتے ہیں۔ اس نے راجکوٹ کے بہت سے مشہور آدمیوں کے نام بھی لئے جو اس جماعت میں شریک تھے۔ اس نے کہا کہ اس زمرے میں ہائی اسکول کے بعض لڑکے بھی ہیں۔

مجھے یہ سن کر تعجب اور رنج ہوا۔ میں نے اپنے دوست سے اسکا سبب پوچھا تو اس نے کہا "ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لئے کمزور ہے۔ انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں۔ اسی سے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں۔ تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ میری غذا گوشت ہے۔ گوشت کھانے والوں کے پھوڑے پھنسی نہیں نکلتے اور کبھی نکل بھی آئیں تو جلدی اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے استاد اور دوسرے بڑے آدمی جو گوشت کھاتے

ہیں احمق نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ تمہیں بھی انکی تقلید کرنا چاہیے۔ آخر آزمائش کرنے میں کیا ہرج ہے؟ تم آزما دیکھو کہ گوشت کھانے سے کیسی طاقت آتی ہے "

گوشت کھانے کی تائید میں یہ ساری دلیلیں ایک ہی نشست میں پیش نہیں کی گئیں۔ یہ اس طول طویل استدلال کا خلاصہ ہے جس سے میرا دوست مجھ پر وقتاً فوقتاً اثر ڈالتا رہا۔ میرے منجھلے بھائی پہلے ہی مغلوب ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ میرے دوست کی دلیلوں کی تائید کرتے تھے۔ میں واقعی اپنے بھائی اور اس دوست کے مقابلے میں بالکل مریل معلوم ہوتا۔ وہ مجھ سے زیادہ قوی اور جفاکش بھی تھے اور جری بھی۔ اس دوست کے کارناموں نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ وہ بہت دور تک اور بڑی تیزی سے دوڑ سکتا تھا، کود پھاند(1) میں بہت مشاق تھا اور سخت سے سخت جسمانی سزا برداشت کر لیتا تھا۔ وہ مجھے اکثر اپنے کارنامے دکھایا کرتا تھا اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ انسان دوسروں میں وہ صفتیں دیکھ کر جو خود اس میں نہ ہوں دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد میرے دل میں یہ ولولہ اٹھا کہ اس کا جیسا بنوں۔ میں نہ کود سکتا تھا نہ دوڑ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اسکی طرح مضبوط کیوں نہ ہو جاؤں؟

پھر میں بزدل بھی تھا۔ مجھے ہر وقت چوروں، بھوتوں اور سانپوں کا کھٹکا رہتا تھا۔ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اندھیرے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ میرے لئے اندھیرے میں سونا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ مجھے وہم ہوتا تھا کہ ایک طرف سے بھوت چلے آ رہے ہیں، دوسری طرف سے چور، تیسری طرف سے سانپ۔ اس لئے بغیر کمرے میں روشنی رکھے مجھ سے سوتے نہ بنتا تھا۔ میں اپنے خوف کو اپنی کمسن بیوی پر، جو میرے پہلو میں سوتی تھیں کیونکر ظاہر کرتا؟ میں

---

(1) High and long Jumping

جانتا تھا کہ اُن میں مجھ سے زیادہ ہمت ہے اور مجھے اپنے اوپر شرم آتی تھی۔ انہیں سانپوں اور بھوتوں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ہر جگہ چلی جاتی تھیں۔ میرے دوست کو میری ان کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ ہاتھ میں رکھ سکتا ہوں، چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں۔ یہ سب گوشت کھانے کی برکت ہے۔

ہم اسکول کے لڑکوں میں نرمدؔ کی یہ تک بندی بہت مقبول تھی:۔

ٹھنگنا دیسی پر جا ہے لمبا فرنگی راجا ہے
کیونکہ وہ گوشت اڑاتا ہے اور پانچ ہاتھ لمبا ہے

ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دئے۔ مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے۔ اس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائیگی اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز مغلوب ہو جائینگے۔

اب تجربہ شروع کرنے کے لئے ایک دن مقرر ہوا۔ اسے پوشیدہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ سارا گاندھی خاندان وشنو تھا اور میرے والدین تو بڑے پکے وشنو تھے، وہ پابندی سے "حویلی" جایا کرتے تھے۔ بلکہ خود ہمارے خاندان کے جداگانہ مندر بھی تھے جین مت کا گجرات میں بہت زور تھا اور اس کا اثر ہر وقت ہر جگہ نظر آتا تھا۔ گجرات کے جین اور وشنو لوگوں کو گوشت کھانے سے جتنی سخت نفرت تھی اس کی مثال نہ ہندوستان میں ملتی ہے نہ کسی اور ملک میں۔ میری ولادت اور پرورش اس ماحول میں ہوئی تھی اور مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی۔ میں جانتا تھا کہ جس دم وہ میرے گوشت کھانے کی خبر سن پائیں گے صدمے کے مارے مرجائیں گے۔ سچائی کی محبت نے مجھے اور بھی زیادہ احتیاط پر مجبور کیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس وقت اسکا احساس نہ تھا کہ اگر میں نے گوشت کھانا شروع کیا تو والدین کو دھوکا دینا ہی پڑے گا لیکن میں نے دل میں ٹھان لی کہ "ریفارم" ضرور کرونگا۔

اس میں زبان کی چاٹ کو دخل نہ تھا۔ میں نے گوشت کے مزے کی کوئی خاص تعریف نہیں سنی تھی۔ مگر میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر ہو جاؤں اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرالیں۔ " سوراج " کا لفظ میں نے اب تک نہیں سنا تھا مگر آزادی کے معنی جانتا تھا۔ " ریفارم " کے جوش نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں نے اس بات کو مخفی رکھنے کا بندوبست کیا اور اپنے دل کو سمجھا لیا کہ محض اس فعل کو والدین سے چھپا نا حق سے انحراف نہیں ہے۔

ساتواں باب

ایک المناک واقعہ

(پچھلے باب کا سلسلہ)

آخر وہ دن آگیا۔ اس وقت میرا جو حال تھا اُسے پوری طرح بیان کرنا مشکل ہے ایک طرف تو "ریفارم" کا جوش اور زندگی میں ایک اہم تبدیلی کی جدت کا لطف تھا اور دوسری طرف اسی کام کو چوروں کی طرح چھپکر کرنیکی شرم تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا دونوں میں سے کون چیز مجھ پر غالب تھی۔ ہم نے دریا کے کنارے جاکر ایک گوشہ تنہائی ڈھونڈھا اور وہاں میں نے اپنی عمر میں پہلی بار — گوشت — دیکھا اس کے ساتھ تنوری روٹی بھی تھی مجھے دونوں میں سے کوئی چیز پسند نہیں آئی بکری کا گوشت چمڑے کی طرح سخت تھا۔ مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا۔ مجھے قے ہوگئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔

اسکے بعد کی رات بڑی بری طرح گذری۔ مجھے بڑا ہولناک خواب نظر آیا جب آنکھ لگتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا کہ زندہ بکری میرے پیٹ کے اندر ممیا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا۔ مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہوجاتی تھی۔

میرا دوست آسانی سے ہار ماننے والا آدمی نہ تھا۔ اب وہ عمدہ مسالے ڈال کر گوشت کے مزیدار کھانے پکانے لگا کھانا کھانے کے لئے ہمیں اب دریا کے کنارے سونی جگہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ریاست کے مکان میں کھاتے تھے۔

جس میں کھانے کا علیحدہ کمرہ میز کرسی سے سجا ہوا تھا۔ میرے دوست نے وہاں کے بڑے باورچی سے ساز باز کرکے یہ انتظام کیا تھا۔

میں اس لالچ میں آگیا۔ مجھے روٹی سے کراہت تھی وہ دور ہوگئی، بکری پر ترس آتا تھا وہ جاتا رہا اور اب گوشت کی بوٹی میں تو نہیں مگر سالن میں مزا آنے لگا۔ یہ سلسلہ قریب قریب ایک سال تک چلتا رہا لیکن اس عرصہ میں گوشت کی دعوتیں سب ملا کر چھ سے زیادہ نہیں ہوئیں کیونکہ ریاست کا مکان روز روز نہیں ملتا تھا اور پھر یہ دقت بھی تھی کہ گوشت کے مزیدار کھانوں میں اکثر صرفہ بہت ہوتا تھا۔ میرے پاس اس ریفارم کی قیمت ادا کرنے کیلئے دام نہ تھے۔ اس لئے ہر مرتبہ خرچ کا انتظام میرے دوست ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے اتنا روپیہ لاتا ہے مگر کسی نہ کسی طرح وہ لے ہی آتا تھا کیونکہ وہ اس پر تلا ہوا تھا کہ مجھے گوشت کھانے کا عادی کردے۔ مگر آخر اسکی آمدنی بھی محدود ہی ہوگی اس لئے بہت کم دعوتیں ہو سکیں اور وہ بھی طویل وقفوں کے بعد۔

جب کبھی میں یہ چوری کی دعوتیں اڑاتا تھا تو ظاہر ہے کہ گھر آکر کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ میری والدہ قدرتی طور پر کھانے کے لئے اصرار کرتی تھیں اور خواہش نہ ہونے کا سبب پوچھتی تھیں میں اُن سے کہہ دیتا تھا "آج مجھے بھوک نہیں ہے۔ میرے ہاضمہ میں کچھ خرابی ہے" یہ بہانے کرنے پر میرا دل مجھے ملامت کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہوں اور وہ بھی اپنی والدہ سے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر میرے باپ کو میرے گوشت کھانے کی خبر ہوگئی تو انہیں بہت سخت صدمہ ہوگا۔ یہ خیال میرے لئے سوہان روح تھا۔

اس لئے میں نے اپنے دل میں کہا: "اگرچہ گوشت کھانا بہت ضروری چیز ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کیجائے لیکن اپنے

ماں باپ کو دھوکا دینا اور اُن سے جھوٹ بولنا گوشت نہ کھانے سے بھی بدتر ہے جب
تک وہ زندہ ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں جب وہ نہ رہیں گے اور میں آزاد ہوجاؤنگا
تو کھلم کھلا گوشت کھاؤں گا لیکن اُس وقت تک میں اس سے پرہیز کروں گا"
اس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کردی۔ اس دن سے آج
تک میں نے پھر کبھی گوشت نہیں کھایا۔ میرے والدین کو مرتے دم تک معلوم نہیں
ہوا کہ انکے دو لڑکوں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس پرخلوص خواہش کی وجہ سے
کہ اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولوں۔ میں نے گوشت چھوڑ دیا مگر اپنے دوست کی
صحبت نہ چھوڑی۔ اُس کی اصلاح کرنے کے جوش نے مجھے برباد کر دیا تھا۔ مگر
مجھے اسکا بالکل احساس نہ تھا۔
اسی شخص کی صحبت نے مجھے بیوی سے بیوفائی کرنے پر اکسایا مگر میں بال
بال بچ گیا۔ یہ دوست مجھے ایک بار ایک قحبہ خانے میں لے گیا۔ اُس نے مجھے ضروری
ہدایتیں دے کر اندر بھیجا۔ سب باتیں پہلے سے طے ہوچکی تھیں۔ روپیہ پہلے ہی ادا
کر دیا گیا تھا۔ میں گناہ کے منہ میں جا چکا تھا مگر خدا نے اپنی رحمت کاملہ سے مجھے میرے
نفس سے بچا لیا۔ میں اس بدکاری کے گھر میں پہنچ کر قریب قریب اندھا اور گونگا ہوگیا
میں پلنگ پر اس عورت کے قریب بیٹھ گیا مگر گم صم ظاہر ہے کہ اسے غصہ آگیا اور
اس نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ اُس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری
مردمی کو بٹہ لگ گیا اور شرم کے مارے جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں لیکن
اس کے بعد میں نے ہمیشہ خدا کا شکر کیا کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ مجھے اپنی زندگی میں
اس قسم کے چار واقعات یاد ہیں اور ان میں سے اکثر میں اپنی کوشش سے نہیں
بلکہ خوش قسمتی سے محفوظ رہا۔ خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے تو چاروں مرتبہ میں لغزش
کا مرتکب قرار پاؤں گا۔ کیونکہ شہوانی خواہش موجود تھی اور یہ ارتکاب فعل سے کم

نہیں لیکن عام خیال یہ ہے کہ جو شخص جسم کو گناہ میں آلودہ نہ ہونے دے وہ گویا گناہ سے
بچ گیا۔ میں بھی بس اسی حد تک بچا۔ بعض فعل ایسے ہوتے ہیں جن سے محفوظ رہنا خود
انسان کے لئے اور آس پاس کے لوگوں کے لئے لطیفۂ غیبی سے کم نہیں۔ جیسے ہی اسکا
اخلاقی احساس جاگتا ہے وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اپنے فضل سے بچا لیا۔
جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان اکثر انتہائی کوشش کے باوجود خواہش گناہ سے
مغلوب ہو جاتا ہے اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے وہ خود گناہ کی طرف راغب ہوتا ہے
مگر خدا کی قدرت سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے۔ انسان کس حد تک فاعل مختار
ہے اور کس حد تک واقعات کا کھلونا ہے۔ تدبیر کہاں تک چلتی ہے اور تقدیر کہاں دخل دیتی
ہے۔ یہ سب باتیں بھید ہیں اور ہمیشہ بھید ہی رہیں گی۔

آمدم بر سر مطلب۔ اس واقعے کے بعد بھی میری آنکھیں نہیں کھلیں اور مجھے اپنے
دوست کی بدکرداری کا احساس نہیں ہوا۔ اس لئے مجھے ابھی اور بہت سے اور کڑوے
گھونٹ پینا پڑے یہاں تک کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس کی وہ حرکتیں دیکھیں جن کا
مجھے سان گمان بھی نہ تھا۔ مگر اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا کیونکہ میں واقعات سلسلہ وار
بیان کر رہا ہوں۔

البتہ ایک بات یہیں کہہ دینا چاہئے کیونکہ اس کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔
مجھ میں اور میری بیوی میں جو ناچاقی تھی اس کی ایک وجہ یقیناً اس دوست کی صحبت
بھی تھی۔ میں اپنی بیوی کا عاشق تھا مگر اسی کے ساتھ بدگمان بھی بہت تھا اور اس
دوست نے میری بدگمانی کی آگ کو اور بھڑکایا۔ مجھے اُس کی راست گوئی میں کبھی
شبہ نہیں ہوا۔ اکثر میں نے اس کی چغلخوری کی بنا پر اپنی بیوی کو دکھ دیا ہے جس پر
مجھے آج تک ندامت ہے۔ صرف ایک ہندو بیوی ہی ان سختیوں کو سہ سکتی ہے۔
اسی لئے میں عورت کو مجسم صبر و تحمل سمجھتا ہوں۔ اگر کسی نوکر پر بیجا شبہ ہو تو وہ نوکری

چھوڑ سکتا ہے۔ اگر بیٹے پر ہو تو وہ باپ کا گھر چھوڑ کر جا سکتا ہے اگر دوست پر ہو تو وہ دوستی ترک کر سکتا ہے۔ بیوی کو شوہر پر شبہہ ہو تو وہ خاموش رہتی ہے لیکن جہاں شوہر کو اس پر شبہ ہوا تو اس بیچاری کی موت ہی آجاتی ہے۔ وہ جائے تو کہاں جائے؟ ہندو بیوی کو یہ حق نہیں کہ عدالت میں طلاق کی درخواست دے۔ اس غریب کے لئے قانون نے کوئی تدبیر نہیں بتائی۔ مجھے یہ ہمیشہ یاد رہے گا اور اس پر عمر بھر پچھتاتا رہوں گا کہ میں نے اپنی بیوی کو اس مصیبت میں ڈالا جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔

یہ بدگمانی کا ناسور میرے دل سے اس وقت گیا جب میں نے "اہنسا"[1] کے سب پہلوؤں کو پوری طرح سمجھ لیا۔ اس وقت مجھے "برہمچاریہ"[2] کی عظمت اور شوکت کی خبر ہوئی اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ بیوی شوہر کی لونڈی نہیں بلکہ اس کی رفیق اور مددگار اور اسکی رنج و راحت میں برابر کی شریک ہے۔ وہ بھی اپنی راہ عمل کے انتخاب میں اسی طرح آزاد ہے جیسے اسکا شوہر۔ جب کبھی مجھے وہ شک اور شبہے کے بھیانک دن یاد آتے ہیں تو مجھے اپنی حماقت اور اپنے شہوانی ظلم سے انتہائی نفرت ہوتی ہے اور اپنے دوست کی اندھی تقلید پر سخت افسوس ہوتا ہے۔

---

(۱) "اہنسا" کے لفظی معنی ہیں عصمت، عدم تشدد (م)

(۲) "برہمچاریہ" کے لفظی معنی ہیں وہ کام جس سے انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی ہیں ضبط نفس، خصوصاً شہوانی خواہش کو قابو میں رکھنا۔ (م)

آٹھواں باب

چوری اور اس کا کفارہ

مجھے ابھی اپنی چند اور لغزشوں کا ذکر کرنا ہے جو گوشت کھانے کے زمانے میں اور
ے پہلے مجھ سے سرزد ہوئیں۔ انکا سلسلہ میری شادی کے وقت سے یا اُس کے
ڑے دن بعد سے شروع ہوتا ہے۔
میرے ایک عزیز کو اور مجھے سگرٹ پینے کا چسکا لگ گیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس عادت
چھا سمجھتے ہوں یا سگرٹ کی خوشبو پر ریجھے ہوں۔ ہمیں تو صرف منہ سے دھواں نکالنے
ں ایک خیالی لطف آتا تھا۔ میرے چچا اس کے عادی تھے اور جب ہم انہیں سگرٹ
ے دیکھتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ ان کی طرح ہم بھی پئیں۔ مگر ہمارے پاس دام تو تھے
ں اس لئے ہم نے ابتدا اس طرح کی کہ ہم سگرٹ کے ٹکڑے جو ہمارے چچا پی کر پھینک
ے تھے چرالاتے تھے۔
مگر یہ ٹکڑے ہر وقت نہیں مل سکتے تھے اور ان سے دھواں بھی زیادہ نہیں نکلتا
۔ اس لئے ہم نے نوکروں کے جیب خرچ میں سے پیسے چرانا شروع کئے کہ ہندوستانی
رٹ خریدیں لیکن مشکل یہ تھی کہ انہیں رکھیں کہاں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ہم بڑوں کے سامنے تو
رٹ پی نہیں سکتے تھے چند ہفتے تک ہم کسی نہ کسی طرح ان چرائے ہوئے پیسوں سے کام
اتے رہے۔ اس عرصے میں ہم نے سنا کہ ایک درخت کی ڈال میں مسامات ہوتے ہیں
راسکے ٹکڑے سگرٹ کی طرح پئے جاسکتے ہیں۔ ہم انہیں لے آئے اور پینا شروع کر دیا۔
لیکن ان چیزوں سے ہماری تسلی نہ ہوتی تھی۔ آزادی نہ ہونا ہمیں کھلنے لگا۔ ہم

سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا کہ ہم بغیر بڑوں کی اجازت کے کچھ نہ کر سکیں۔ آخر زندگی سے متنفر ہو کر ہم نے خودکشی کی ٹھان لی۔

مگر اب یہ سوال تھا کہ خودکشی کیسے کی جائے؟ زہر کھائیں تو زہر کہاں سے لائیں؟ ہم سے کسی نے کہا کہ دھتورے کے بیج زہر قاتل ہیں۔ ہم دوڑتے ہوئے جنگل میں گئے اور یہ بیج لے آئے۔ ہم نے شام کے وقت کو اس کام کے لئے مبارک سمجھا۔ ہم "کدارجی مندر" میں گئے وہاں کے چراغ میں گھی ڈالا" درشن" لئے اور کوئی سونی جگہ ڈھونڈھنے لگے۔ مگر ہماری ہمت نے جواب دے دیا۔ فرض کرو کہ ہم فوراً نہ مرے؟ اور آخر مرنے سے فائدہ ہی کیا؟ آزادی نہیں ہے تو نہ سہی اسی حالت کو کیوں نہ برداشت کریں؟ پھر بھی ہم دو تین بیج نگل ہی گئے۔ ہم دونوں موت سے ڈر گئے اور ہم نے طے کیا کہ "رامجی مندر" جا کر ذرا حواس درست کریں اور خودکشی کا خیال چھوڑ دیں۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ خودکشی کرنا اتنا سہل نہیں جتنا اس کا ارادہ کرنا۔ اور اس دن سے جب کبھی میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے تو مجھ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

خودکشی کے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے سگرٹ کے ٹکڑے پینا اور سگرٹ کے لئے نوکروں کے پیسے چرانا چھوڑ دیا۔ جب سے میں بالغ ہوا ہوں مجھے کبھی تمباکو پینے کی خواہش نہیں ہوئی اور میں اس عادت کو تہذیب کے خلاف، صفائی کے خلاف اور مضر سمجھتا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ ساری دنیا میں لوگ تمباکو پینے پر کیوں جان دیتے ہیں۔ مجھ سے تو ریل کے ڈبے میں جہاں تمباکو پینے والے بھرے ہوں نہیں بیٹھا جاتا۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

لیکن اس سے کہیں بڑی چوری کا میں کچھ دن بعد مرتکب ہوا۔ جب میں نے پیسے چرائے تو میری عمر بارہ تیرہ سال کی بلکہ اس سے بھی کم تھی۔ دوسری چوری کے

وقت میں پندرہ برس کا تھا ۔ اس بار میں نے اپنے گوشت کھانے والے بھائی کے بازو
بند سے ایک سونے کا ٹکڑا چرایا ۔ یہ بھائی پچیس روپے کے مقروض تھے ۔ وہ بازو پر
خالص سونے کا بازو بند باندھا کرتے تھے ۔ اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹ لینا کوئی مشکل
بات نہ تھی ۔

چنانچہ ایسا کیا گیا اور قرض ادا ہو گیا لیکن یہ اتنا سنگین جرم تھا کہ مجھ سے کسی طرح
برداشت نہیں ہو سکتا تھا ۔ میں نے عہد کر لیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا ۔ میرا یہ بھی ارادہ
ہوا کہ اپنے والد کے سامنے جرم کا اعتراف کر لوں ۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی ۔ یہ بات نہ تھی کہ مجھے
والد کے ہاتھ سے مار کھانے کا ڈر ہو ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے ہم لوگوں کو
کبھی نہیں مارا ۔ خوف تھا تو یہ کہ انہیں بہت دکھ ہوگا ۔

آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اعتراف نامہ لکھ کر اپنے والد کو دوں اور ان سے
معافی کی درخواست کروں ۔ میں نے سارا واقعہ ایک کاغذ پر لکھا اور خود لے جا کر انہیں
دیا ۔ اس رقعے میں میں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ مجھے
اسکی کافی سزا دی جائے اور آخر میں اُن سے درخواست کی میرے قصور کے بدلے وہ
اپنا دل نہ کڑھائیں ۔ میں نے اس بات کا عہد کیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا ۔

جب میں نے اعتراف نامہ انہیں دیا تو میں کانپ رہا تھا ۔ وہ اُن دنوں ناسور
میں مبتلا تھے اور صاحب فراش ہو گئے تھے ۔ ایک کھرّے تخت پر لیٹے رہتے تھے ۔
میں نے رقعہ انہیں دیدیا اور چوکی کے سامنے بیٹھ گیا ۔

انہوں نے اُسے اول سے آخر تک پڑھا اور موتیوں کے قطرے ٹپ ٹپ اُن
کے رخساروں پر اور کاغذ پر گرنے لگے ۔ دم بھر وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے اس کے
بعد انہوں نے رقعہ پھاڑ کر پھینک دیا وہ اُسے پڑھنے کے لئے بیٹھ گئے تھے ۔ اب وہ
پھر لیٹ گئے ۔ میں بھی رونے لگا ۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انہیں کیسا دکھ ہے ۔ اگر میں نقاش

ہوتا تو آج اتنے دن کے بعد بھی پورے منظر کی تصویر کھینچ دیتا۔ اس واقعے کی یاد میرے دل میں ابتک اس قدر تازہ ہے۔

ان محبت کے موتیوں نے میرے دل کو پاک کر دیا اور میرے گناہ کو دھو ڈالا۔

اس محبت کو وہی خوب جانتا ہے جس نے اس کا لطف اٹھایا ہے جیسا اس بھجن میں ہے۔

صرف وہ شخص
جس نے محبت کے تیر کھائے ہیں اسکی قوت کا اندازہ کر سکتا ہے۔

یہ میرے لئے "اہمسا" کا عملی سبق تھا۔ اس وقت تو مجھے اس میں سوائے باپ کی محبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا مگر آج میں جانتا ہوں کہ یہ خالص "اہمسا" تھا۔ جب یہ "اہمسا" ہمہ گیر ہو جاتا ہے تو جس چیز کو چھوتا ہے اس کی کا یا پلٹ دیتا ہے۔ اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس طرح کا شاندار عفو میرے والد کی طبیعت سے بعید تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خفا ہو جائیں گے، سر پیٹ لیں گے مجھے سخت سست کہیں گے۔ لیکن انکا سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے صاف صاف اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔ گناہ کا پورا اعتراف اور آئندہ اس سے باز رہنے کا عہد، ایسے شخص کے سامنے جو انہیں قبول کرنے کا اہل ہے، توبہ کی خالص ترین صورت ہے مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف سے والد کو میری طرف سے پورا اطمینان ہو گیا اور انہیں مجھ سے جو محبت تھی وہ بے انتہا بڑھ گئی۔

نواں باب

میرے والد کی وفات اور میری دُہری فضیحت

جس زمانے کا میں ذکر رہا ہوں مجھے سولہواں برس شروع ہوگیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میرے والد ناسور میں مبتلا اور صاحب فراش تھے۔ زیادہ تر میری والدہ، گھر کا ایک پرانا نوکر اور میں انکی خدمت کرتے تھے۔ میرے سپرد تیمارداری کا کام تھا جو زخم کی مرہم پٹی کرنے دوا پلانے، اور جب ضرورت ہو دوا تیار کرنے پر مشتمل تھا۔ روز رات کو میں اپنے والد کے پیر دبایا کرتا تھا اور اس وقت تک نہ اٹھتا تھا جب تک وہ خود نہ کہیں یا انھیں نیند نہ آجائے۔ میں یہ خدمت بڑے شوق سے کرتا تھا۔ جہاںتک مجھے یاد ہے میں نے اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ روزمرہ کے فرائض سے جو وقت بچتا تھا وہ میں کچھ تو اسکول میں اور کچھ اپنے والد کی خدمت میں صرف کرتا تھا۔ شام کو ٹہلنے میں صرف اُسی وقت جاتا تھا جب وہ اجازت دیں یا جب انکی طبیعت اچھی ہو۔

اسی زمانے میں میری بیوی کے بچہ ہونیوالا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات میرے لئے دو طرح سے شرمناک تھی۔ ایک تو یہ کہ میں نے طالب علمی کے زمانے میں ضبط نفس سے کام نہیں لیا۔ دوسرے یہ کہ شہوانی خواہش تحصیل علم کے مشغلے پر جسے میں اپنا فرض سمجھتا تھا، اور اس سے بھی بڑے فرض یعنی والدین کی خدمت پر جسے میں نے شرون کی تقلید میں بچپن سے اپنا نصب العین بنایا تھا، غالب آگئی۔

روز رات کو میرے ہاتھ تو والد کے پیر دبانے میں مشغول رہتے تھے مگر میرا دل سونے کے کمرے میں لگا رہتا تھا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب مذہب، طب اور عقل سب کی

روسے جماع کی ممانعت تھی ۔ مجھے اپنی خدمت سے چھٹی ملنے کی بڑی خوشی ہوتی تھی اور اپنے والد کو سلام کر کے میں سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچتا تھا ۔

ادہر میرے والد کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی ۔ وید اپنے سالے مرہم ، یونانی طبیب اپنے ضماد اور مقامی نیم حکیم اپنی عطائی دوائیں آزما چکے تھے ۔ ایک انگریز سرجن بھی اپنی قابلیت ختم کر چکا تھا ۔ آخری تدبیر اس نے یہ بتائی تھی کہ آپریشن کیا جائے لیکن ہمارے خاندانی طبیب نے مخالفت کی ۔ انہوں نے کہا کہ اس ضعیفی میں آپریشن ٹھیک نہیں یہ بڑے قابل اور مشہور طبیب تھے اس لئے انہیں کی رائے مانی گئی ۔ آپریشن کا خیال ترک کر دیا گیا اور اس کے لئے جو دوائیں خریدی جا چکی تھیں وہ بیکار گئیں ۔ میرا خیال ہے کہ اگر طبیب آپریشن کی اجازت دیدیتے تو زخم آسانی سے اچھا ہو جاتا ۔ آپریشن کے لئے سرجن بھی وہ تجویز ہوا تھا جس کی ان دنوں بمبئی میں بڑی شہرت تھی ۔ مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی جب موت ہی آجائے تو صحیح علاج کیسے سوجھتا ؟ میرے والد بمبئی سے لوٹ آئے ۔ انکے سارا آپریشن کا سامان تھا جو اب کسی مصرف کا نہ تھا ۔ وہ اب زندگی سے مایوس ہو گئے ۔ کمزوری روز بروز بڑھتی جاتی تھی یہانتک کہ آخر ان سے یہ کہنا پڑا کہ بستر ہی پر ضروری حاجتوں سے فارغ ہو لیا کریں ۔ لیکن انہوں نے آخر وقت تک انکار کیا اور بستر سے اٹھ کر جانے کی تکلیف برداشت کرتے رہے وشنو دھرم میں ظاہری صفائی کے قاعدے اتنے سخت ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ صفائی بہت ضروری ہے لیکن مغربی طب نے ہمیں سکھایا ہے کہ انتہائی صفائی کا خیال رکھتے ہوئے ضروری حاجتیں بستر ہی پر پوری ہو سکتی ہیں ۔ مریض کو مطلق تکلیف نہیں ہوتی اور بستر پر خفیف سا دھبہ بھی نہیں آنے پاتا ۔ میرے نزدیک یہ صفائی وشنو دھرم کے بالکل مطابق ہے ۔ لیکن اس زمانے میں میں اپنے والد کا بستر سے اٹھنے پر یہ اصرار دیکھ کر دنگ رہ گیا اور میرا دل انکی تعریف سے

معمور ہوگیا۔

آخر وہ خوفناک رات آگئی۔ میرے چچا اس دن راجکوٹ ہی میں تھے مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ وہ یہ بری خبر سن کر کہ میرے والد کی طبیعت گرتی جاتی ہے راجکوٹ آئے تھے، دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ میرے چچا دن بھر والد کی پٹی کے پاس بیٹھے رہتے تھے اور بڑے اصرار سے ہم سب کو سونے کے لئے رخصت کر کے خود وہیں سوتے تھے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ آج کی رات قیامت کی رات ہے۔ البتہ خطرہ تو روز ہی رہتا تھا۔

کوئی ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا۔ میں پیر دبا رہا تھا۔ میرے چچا نے کہا اب تم جاؤ میں دباتا ہوں۔ میں خوش ہوا اور سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچا۔ میری بیوی بیچاری غافل سو رہی تھیں مگر بھلا جب میں پہنچ گیا تو وہ کب سونے پاتی تھیں؟ میں نے انہیں جگا دیا۔ ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے ہونگے کہ نوکر نے دروازے پر دستک دی۔ میں ڈر سے چونک پڑا۔ نوکر نے کہا "اٹھو ابا کی طبیعت بہت خراب ہے" میں جانتا تھا کہ انکی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس وقت "بہت خراب" کے جو معنی تھے میں سمجھ گیا۔ میں اچھل کر بستر سے اٹھا اور دروازے کی طرف جھپٹا۔

"کیا ہو گیا؟ خدا کے لئے بتادو"

"ابا گذر گئے"۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا! اب میں تھا اور کف افسوس ملنا! میرا دل شرم اور درد سے معمور تھا۔ میں دوڑ کر والد کے کمرے میں گیا۔ مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ اگر شہوانی خواہش مجھے اندھا نہ کر دیتی تو میں اس روحانی کرب سے بچ جاتا جو آخری لمحوں میں اپنے والد کے پاس حاضر نہ رہنے سے مجھے ہوا۔ میں انکے پیر دباتا ہوتا اور میری گود میں انکا دم نکلتا۔ مگر اب یہ عزت میرے چچا کو نصیب ہوئی۔ انہیں اپنے بڑے بھائی سے

ایسی محبت تھی کہ آخری وقت انکی خدمت کرنے کے وہی مستحق قرار پائے۔ میرے والد کو
ہونے والے واقعے کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا انہوں نے اشارے سے کاغذ اور قلم دوات
مانگ کر یہ الفاظ لکھے تھے " دفن کفن کی تیاری کرو " پھر انہوں نے اپنے بازو سے
بازو بند اور گلے سے تلسی کے دانوں کی طلائی مالا کھول کر پھینک دی۔ اس کے ایک
لمحے کے بعد انکا دم نکل گیا۔

وہ فضیحت جس کا میں نے اس باب کی ابتدا میں ذکر کیا ہے یہی شرمناک واقعہ ہے کہ
شہوانی خواہش نے اُس نازک وقت بھی مجھے نہ چھوڑا جب میرے والد جاں بلب تھے
اور مجھے اُنکی خدمت میں رہنا چاہئے تھا۔ یہ وہ دھبہ ہے جسے میں نہ کبھی مٹا سکا نہ
بھول سکا اور میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ اگرچہ مجھے اپنے والدین سے بیحد محبت تھی اور
میں اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا لیکن جب وہ خدا کی ترازو میں تولی گئی
تو بہت کم نکلی کیونکہ اس کے ساتھ ہی میرے دل پر شہوانی خواہش کا قبضہ تھا۔ اس لئے
میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ میں اس زمانے میں وفادار مگر شہوت پرست شوہر تھا۔ مجھے
شہوانی خواہش کے پنجے سے چھوٹنے میں بہت دن لگے اور اسے مغلوب کرنے سے پہلے
بڑے بڑے امتحانوں سے گذرنا پڑا۔

قبل اس کے کہ میں اس باب کو جس میں میری دُہری فضیحت کا ذکر ہے
ختم کروں یہ بھی بتا دوں کہ میری بیوی نے جو چوہے کا سا بچہ جنا وہ تین چار دن
سے زیادہ نہیں جیا۔ اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی تھی؟ جن لوگوں کی شادی
ہوگئی ہے وہ میری مثال سے عبرت حاصل کریں۔

دسواں باب

مذہب کی جھلک

چھ سات برس کی عمر سے سولہ برس(۱) کے سن تک میں اسکول میں رہا۔ اس عرصہ میں مجھے دنیا بھر کی چیزیں سکھائی گئیں سوائے مذہب کے۔ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے انکی صحبت سے بغیر انکی کوشش کے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ میں نے حاصل نہیں کیا۔ البتہ اپنے ماحول(۲) سے میں (مذہب کے متعلق) ادھر اُدھر کی باتیں سیکھتا رہا۔ میری مراد یہاں مذہب کے لفظ سے اس کا وسیع ترین مفہوم یعنی معرفت نفس ہے۔

میں وشنو ماں باپ کے یہاں پیدا ہوا اس لئے مجھے اکثر "حویلی" جانا پڑتا تھا لیکن یہ مندر میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔ اس کی شان و شوکت اور چمک دمک مجھے پسند نہ تھی۔ میں نے یہ افواہیں بھی سنیں کہ وہاں بدکاری ہوتی ہے اس لئے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس وقت سے میں "حویلی" سے کوئی روحانی فیض حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن جو چیز مجھے وہاں نہیں ملی وہ اپنی کھلائی سے حاصل ہوئی۔ یہ ہمارے خاندان کی بڑی پرانی خادمہ تھی جس کی محبت مجھے آج تک یاد ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں

---

(۱) یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ گیارہویں باب میں لکھا ہے کہ انٹرنس ۱۸۸۷ء میں پاس کیا اور اس وقت حساب سے اٹھارہ برس کی عمر ہوتی ہے۔

(۲) Surroundings.

ہ میں بھوت پریت سے ڈرتا تھا۔ رمبھا (یہ کھلائی کا نام تھا) نے اس خوف کو دور کرنے کی
یک سہل سی تدبیر بتائی یعنی "رام نام"[1] کا جپنا۔ مجھے اس کی بتائی ہوئی تدبیر پر اتنا عقیدہ
نہ تھا جتنا خود اس پر۔ اس لئے اس کمسنی میں میں نے "رام نام" جپنا شروع کیا کہ بھوت
پریت کے خوف سے نجات ملے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوف تھوڑے دن کے بعد جاتا رہا لیکن
جو بیج بچپن میں بویا گیا تھا وہ ضائع نہیں گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی نیک عورت
رمبھا کے بوئے ہوئے بیج کا اثر ہے کہ اب "رام نام" میرے لئے حکمی تدبیر کا اثر رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں میرے ایک رشتہ کے بھائی نے جو رامائن پر بڑا گہرا عقیدہ
رکھتے تھے میرے اور میرے بھائی کے لئے رام رکھشا[2] سیکھنے کا انتظام کیا۔ ہم نے
سے زبانی یاد کرلیا اور روز صبح اشنان کے بعد اسے پڑھنے کا ورد کرلیا۔ جب تک ہم
پور بندر میں رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔ راجکوٹ پہنچنے کے بعد ہم اسے بھول بھال گئے۔
مجھے اس پر کچھ ایسا عقیدہ بھی نہ تھا۔ میں تو اسے ایک حد تک اس لئے پڑھتا تھا کہ مجھے
رام رکھشا صحیح تلفظ سے ادا کرنے پر گھمنڈ تھا۔

البتہ جس چیز نے میرے دل پر گہرا اثر کیا وہ رامائن کی تلاوت تھی جو والد صاحب
کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ اپنی بیماری کے کچھ دن میرے والد نے پور بندر میں بسر
کئے۔ وہاں وہ روز شام کو رامائن سنتے تھے۔ پڑھنے والے بلیشور کے لدھا مہاراج تھے جو
رامچندر جی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے اپنے کوڑھ
کا علاج کسی دوا سے نہیں کیا بلکہ "بلوا" کی پتیاں لگانے سے جو بلیشور کے مندر
میں مہادیو کی مورت پر چڑھا کر پھینک دی جاتی تھیں اور "رام نام" جپنے سے

---

(1) رامچندر جی کے مختلف ناموں کا وظیفہ۔ (ع)

(2) ایک دعا۔ (ع)

یہ ان کے عقیدہ نے ان کے مرض کو اچھا کر دیا۔ خدا جانے یہ صحیح ہے یا غلط۔ بہر حال لوگ اس قصے کو سچ سمجھتے تھے اور یہ تو واقعہ ہے کہ جس زمانے میں لدھا مہاراج راماین پڑھتے تھے انکا کوڑھ بالکل جا چکا تھا۔ انکی آواز سریلی تھی۔ وہ دوہے اور چوپائی گاتے تھے اور انکا مطلب اس ذوق شوق سے بیان کرتے تھے کہ انہیں اپنی کچھ خبر نہ رہتی تھی اور سُننے والے بھی بیخود ہو جاتے تھے۔ میری عمر اس زمانے میں تیرہ برس کی ہوگی۔ مگر مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ انہیں راماین پڑھتے سن کر میں وجد کیا کرتا تھا۔ اسی سے اس گہری عقیدت کی بنیاد پڑی جو مجھے راماین سے ہے آج میں تلسی داس کی راماین کو دعا اور وظیفے کی کتابوں میں سب سے بڑھ کر سمجھتا ہوں۔

اس کے چند مہینے بعد ہم لوگ راجکوٹ آئے۔ یہاں راماین نہیں پڑھی جاتی تھی البتہ ہر اکادشی[1] کو بھگوت گیتا کی تلاوت ہوتی تھی۔ میں شریک ہوتا تھا مگر پڑھنے والا ایسا نہ تھا جو سننے والوں میں جوش پیدا کر سکے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھگوت گیتا وہ کتاب ہے جو دلوں میں مذہبی ذوق شوق پیدا کرتی ہے۔ میں نے اسے گجراتی میں بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ لیکن جب میں نے اپنے اکیس دن کے روزے کے دوران میں اصل سنسکرت کتاب کے کچھ حصے پنڈت مدن موہن مالوی کی زبان سے سنے تو دل میں کہا کاش میں اسے بچپن میں ایسے بھگت کی زبان سے سنتا تاکہ مجھے کمسنی ہی میں اس کا مذاق پیدا ہو جاتا۔ اس عمر میں انسان جو سنتا یا دیکھتا ہے اس کے نقش دل میں بہت گہرے ہوتے ہیں اور میں ہمیشہ افسوس کرتا رہتا ہوں کہ بدقسمتی سے مجھے اس زمانے میں اس قسم کی اور کتابیں سننے کا موقع نہیں ملا۔

---

(۱) چاند کے مہینے کی گیارہویں تاریخ۔ ہندی تقویم میں مہینے کے دو حصے ہوتے ہیں (روشن اور تاریک) دونوں میں تاریخیں ایک سے چودہ یا پندرہ تک گنی جاتی ہیں۔ (ع)

البتہ راجکوٹ میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ابتدا ہی سے ہندو مذہب کی تمام
شاخوں اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تربیت ملی۔ کیونکہ میرے
والدین "حویلی" میں بھی جاتے تھے اور شیو اور رام کے مندر میں بھی اور ہم سب لڑکوں
کو ساتھ لیجاتے تھے۔ میرے والد کے پاس جین سادھو بھی آیا کرتے تھے اور اتنی خصوصیت
برتتے تھے کہ ہم لوگوں کا کھانا کھا لیتے تھے باوجودیکہ ہم جین نہ تھے۔ وہ میرے والد
سے دینی اور دنیاوی موضوعوں پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ انکے مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جو اُن سے اپنے اپنے
مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ادب سے اور اکثر دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔
میں انکا تیماردار تھا اسلئے مجھے اکثر یہ گفتگو میں سننے کا موقع ملتا تھا۔ اُن سب باتوں نے
مل کر مجھے سب مذہبوں سے رواداری کرنا سکھایا۔

صرف عیسائیت اُس زمانے میں اس سے مستثنیٰ تھی۔ میں اسے ایک
لحاظ سے ناپسند کرتا تھا اور اس کی معقول وجہ تھی۔ اُس زمانے میں عیسائی مشنری
ہائی اسکول کے قریب ایک نکڑ پر کھڑے ہو کر وعظ کہتے تھے اور ہندوؤں کو اور اُنکے
دیوتاؤں کو دل کھول کر گالیاں دیتے تھے۔ میں یہ سنکر بہت بدحظ ہوا۔ میں نے انکی
تقریر صرف ایک بار کھڑے ہو کر سنی۔ مگر یہ بھی اس بات کے لئے کافی تھا کہ میں نے
عہد کر لیا آئندہ کبھی یہ تجربہ نہ کروں گا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک مشہور ہندو
کے عیسائی ہو جانے کی خبر سنی۔ سارے شہر میں چرچا تھا کہ بپتسمہ کے وقت اسے شراب
پلائی گئی اور گائے کا گوشت کھلایا گیا اس کا لباس تبدیل کر دیا گیا اور اب ہمیشہ یورپی
کپڑے پہنتا ہے اور ہیٹ لگاتا ہے۔ ان باتوں سے میرے دل میں خلش پیدا ہو گئی۔ میں نے
سوچا کہ جو مذہب گائے کا گوشت کھانے پر، شراب پینے پر اور لباس بدل دینے پر مجبور کرتا ہے
وہ مذہب کہلانے کا مستحق نہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ ایک نو عیسائی نے اپنے باپ دادا

کے مذہب انکے رسم ورواج اور اُنکے ملک کو گالیاں دینا شروع کر دیا ہے۔ ان سب چیزوں نے میرا دل عیسائیت سے پھیر دیا۔

لیکن میرے دوسرے مذہبوں سے روا داری کرنیکے یہ معنی نہیں تھے کہ میں خدا پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں میری نظر سے منو سمرتی[1] گذری جو میرے والد کے کتب خانے میں تھی۔ اس میں تخلیق اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا ذکر پڑھ کر میں کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس میرا رجحان دہریت کی طرف ہو گیا۔

ان دنوں میں اپنے ایک رشتے کے بھائی (جو اب بھی زندہ ہیں) کی قابلیت کا بہت قائل تھا۔ میں نے ان سے اپنے شبہے بیان کئے۔ مگر وہ انہیں دور نہ کر سکے انہوں نے مجھے یہ جواب دے کر ٹال دیا "جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تم خود ان شبہوں کو رفع کر سکو گے۔ اس عمر میں تمہیں اس قسم کے سوال نہ کرنا چاہئے" میں خاموش ہو گیا مگر میری تشفی نہیں ہوئی "منو سمرتی" کے جو باب غذا وغیرہ کے متعلق ہیں وہ مجھے روز مرہ کے عمل کے خلاف معلوم ہوتے تھے اس بارے میں میں نے اپنے شبہے بیان کئے تو وہی جواب ملا۔ میں نے اپنے جی میں کہا "جب میرے ذہن میں پختگی آ جائے گی اور میرا مطالعہ وسیع ہو جائیگا تو یہ باتیں میری سمجھ میں آ جائیں گی"

بہر حال "منو سمرتی" سے مجھے اُس زمانے میں "اہمسا" کا سبق نہیں ملا۔ میں اپنے گوشت کھانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں "منو سمرتی" سے بظاہر اس فعل کی تائید ہوتی تھی۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ سانپ، کھٹمل وغیرہ کو مارنا بالکل جائز ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اُس زمانے میں بارہا کھٹمل اور دوسرے کیڑے فرض سمجھکر مارے ہیں۔

---

(۱) منو کے قانون۔ منو ایک ہندو واضع قانون تھے اور انکے قانون مذہبی اہمیت رکھتے ہیں (م)

لیکن ایک عقیدے نے میرے دل میں گہری جڑ پکڑ لی کہ اخلاق ساری زندگی
ں بنیاد ہے اور حق اخلاق کا لب لباب ہے۔ حق میری ساری کوششوں کا مرجع بن گیا
میری نظر میں روز بروز بلند تر اور برتر ہوتا گیا اور اس کی جو تعریف میرے ذہن میں
ھی وہ بھی وسیع تر ہوتی گئی۔

اسی طرح چند گجراتی اشعار نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا ان میں بدی کے
لے نیکی کرنے کی تلقین تھی جو میرے لئے شمع ہدایت بن گئی۔ اس کا میرے دل
ں اتنا جوش تھا کہ میں نے اس کے مطابق عملی تجربے شروع کر دئے۔ وہ اشعار جو میری
ظر میں لاجواب ہیں یہ ہیں :-

جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلا
جو کوئی تجھ سے ہنس کر بولے اسکے آگے سر کو جھکا
تانبے کا جو پیسا دے تو اس کو کیسہ زر دے دے
جان بچائے جو تیری، تو اس کی خاطر سر دیدے
ہے یہ قول حکیموں کا اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں
ایک کے بدلے دس دیتے ہیں، نیکی کا دم بھرتے ہیں
پر جو سچے داتا ہیں ہے انکا سب سے ایک سلوک
پاپ کے بدلے پن کرنا اور بدے کرنا نیک سلوک

گیارہواں باب

انگلستان کی تیاریاں

میں نے انٹرنس کا امتحان ۱۸۸۷ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں یہ امتحان دو جگہ ہوا کرتا تھا احمد آباد میں اور بمبئی میں۔ ملک کے عام افلاس کی وجہ سے کاٹھیاواڑ کے طلبہ احمد آباد جایا کرتے تھے کیونکہ یہ قریب بھی پڑتا تھا اور یہاں خرچ بھی کم تھا۔ میرا خاندان بھی مفلس تھا اس لئے میں بھی یہی صورت اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ یہ پہلا سفر تھا جو میں نے راجکوٹ سے احمد آباد تک کیا اور وہ بھی بغیر کسی ساتھی کے۔

میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں انٹرنس پاس کرنے کے بعد کالج میں پڑھوں۔ کالج بھاؤنگر میں بھی تھا اور بمبئی میں بھی مگر چونکہ بھاؤنگر میں خرچ کم تھا اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ وہاں جا کر ساملداس کالج میں داخل ہو جاؤں۔ جانے کو تو میں چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لئے مشکل تھی۔ پروفیسروں کے لکچروں میں دلچسپی ہونا تو درکنار میں انہیں سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا اس کالج کے پروفیسر اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے تھے۔ یہ میری ہی خامی تھی کہ میں انکے درس سے استفادہ نہ کر سکا۔ پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔

ماوجی دیو ایک عالم اور دانشمند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے۔ انکے تعلقات ہم لوگوں سے والد کے انتقال کے بعد بھی باقی رہے۔ اتفاق سے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن تشریف لائے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے میری تعلیم کا حال

پوچھا جب انہیں معلوم ہوا کہ میں سا ملدا اس کالج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا "اب زمانہ بدل گیا ہے اور تم میں سے کوئی بغیر معقول تعلیم حاصل کئے اپنے والد کی گدی پانے کی توقع نہیں کر سکتا۔ اس لڑکے کی تعلیم ابھی جاری ہے اس لئے اسی کی ذات سے تمہیں یہ امید ہو سکتی ہے کہ یہ گدی کو قائم رکھے گا۔ بی اے پاس کرنے میں اسے چار پانچ سال لگیں گے اور سند ملنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ساٹھ کی نوکری ملے گی۔ دیوان کا عہدہ ملنے سے رہا۔ اگر میرے رمسکے کی طرح اس نے قانون پڑھا تو اور بھی زیادہ دن لگیں گے اور اتنے عرصے میں خدا جانے کتنے آدمی وکالت پاس کر کے اس عہدے کے امیدوار ہو جائیں گے۔ میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے۔ تین سال میں یہ لوٹ آئے گا۔ خرچ بھی چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگا۔ ذرا اس بیرسٹر کو دیکھو جو ابھی انگلستان سے آیا ہے کیسی شان سے رہتا ہے! وہ جس دن چاہے دیوان ہو جائے۔ میں تو تمہیں بہت اصرار کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ موہن داس کو اسی سال انگلستان بھیج دو۔ کیول رام کے بہت سے دوست وہاں ہیں۔ وہ انکے نام تعارف کے خطوط دیدیگا اور موہن داس وہاں بڑے آرام سے رہے گا۔"

جوشی جی (اسی لقب سے ہم لوگ ماوجی دیو کو پکارتے تھے) پورے اطمینان کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے پوچھا "کیا تم انگلستان جانے کو یہاں پڑھنے پر ترجیح نہیں دیتے؟" میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو سکتی تھی۔ میں اپنی مشکل پڑھائی سے یوں ہی جی چراتا تھا جھٹ سے اس تجویز پر راضی ہوگیا۔ میں نے کہا مجھے کل کے بجائے آج بھیج دیجئے۔ مگر اتنی جلدی جلدی قانون کے امتحان پاس کرنا مشکل ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ڈاکٹری پڑھنے جاؤں؟ میرے بھائی نے میری بات کاٹ کر کہا "والد کو یہ پیشہ بالکل پسند نہیں تھا۔

تمہارا ہی خیال کر کے انہوں نے کہا تھا کہ ہم ویشنو لوگوں کو مُردوں کی چیر پھاڑ کے پاس نہ بھٹکنا چاہئے۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ تم قانون پڑھو۔"

جوشی جی بولے "میں گاندھی جی کی طرح ڈاکٹری پیشہ کا مخالف نہیں ہوں۔ ہمارے شاستروں نے اس کی ممانعت نہیں کی۔ لیکن ڈاکٹری پڑھ کر تم دیوان نہیں بن سکتے اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں دیوان کا عہدہ بلکہ اس سے بڑھ کر رتبہ ملے۔ یہی ایک صورت ہے کہ تم اتنے بڑے خاندان کی پرورش کر سکو۔ زمانہ روز بروز بدل رہا ہے اور بڑے سخت دن آرہے ہیں۔ اس لئے دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم بیرسٹر بنو۔" میری ماں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا "جو بات میں نے کہی ہے مہربانی سے اس پر غور کیجئے اب کی جب میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہوتی ہوں گی۔ اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔"

جوشی جی چلے گئے اور میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے لگا۔

میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے۔ مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں؟ یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کمسن لڑکے کو تنہا پردیس میں بھیجنا مناسب ہے یا نہیں۔ ادھر میری والدہ عجب کشمکش و پیچ میں تھیں۔ انہیں میری جدائی بہت ناگوار تھی۔ انہوں نے اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی۔ کہنے لگیں "اب تمہارے چچا گھر بھر میں سب سے بڑے ہیں پہلے ان سے صلاح لینا چاہئے۔ اگر وہ راضی ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔"

میرے بھائی کو ایک اور خیال آیا، انہوں نے مجھ سے کہا "ریاست پوربندر پر ہمارا حق ہے۔ لیلی صاحب آج کل ریاست کے منتظم ہیں۔ وہ ہمارے خاندان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور چچا سے بہت خوش ہیں۔ ممکن ہے وہ ریاست میں سفارش کر دیں کہ تمہیں انگلستان میں تعلیم دلانے کے لئے کچھ مدد دی جائے۔

مجھے یہ بات پسند آئی اور میں پور بندر جانے کے لئے تیار ہو گیا ان دنوں ریل نہ تھی
بیل گاڑی میں پانچ دن کا راستہ تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں بزدل تھا۔ لیکن اسوقت
انگلستان جانے کے شوق میں جس سے میرا دل معمور تھا، یہ بزدلی کافور ہو گئی۔ میں نے
دھوراجی تک جانے کے لئے بیل گاڑی کرایہ پر لی اور دھوراجی سے اونٹ پر سفر
کیا کہ ایک دن پہلے پور بندر پہنچ جاؤں۔ مجھے اونٹ پر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

غرض کسی نہ کسی طرح میں پہنچ گیا چچا کو آداب کر کے میں نے سارا ماجرا سنایا۔ انہوں
نے کچھ دیر سوچ کر کہا "مجھے یقین نہیں کہ آدمی انگلستان میں رہ کر اپنے دھرم پر قائم
رہ سکتا ہے۔ جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے تو بہت شبہ ہوتا ہے جب میں ان بڑے
بڑے بیرسٹروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی اور یورپیوں کی زندگی میں کچھ فرق نہیں
معلوم ہوتا۔ انہیں کسی چیز کے کھانے پینے میں باک نہیں۔ سگار اُنکے منہ سے کبھی
جدا نہیں ہوتا۔ لباس ویسا ہی بے شرمی کا ہے جیسا انگریزوں کا۔ یہ سب باتیں ہمارے
خاندان کے رواج سے میل نہیں کھاتیں۔ میں چند روز میں جاترا کے لئے جا رہا ہوں
اور میری زندگی تھوڑی رہ گئی ہے۔ بھلا ایسے وقت میں کہ موت سر پر ہے میں تمہیں
کیونکر سمندر پار انگلستان جانے کی اجازت دوں؟ مگر میں تمہیں روکنا بھی نہیں چاہتا
اصل میں اجازت جو کچھ ہے تمہاری ماں کی ہے۔ اگر وہ کہہ دیں تو شوق سے سدھارو اللہ
نگہبان! اُن سے کہہ دینا کہ میں دخل نہیں دوں گا۔ اگر تم گئے تو میری دعائیں تمہارے
ساتھ جائیں گی"

میں نے کہا کہ "میں جانتا تھا کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہ کریں گے۔ اب
میں والدہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر کیا آپ لیلی صاحب سے میری
سفارش بھی نہ کرینگے؟"

انہوں نے کہا "میں یہ کیسے کرسکتا ہوں۔ مگر وہ بڑے اچھے آدمی ہیں تم

انہیں اپنے خاندانی تعلقات بتاؤ اور ملنے کی درخواست کرو۔ وہ یقیناً تم سے ملیں گے بلکہ ممکن ہے مدد بھی کریں"۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے چچا نے سفارش کا خط کیوں نہیں دیا۔ کچھ خفیف سا خیال ہے کہ شاید وہ میرے انگلستان جانے میں جو انکے خیال میں دھرم کے خلاف تھا براہ راست مدد دیتے ہوئے رکتے تھے۔

میں نے لیلی صاحب کو لکھا اور انہوں نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ وہ جب مجھ سے ملے تو سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے انہوں نے مجھے دو ٹوک جواب دیدیا۔ "پہلے بی اے پاس کر و پھر میرے پاس آنا۔ اس وقت تمہیں کوئی مدد نہیں دیجا سکتی" میں نے ان سے ملنے کے لئے بڑی تیاریاں کی تھیں۔ بہت سوچ سمجھ کر چند جملے یاد کئے تھے اور جب انکے سامنے آیا تو زمین دوز ہوکر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا مگر یہ سب بیکار گیا۔

مجھے اپنی بیوی کے زیور کا خیال آیا اور اپنے بھائی کا خیال آیا جن پر مجھے بڑا بھروسا تھا۔ انکی فیاضی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور مجھ سے وہ اپنے بیٹے کی طرح محبت کرتے تھے۔

میں پوربندر سے راجکوٹ آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میں نے جوشی جی سے مشورہ لیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جانے پر اصرار کیا اور کہا اگر ضرورت ہو تو قرض تک لینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ میں نے اپنی بیوی کا زیور بیچنے کی تجویز پیش کی جس سے دو تین ہزار روپیہ مل جاتا۔ میرے بھائی نے وعدہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح روپئے کا بندوبست کریں گے۔

مگر میری والدہ ابتک راضی نہ تھیں انہوں نے لوگوں سے کھود کھود کے انگلستان کے حالات پوچھے۔ کسی نے ان سے کہدیا کہ نوجوان وہاں جاکر بگڑ جاتے ہیں۔ کسی نے کہا وہ گوشت کھانے لگتے ہیں کسی نے کہا وہاں بغیر شراب کے گذر نہیں ہوتا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "جب یہ حال ہے تو کیسے کام چلے گا؟" میں نے کہا "آپ کو مجھ

تبار نہیں ؟ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان چیزوں
ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔ اگر ایسا خطرہ ہوتا تو بھلا جوشی جی مجھے جانے دیتے ؟"

انہوں نے کہا "مجھے تم پر اعتبار ہے مگر پردیس میں کیسے اعتبار کروں ؟ میں
براہمن ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ؟ اچھا بچار جی سوامی سے پوچھوں گی۔"

بچار جی سوامی اصل میں مودھی بنئے تھے مگر اب جین سادھو ہو گئے تھے۔ وہ
ہی جوشی جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے۔ انہوں نے میری مدد کی اور کہا :
ں اس لڑکے سے تین باتوں کا پکا عہد لے لوں گا۔ پھر اسے اجازت دینے میں کوئی
رج نہیں۔" انہوں نے مجھ سے قسم کھلوائی اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت
و ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ جب یہ ہو گیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دیدی۔

ہائی اسکول میں مجھے رخصت کرنے کے لئے جلسہ کیا گیا۔ راجکوٹ کے ایک
جوان کا انگلستان جانا ایک غیر معمولی بات تھی میں نے چند لفظ شکریے کے لکھ لئے تھے۔
ر بڑی دقت سے ہکلا ہکلا کر میری زبان سے نکلے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں انہیں
پڑھنے کھڑا ہوا تو میرے سر میں چکر تھا اور میں سارے بدن سے کانپ رہا تھا۔

بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ میں بمبئی روانہ ہوا۔ راجکوٹ سے بمبئی تک یہ
میرا پہلا سفر تھا۔ میرے بھائی مجھے پہنچانے گئے تھے۔ لیکن مثل ہے کہ آسمان سے
گرا کھجور میں اٹکا۔ ابھی بمبئی میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا تھا۔

• گاندھی جی زمانۂ طالبعلمی میں

بارھواں باب
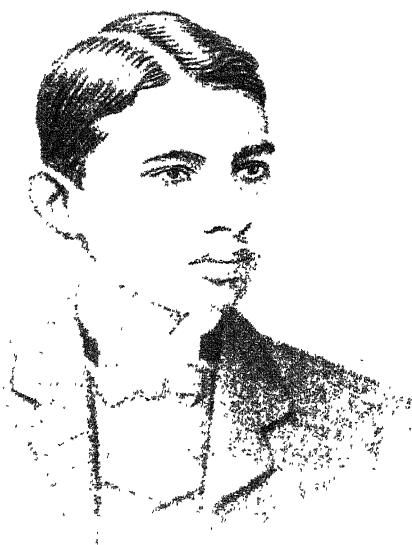
برادری سے خارج

اپنی ماں کی اجازت اور دعائیں لے کر، اپنی بیوی اور تین چار مہینے ک
سے رخصت ہو کر میں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوا۔ لیکن وہاں میرے بھائی کے دو
نے ان سے کہا کہ جون اور جولائی میں بحر ہند میں تلاطم رہتا ہے اور یہ اس لڑ
کا پہلا بحری سفر ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ یہ نومبر سے پہلے روانہ نہ ہو
نے یہ خبر بھی سنائی کہ حال ہی میں کوئی جہاز طوفان میں ڈوب گیا ہے۔ میرے
یہ سن کر گھبرا گئے اور انہوں نے میری فوری روانگی میں خطرہ سمجھ کر اجازت
سے انکار کر دیا وہ مجھے بمبئی میں ایک دوست کے پاس چھوڑ کر راجکوٹ
اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے میرا سفر خرچ اپنے ایک نسبتی بھا
پاس رکھوا دیا۔ اور اپنے دوستوں سے کہہ دیا کہ مجھے جس قسم کی مدد کی ضر
ہو دیتے رہیں۔

بمبئی میں مجھ سے وقت کاٹے نہ کٹتا تھا۔ میں ہمیشہ انگلستان جانے
خیال میں رہا کرتا تھا۔ اس عرصہ میں میری ذات برادری کے لوگوں میں میر
پار جانے کی خبر سے بے چینی پھیل گئی۔ کوئی مودھ بنیا اب تک انگلستان نہیں گیا تھ
میری اس جرأت کا مواخذہ کرنے پر تل گئے۔ برادری کا ایک عام جلسہ ہوا
اس کے سامنے طلب کیا گیا۔ میں نے تعمیل کی۔ خدا جانے مجھ میں ایک دم
کہاں کی جرأت آگئی۔ جلسے کے سامنے جاتے ہی، میں ذرا بھی نہیں ڈرا۔

سی جھجک بھی محسوس نہیں ہوئی۔ برادری کے سردار سیٹھ صاحب نے جو میرے دور کے رشتہ دار اور میرے والد کے دوست تھے، مجھ سے اس طرح خطاب کیا:-

" برادری کی نظر میں تمہارا انگلستان جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے دھرم میں سمندر پار جانے کی ممانعت ہے۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ وہاں آدمی دھرم کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا پڑتا ہے!"

میں نے اس کا یہ جواب دیا: "میرے خیال میں انگلستان جانا ہرگز دھرم کے خلاف نہیں ہے۔ میں وہاں آگے پڑھنے کے لئے جا رہا ہوں اور میں اپنی والدہ سے عہد کر چکا ہوں کہ ان تین چیزوں سے جن کا آپ لوگوں کو زیادہ ڈر ہے پرہیز کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عہد مجھے برائی سے محفوظ رکھے گا۔"

سیٹھ نے فرمایا "مگر میں جو تم سے کہتا ہوں کہ وہاں دھرم پر قائم رہنا ممکن نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے باپ سے مجھ سے کیا تعلقات تھے، تمہارا فرض ہے کہ میری بات مانو۔"

میں نے کہا: "مجھے ان تعلقات کا حال معلوم ہے اور میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں۔ مگر میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ میں انگلستان جانے کا عزم کر چکا ہوں اور اسے ترک نہیں کر سکتا۔ میرے والد کے دوست اور مشیر نے جو ایک عالم برہمن ہیں میرے انگلستان جانے کو جائز رکھا ہے اور میری والدہ اور بھائی نے بھی اجازت دے دی۔"

" مگر تمہیں برادری کے حکم کا لحاظ نہیں؟"

" میں سچ مچ مجبور ہوں۔ میرے خیال میں برادری کو اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہئے۔"

اس پر سیٹھ جھنجھلا گئے وہ مجھے سخت سست کہنے لگے۔ میں چپ بیٹھا رہا۔

آخر سیٹھ نے حکم سنایا: "آج سے یہ لڑکا برادری سے باہر سمجھا جائیگا۔ جو کوئی اس کی مدد کرے گا یا اسے پہنچانے نکالنے جائے گا وہ سوا روپیہ جرمانہ کا مستوجب ہوگا۔"

مجھ پر اس حکم کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میں سیٹھ سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ مگر مجھے یہ فکر تھی کہ میرے بھائی کیا کہیں گے۔ خوش قسمتی سے وہ ثابت قدم رہے اور انہوں نے اپنے خط میں مجھے اطمینان دلایا کہ باوجود سیٹھ کے حکم کے انکی اجازت بدستور قائم ہے۔

اس واقعے سے مجھے اور بے چینی پیدا ہوگئی کہ کسی طرح جلدی چلا جاؤں۔ اگر ان لوگوں نے میرے بھائی پر دباؤ ڈالا تو خدا جانے کیا صورت ہو؟ اور فرض کرو کوئی ناگہانی حادثہ پیش آگیا۔ میں اس الجھن میں تھا کہ میں نے سنا ایک جوناگڑھ کے وکیل بیرسٹری کرنے انگلستان جا رہے ہیں اور ۴ ستمبر کے جہاز سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے بھائی کے دوستوں سے، جن کے سپرد وہ مجھے کر گئے تھے ملا۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے ایسے شخص کی ہمراہی کا موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو تار دے کر اجازت مانگی اور انہوں نے دیدی۔ میں نے اپنے نسبتی بھائی سے روپیہ مانگا۔ انہوں نے سیٹھ کے حکم کا حوالہ دیا اور کہا مجھ میں برادری سے خارج ہونے کی ہمت نہیں۔ تب میں اپنے خاندان کے ایک دوست کے پاس گیا اور اُن سے درخواست کی کہ مجھے اتنا روپیہ قرض دیدیں جو کرائے اور راہ کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور میرے بھائی سے وصول کرلیں۔ انہوں نے مہربانی سے نہ صرف میری درخواست منظور کرلی بلکہ مجھے بہت تسلی بھی دی۔ میں نے فوراً جہاز کا ٹکٹ لے لیا۔ اب مجھے سفر کا سامان کرنا تھا۔ ایک اور دوست کو ان باتوں کا تجربہ تھا۔ انہوں نے مجھے کپڑے بنوا دئے اور دوسری چیزیں فراہم کردیں۔ بعض کپڑے مجھے پسند تھے اور بعض ناپسند۔ نکٹائی سے جسے میں آگے چل کر شوق سے

باندھنے لگا ، اس وقت مجھے سخت نفرت تھی۔ چھوٹا کوٹ پہننا مجھے بیحیائی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن انگلستان جانے کی لگن میرے دل میں ایسی تھی کہ یہ ناپسندیدگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ راستے کے لئے کھانے پینے کا سامان میرے ساتھ بہت کافی تھا۔ میرے دوستوں نے اُسی کیبن[1] میں ایک برتھ[2] محفوظ کرلی تھی جس میں جوناگڈھ کے وکیل تری امبک رائے جی مضمونِدار تھے۔ انہوں نے مجھے مضمونِدار جی کی حفاظت میں دیا اور کہا یہ ابھی اٹھارہ برس کا لڑکا ہے جسے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں۔ مضمونِدار جی نے کہا آپ اس لڑکے کی طرف سے مطمئن رہئے۔

خدا خدا کرکے ہم ۴ ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔

تیرھواں باب

لندن میں داخلہ

مجھے سمندر کے سفر میں متلی بالکل نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ دن کے بعد میری طبیعت
میں الجھن اور بے چینی پیدا ہونے لگی۔ میں اسٹورڈ تک سے باتیں کرتے جھجکتا تھا
مجھے انگریزی بولنے کی بالکل عادت نہ تھی اور دوسرے درجے میں سوا مضمونداری
کے سب مسافر انگریز تھے۔ میں ان سے باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب وہ مجھ
سے مخاطب ہوتے تھے تو میں اُن کے الفاظ بہت کم سمجھتا تھا اور اگر سمجھ بھی گیا تو
جواب نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے بولنے سے پہلے ایک ایک لفظ سوچنا پڑتا تھا۔
میں چھری کانٹے کے استعمال سے ناواقف تھا اور مجھ میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ
کسی سے پوچھوں کن کن کھانوں میں گوشت نہیں ہے۔ اسلئے میں لوگوں کے ساتھ میز
پر کبھی کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ اپنے کیبن میں کھالیا کرتا تھا اور میری غذا زیادہ تر مٹھائی
اور پھل تھے جو میں ساتھ لایا تھا۔ مضمونداری کو اس قسم کی کوئی دقت نہیں تھی اور وہ
سب سے ملتے جلتے تھے۔ وہ بے تکلف ڈیک پر پھرتے تھے اور میں کیبن میں چھپا
بیٹھا رہتا تھا اور ڈیک پر صرف اُس وقت جاتا تھا جب وہاں دو چار آدمیوں سے
زیادہ نہ ہوں۔ مضمونداری مجھے برابر سمجھاتے تھے کہ مسافروں سے ملا کرو اور اُن
سے بے تکلف باتیں کیا کرو۔ وہ کہتے تھے کہ وکیل کی زبان تیز ہونا چاہیئے اور
اپنے پیشے کے تجربے سنایا کرتے تھے۔ ان کی نصیحت تھی کہ انگریزی بولنے کے ہر موقع
سے فائدہ اٹھاؤ اور غلطیوں کی پروا نہ کرو۔ غیر زبان میں غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں

لیکن میں اپنی جھینپنے کی عادت کسی طرح دور نہ کر سکا۔

ایک انگریز مسافر مجھ سے اتنی مہربانی سے پیش آیا کہ مجھے گفتگو کرنا ہی پڑی۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ تم کون ہو؟ کیا کام کرتے ہو، کیا کھاتے ہو، کہاں جا رہے ہو، اتنا جھینپتے کیوں ہو وغیرہ وغیرہ۔ مجھے مشورہ دیا کہ میز پر آیا کرو۔ وہ میرے اتنی سختی سے گوشت سے پرہیز کرنے پر بہت ہنسا اور ایک دن جب ہم بحر قلزم میں تھے اس نے دوستانہ لہجے میں کہا "ابھی تو خیر کام چلتا ہے مگر جب خلیج بسکے میں پہنچو گے تو تمہیں اپنے فیصلے پر پھر سے غور کرنا پڑے گا۔ اور انگلستان میں تو اتنی سردی پڑتی ہے کہ کوئی بے گوشت کھائے زندہ نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "مگر میں نے تو سنا ہے کہ لوگ وہاں بے گوشت کھائے بھی رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔"

وہ بولا "یقین جانو یہ من گھڑت ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہاں کوئی شخص نہیں رہتا جو گوشت نہ کھاتا ہو۔ دیکھو آخر میں تم سے شراب پینے کو تو کبھی نہیں کہتا حالانکہ میں پیتا ہوں۔ مگر یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ تمہیں گوشت کھانا چاہئے کیونکہ بے اس کے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"آپ کے ہمدردانہ مشورہ کا شکریہ لیکن میں اپنی ماں سے صدق دل سے وعدہ کر چکا ہوں کہ گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا اسلئے میں اس کے کھانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اگر میں دیکھوں گا کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا تو میں ہندوستان واپس چلا جاؤں گا مگر یہاں رہنے کے لئے گوشت کھانا قبول نہ کروں گا۔"

ہم خلیج بسکے میں داخل ہو گئے لیکن مجھے نہ تو گوشت کی ضرورت پیدا ہوئی نہ شراب کی۔ وطن میں مجھے یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ میں لوگوں سے تصدیق کرا لوں کہ میں نے گوشت نہیں کھایا۔ میں نے اس انگریز دوست سے تصدیق نامہ مانگا۔ اس

نے خوشی سے دے دیا اور میں نے اسے بہت دن تک احتیاط سے رکھا۔ لیکن جب
میں نے آگے چل کر دیکھا کہ جو لوگ گوشت کھاتے ہیں انہیں بھی ایسے تصدیق نامے
مل جاتے ہیں تو میری نظر میں اسکی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اگر کسی کو میری بات کا
اعتبار نہ ہو تو تصدیق نامے سے کیا فائدہ؟

غرض ہم سوتھمپٹن پہنچ گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سنیچر کا دن تھا۔ جہاز پر میں
کالا سوٹ پہنتا تھا۔ سفید فلالین کا سوٹ جو میرے دوستوں نے بنوایا تھا اس لئے
اٹھا رکھا گیا تھا کہ جہاز سے اتر کر پہنا جائے۔ میرا خیال تھا کہ جب میں ساحل پر اتروں گا
تو سفید کپڑے پہننا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لئے میں نے یہ فلالین کا سوٹ پہنا۔
یہ ستمبر کے آخری دنوں کا ذکر ہے۔ میں نے دوسروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوائے
میرے کوئی سفید کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا
سب سامان مع کنجیوں گرنڈلے کمپنی کے ایک ایجنٹ کے سپرد کر دیا۔ اس
لئے میں نے بھی یہی کیا۔

میرے پاس چار تعارف کے خط تھے، ڈاکٹر پ۔ ج۔ مہتا کے نام، دلپت
رام جی شکل کے نام، پرنس رنجیت سنگھ جی کے نام اور دادا بھائی نوروجی کے نام۔
جہاز پر کسی نے ہمیں یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن میں وکٹوریہ ہوٹل میں ٹھہریں۔ اس
لئے مضموندار جی نے اور میں نے وہیں قیام کیا۔ مجھے پہلے ہی کیا کم شرم تھی کہ
میں اکیلا سفید کپڑے پہنے ہوں۔ جب ہوٹل میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ گرنڈلے کے
یہاں سے میرا اسباب کل اتوار کے سبب سے نہیں مل سکتا تو میں بیحد پریشان ہوا
اسی دن شام کو آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر مہتا، جنہیں میں نے سوتھمپٹن سے تار
دیا تھا، تشریف لائے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا۔ وہ میرے
سفید کپڑوں کو دیکھ کر ہنسے۔ ان سے باتیں کرتے کرتے میں نے شغل کے طور پر

اُنکی ٹاپ ہیٹ(۱) اٹھالی اور اس پر الٹی طرف ہاتھ پھیرنے لگا جس سے اس کے بال ادھر اُدھر ہٹ گئے۔ ڈاکٹر مہتا نے میری اس حرکت کو کسی قدر غصہ کی نظر سے دیکھا اور مجھے روک دیا۔ لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ ہو ہی گیا۔ اس واقعے سے مجھے آئندہ کے لئے عبرت ہوگئی۔ یہ میرا یورپی آداب مجلس کا پہلا سبق تھا جس کی باریکیاں ڈاکٹر مہتا نے مجھے دل لگی کے پیرائے میں سمجھادیں۔ انہوں نے کہا "دوسروں کی چیزیں نہ چھوا کرو، پہلی ملاقات میں اس قسم کے سوال نہ کیا کرو جیسے ہم ہندوستان میں کرتے ہیں، چلا کر بات نہ کیا کرو، لوگوں سے گفتگو کرتے وقت انہیں "سر" نہ کہا کرو۔ یہ ہندوستان ہی کا دستور ہے۔ یہاں تو صرف نوکر چاکر اپنے آقا کو "سر" کہتے ہیں"۔ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں انہوں نے مجھے بتائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہوٹل کے رہنے میں بہت خرچ ہے۔ اور مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی خاندان کے ساتھ رہوں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملے کو پیر تک ملتوی رکھیں۔

مضمونداری جی کو اور مجھے ہوٹل میں تکلیف تھی اور خرچ بھی بہت تھا۔ مالٹا سے ہمارے ہمسفر ایک سندھی تھے جن سے مضمونداری جی سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ لندن میں اجنبی نہ تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ اگر کہو تو تمہارے لئے کمرے تلاش کردوں۔ ہم راضی ہوگئے اور پیر کے دن جیسے ہی اسباب آیا ہم نے ہوٹل کا بل ادا کردیا اور ان کمروں میں اُٹھ گئے جو سندھی دوست نے ہمارے لئے کرایہ پر لئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرا ہوٹل کا بل تین پاؤنڈ کے قریب تھا جسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ اتنا تو روپیہ دینا پڑا اور لطف یہ کہ میں تقریباً فاقے سے رہا۔ کیونکہ مجھے کوئی کھانا پسند نہیں آتا تھا اگر مجھے ایک چیز ناپسند ہوئی تو میں دوسری منگاتا تھا اور دونوں کے دام دینا پڑتے

---

(۱) اونچی ٹوپی جو لندن میں مہذب طبقے کے لوگ رسمی لباس کے ساتھ اوڑھتے ہیں۔

تھے۔ اصل میں میرا گذارا اب تک ان چیزوں پر تھا جو میں بمبئی سے ساتھ لایا تھا۔

تے کمروں میں بھی میں پریشان تھا۔ مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتا تھا۔ ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ رات کو میرے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور گھر کی ایک ایک چیز کی یاد نیند حرام کر دیتی تھی۔ کسے اپنا درد نہاں سناتا اور فرض کیجئے سناتا بھی تو فائدہ کیا ہوتا؟ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی جس سے تسکین ہو۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ لوگ، اُن کے طور طریقے یہاں تک کہ ان کے گھر بھی۔ میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا اور مجھے ہر وقت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی۔ جو کھانے میں کھا سکتا تھا وہ بے مزہ اور پھیکے تھے۔ غرض میں عجب مخمصے میں پھنسا تھا نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ انگلستان میں رہنا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور ہندوستان واپس جانا محال تھا۔ میرا ضمیر یہ کہتا تھا کہ اب تو تم آ ہی گئے ہو کسی نہ کسی طرح یہ تین سال پورے کرو۔

چودھواں باب
میرے ایک عقیدے کی تبدیلی

ڈاکٹر مہتا پیر کے دن وکٹوریا ہوٹل پہنچے ان کا خیال تھا کہ میں وہیں ملوں گا۔ یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ جا چکے ہیں اور وہ ہمارا نیا پتہ معلوم کر کے ہمارے مکان پر پہنچے۔ مجھے جہاز پر محض میری حماقت سے داد کی شکایت ہو گئی تھی۔ وہاں ہمیں منہ دھونے اور نہانے کے لئے سمندر کا پانی ملتا تھا جس میں صابون حل نہیں ہوتا۔ مگر میں صابون کو تہذیب کی نشانی سمجھ کر استعمال کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جلد بجائے صاف ہونے کے چکنائی سے آلودہ ہو جاتی تھی۔ اسی سے میں داد میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر مہتا کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ سرکے کا تیزاب لگاؤ۔ مجھے یاد ہے تیزاب کی جلن سے میں بلبلا اٹھا تھا۔ ڈاکٹر مہتا نے میرے کمرے کو اور اس کے سامان کو دیکھا تو ناپسندیدگی سے سر ہلا کر بولے "اس سے کام نہیں چلے گا۔ انگلستان آنے میں ہمارا مقصد پڑھنے لکھنے سے زیادہ یہاں کی زندگی اور معاشرت کا تجربہ حاصل کرنا ہے اور اس کے لئے تمہارا کسی خاندان کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ مناسب ہے کہ تم کچھ دن[1] . . . کے ساتھ بطور امیدوار کے رہو۔ میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔"

میں نے اس رائے کو شکریے کے ساتھ قبول کیا اور ان دوست کے یہاں

---

(۱) ان صاحب کا نام گاندھی جی نے نہیں لکھا مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی ہندوستانی طالب علم تھے۔

اٹھ گیا۔ وہ مجھ سے بہت مہربانی اور اخلاق سے پیش آئے۔ انہوں نے مجھے اپنے بھائی کے برابر سمجھا۔ مجھے انگلستان کے طور طریقے سمجھائے اور انگریزی بولنے کی مشق کرائی۔ مگر میری غذا کا مسئلہ بہت پیچیدہ تھا۔ مجھے بغیر نمک مسالے کی ابلی ہوئی ترکاری پسند نہ آتی تھی۔ مکان والی حیران تھی کہ میرے لئے کیا چیز پکائے۔ صبح ناشتے میں ہم جئی کا دلیا کھاتے تھے جس سے پیٹ بھر جاتا تھا لیکن دوپہر اور شام کے کھانے سے میں ہمیشہ بھوکا اٹھتا تھا۔ میرے دوست مجھے اکثر سمجھاتے تھے کہ گوشت کھایا کرو مگر میں ہمیشہ اپنے عہد کا عذر پیش کر کے خاموش ہو رہتا تھا۔ دوپہر اور شام کے کھانے میں پالک ڈبل روٹی اور مربّہ ملتا تھا۔ میری خوراک اچھی تھی اور معدہ بڑا تھا لیکن میں شرم کے مارے ڈبل روٹی کے دو تین ٹکڑوں سے زیادہ نہ مانگ سکتا تھا کیونکہ یہ بدتہذیبی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر یہ طرہ کہ دودھ نہ دوپہر کو ملتا تھا نہ شام کو۔ میرے دوست یہ حالت دیکھتے دیکھتے ایک دن اکتا کر کہنے لگے "اگر تم میرے سگے بھائی ہوتے تو میں تمہیں کھڑے کھڑے نکال دیتا۔ وہ عہد بھی کوئی چیز ہے جو ایک جاہل ماں کے سامنے کیا گیا ہو اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ یہاں کے حالات سے مطلق واقفیت نہ تھی؟ یہ سرے سے عہد ہی نہیں ہے۔ قانون اسے ہرگز عہد تسلیم نہ کرے گا۔ ایسے وعدے کی پابندی محض ضعیف الاعتقادی ہے اور میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اس طرح کی ضد سے تمہیں یہاں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ تم خود کہتے ہو کہ تم اس سے پہلے گوشت کھا چکے ہو اور تمہیں اس کا مزا پسند آیا تھا۔ جہاں کوئی ضرورت نہ تھی وہاں تو تم نے کھایا اور جہاں سخت ضرورت ہے وہاں نہیں کھاتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے!"

مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔

روز میرے دوست یہی بحث کرتے تھے مگر میری طرف سے ہمیشہ ایک جواب تھا۔ قطعی انکار۔ جتنی زیادہ وہ بحث کرتے تھے اتنا ہی میں اپنے عقیدے میں سخت ہوتا جاتا تھا

میں روز خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے بچائے اور وہ مجھے بچاتا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں خدا کو پہچانتا تھا۔ یہ محض عقیدے کا کھیل تھا۔ وہ عقیدہ جس کا بیج میری کھائی رمبھا نے میرے دل میں بویا تھا۔

ایک دن میرے دوست نے مجھے بینتھم کا "نظریۂ افادیت" پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ میں بہت چکرایا۔ عبارت اتنی مشکل تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میرے دوست اس کا مطلب سمجھانے لگے۔ میں نے کہا "مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ یہ پیچیدہ مسئلے میرے بس کے نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ گوشت کھانا ضروری ہے مگر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔ اس میں بحث کی گنجایش نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بحث میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر خدا کے لئے آپ مجھے بیوقوف اور ضدی سمجھ کر چھوڑ دیجئے۔ میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ میری ہمدردی کے سبب سے مجھ سے بار بار یہ بات کہتے ہیں۔ اگر میں مجبور ہوں۔ جو عہد کر لیا وہ کر لیا۔ اب اُسے توڑ نہیں سکتا۔"

میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ انہوں نے کتاب بند کر دی اور کہا "بہت اچھا اب میں کبھی بحث نہیں کروں گا۔" مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے پھر کبھی اس مسئلے پر بحث نہیں کی۔ مگر انہیں میری طرف سے جو تشویش تھی وہ بدستور رہی۔ وہ سگرٹ اور شراب پیتے تھے مگر انہوں نے مجھ سے ان چیزوں کے استعمال کے لئے کبھی نہیں کہا۔ بلکہ ان دونوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی۔ انہیں صرف اس بات کی فکر تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو میں گوشت نہ کھانے سے کمزور ہو جاؤں اور انگلستان سے میرا دل اچاٹ ہو جائے۔

اس طرح میں نے ایک مہینہ امیدواری کا زمانہ بسر کیا۔ میرے دوست کا گھر رچمنڈ میں تھا۔ وہاں سے ہفتے میں ایک دو دفعہ سے زیادہ لندن جانا ممکن نہ تھا

اس لئے ڈاکٹر مہتا اور دلپت رام جی تسکل کی رائے ہوئی کہ میں کسی خاندان میں رکھا جاؤں۔ تسکل جی نے مغربی کینزنگٹن میں ایک اینگلو انڈین کا گھر تجویز کیا اور وہاں میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ گھر کی مالکہ ایک بیوہ تھیں۔ میں نے ان سے اپنے عہد کا حال بیان کیا۔ بڑی بی نے وعدہ کیا کہ میری خبر گیری اچھی طرح کریں گی اور میں انکے مکان میں رہنے لگا۔ یہاں بھی مجھے قریب قریب فاقہ ہی رہتا تھا۔ میں نے گھر سے مٹھائی اور دوسری کھانے کی چیزیں منگوائی تھیں مگر ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔ مجھے ہر چیز بدمزہ معلوم ہوتی تھی۔ مالکہ مکان مجھ سے روز پوچھتی تھیں کہ کھانا پسند آیا یا نہیں مگر وہ بیچاری کیا کر سکتی تھیں؟ میرے حجاب کا اب تک بھی وہی حال تھا اور جو کچھ میرے سامنے آتا تھا اس سے زیادہ مانگنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی تھی۔ انکی دو لڑکیاں تھیں۔ یہ بڑے اصرار سے مجھے ڈبل روٹی کے دو تین ٹکڑے اور دے دیتی تھیں مگر انہیں کیا خبر تھی کہ میرا پیٹ بھرنے کے لئے ایک پوری روٹی چاہئے۔

مگر اب لندن میں میرے قدم ذرا جم گئے تھے۔ ابھی میری باقاعدہ پڑھائی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میں نے حال ہی میں تسکل جی کے کہنے سے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا۔ ہندوستان میں میں نے کبھی اخبار نہیں پڑھا تھا لیکن یہاں پابندی سے پڑھتے پڑھتے مجھے شوق پیدا ہو گیا۔ میں روزانہ ڈیلی نیوز، ڈیلی ٹیلیگراف اور پیل میل گزٹ کا سرسری مطالعہ کر لیتا تھا۔ اس میں مجھے مشکل سے ایک گھنٹہ لگتا تھا اس لئے میں نے شہر کا چکر لگانا شروع کیا۔ میں نباتاتی ریستوران کی تلاش میں نکلا۔ مالکہ مکان نے مجھ سے کہا تھا کہ شہر میں ایسی کئی جگہیں ہیں۔ میں روز دس بارہ میل چلتا تھا اور کسی سستے ریستوران میں جا کر روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا مگر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ اس روزانہ گشت کے دوران میں مجھے فرنگڈن اسٹریٹ میں ایسا ریستوران مل گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے کسی بچے کو

اپنی من بھاتی چیز پانے سے ہوتی ہے۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے مجھے دروازے کے قریب ایک شیشے کی کھڑکی کے پیچھے کچھ کتابیں نظر آئیں جو بکنے کے لئے رکھی تھیں اُن میں سے سالٹ کی کتاب "نباتاتی مشرب[1] کی حمایت" میں نے ایک شلنگ میں خریدی اور سیدھا کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ جب سے میں انگلستان آنے کے بعد سے یہ پہلا دن تھا کہ میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ خدا نے میری مدد کی۔

میں نے سالٹ کی کتاب اول سے آخر تک پڑھی اور مجھ پر اسکا بہت اثر ہوا۔ جس تاریخ سے میں نے یہ کتاب پڑھی میں دعوےٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنی مرضی سے نباتاتی مشرب اختیار کیا۔ میں نے اس دن کو دعائیں دی جب میں نے اپنی ماں کے سامنے گوشت ترک کرنے کا عہد کیا تھا۔ ابتک میں گوشت سے صرف سچائی کی خاطر اور اس عہد کے خیال سے پرہیز کرتا تھا جو میں نے اپنی والدہ کے سامنے کیا تھا۔ مگر میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی گوشت کھانا اختیار کرلے اور مجھے انتظار تھا کہ ایک دن ایسا آئے جب میں کھلم کھلا گوشت کھاؤں اور دوسروں کو اس مبارک کام میں شریک کروں۔ اب میں نے "نباتاتی مشرب" اختیار کرلیا اور آئندہ سے اس کے پھیلانے کو اپنا دھرم بنالیا۔

---

(1) Vegetarianism لفظی معنی یہ عقیدہ کہ سوائے نباتات کے کوئی چیز نہ کھانا چاہئے۔ مگر اس عقیدے کے لوگ دودھ وغیرہ اور بعض انڈا اور مچھلی بھی استعمال کرتے ہیں البتہ گوشت سے سب پرہیز کرتے ہیں۔

پندرھواں باب

انگریز مآبی

میرا عقیدہ نباتاتی مشرب کے بارے میں روز بروز راسخ ہوتا گیا۔ سالٹ کی کتاب پڑھ کر مجھے غذا کے متعلق اور کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان میں سے ایک ہاورڈ ولیمس کی "اخلاقیات غذا" تھی جس میں غذائیات کی تاریخ عہد قدیم سے آجتک مشاہیر کی سیرت کے آئینے میں پیش کی گئی تھی۔ مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فیثا غورث اور حضرت عیسیٰ سے لیکر آجتک جتنے فلسفی اور پیغمبر گذرے ہیں سب نباتاتی مشرب رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اینا کنگسفورڈ کی کتاب "غذا کا مکمل دستور العمل" بھی دلچسپ تھی ڈاکٹر ایلنسن نے صحت اور حفظان صحت کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں اُن سے بھی مجھے بہت مدد ملی۔ وہ اس طریقہ علاج کے حامی تھے جو محض مریضوں کی غذا کی دیکھ بھال تک محدود ہے۔ وہ خود نباتاتی مشرب رکھتے تھے اور اپنے مریضوں کو سختی سے ہدایت کرتے تھے کہ محض نباتات استعمال کریں۔ ان سب کتابوں کو پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "غذائیات" کے تجربے میری زندگی کا ایک اہم جزبن گئے۔ ابتدا میں یہ تجربے زیادہ تر صحت کے نقطۂ نظر سے کئے گئے۔ آگے چل کر انکا اصل محرک مذہب بن گیا۔

مگر میرے دوست کو اب بھی میری طرف سے تشویش تھی۔ میری محبت کے جوش میں انہیں یہ خیال ہوا کہ اگر میں اسی طرح گوشت کھانے کا مخالف رہا تو ایک تو میرا جسم کمزور ہو جائے گا دوسرے میں بالکل بے شعور رہوں گا کیونکہ انگریزوں کی صحبت میں میرا جی نہ لگے گا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مجھے "نباتاتی مشرب" کی کتابوں سے دلچسپی

ہوگئی ہے تو وہ ڈرے کہ ایسا نہ ہو انکے مطالعہ سے میرا دماغ خراب ہو جائے، میں اپنا
کام بھول کر ان تجربوں میں اوقات ضائع کروں اور پورا مراقی بن جاؤں اس لئے
انہوں نے میری اصلاح کی ایک آخری کوشش کی۔ ایک دن انہوں نے مجھے
تھیٹر دیکھنے کی دعوت دی۔ تماشے سے پہلے ہم ہوبرن ریستوران میں کھانا کھانے
گئے۔ وکٹوریا ہوٹل سے رخصت ہونے کے بعد مجھے بڑے ریستوران میں جانے کا
پہلا اتفاق تھا اور مجھے یہ جگہ ایک عالیشان محل معلوم ہوتی تھی۔ ہوٹل میں رہ کر میں
نے کوئی مفید تجربہ حاصل نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک میرے حواس بجا نہ تھے۔
میرے دوست بظاہر مجھے اس ریستوران میں اس خیال سے لے گئے تھے کہ حجاب
کے سبب سے میں کھانے کے متعلق پوچھ گچھ نہ کر سکوں گا۔ وہاں بہت سے لوگ کھانا
کھانے کے لئے جمع تھے۔ میرے دوست بھی مجھے لے کر ایک علیحدہ میز پر بیٹھ گئے۔
پہلے شوربا آیا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اس میں کیا کیا چیزیں پڑی ہیں مگر دوست سے پوچھنے
کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے کھانا لانے والے ملازم کو بلایا۔ میرے
دوست میز کے دوسری طرف بیٹھے تھے مگر انہوں نے میرا اشارہ دیکھ لیا اور سختی سے
پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے بہت جھجکتے ہوئے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں یہ شوربا ترکاری
کا ہے یا نہیں۔ میرے دوست نے غصے سے چلا کر کہا "تم اتنے بے تکے ہو کہ مہذب
صحبت کے قابل نہیں اگر تم تمیز سے نہیں بیٹھ سکتے تو بہتر ہے کہ چلے جاؤ۔ کسی اور ریستوران
میں جا کر کھانا کھا لو اور باہر میرا انتظار کرو" میں بہت خوش ہوا۔ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔
قریب ہی ایک نباتاتی ریستوران تھا مگر وہ بند تھا اس لئے میں نے اس رات کو کھانا
نہیں کھایا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ تھیٹر گیا مگر انہوں نے اس ناگوار واقعے کا جو
میرے سبب سے پیش آیا تھا کوئی ذکر نہ کیا۔ اور مجھے تو ظاہر ہے کہ کچھ کہنے کی گنجائش
ہی نہ تھی۔

یہ آخری دوستانہ نزاع تھی جو ہم دونوں میں ہوئی۔ اس کا ہمارے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے جو کچھ کیا محبت سے کیا اور میں اس کی قدر کرتا تھا۔ جتنا زیادہ ہمارے خیالات اور طرز عمل میں اختلاف تھا اتنی ہی زیادہ میں انکی عزت کرتا تھا۔

مگر میں نے یہ طے کیا کہ انکی تشویش رفع کردوں اور ان کو یقین دلا دوں کہ اب میں بے تکے پن کی حرکتیں نہیں کروں گا بلکہ کوشش کروں گا کہ شائستہ بنوں اور اپنے ترکاری کھانے کی تلافی میں اور آداب سیکھوں جو انسان کو مہذب صحبت کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے میں نے ایک ناممکن کام کا بیڑا اٹھایا یعنی انگریز جنٹلمین بننے کا۔

میں نے یہ سوچا کہ بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے جو میں پہنے ہوں انگلستان کی سوسائٹی کے قابل نہیں ہیں اس لئے میں نے آرمی اینڈ نیوی کی کوٹھی سے نئے کپڑے خریدلئے۔ ایک لمبی ریشمی ہیٹ بھی انیس شلنگ میں خریدی جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑی قیمت تھی مجھے اس پر بھی قناعت نہ ہوئی بلکہ دس پاؤنڈ ضائع کرکے ایک ایوننگ سوٹ بونڈ اسٹریٹ میں سلوایا جو اس زمانے میں فیشن کا مرکز سمجھی جاتی تھی اور اپنے بھائی سے سونے کی دوہری گھڑی زنجیر منگوائی۔ بندھی بندھائی ٹائی لگانا فیشن کے خلاف تھا اس لئے میں نے خود ٹائی باندھنے کی صنعت سیکھی۔ ہندوستان میں تو آئینہ میرے نزدیک بڑے تکلف کی چیز تھی مجھے آئینہ دیکھنا صرف اس دن نصیب ہوتا تھا جس دن گھر کا نائی میری داڑھی مونڈتا تھا۔ یہاں میں روز دس منٹ ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی ٹھیک کرنے اور مانگ نکالنے میں ضائع کرتا تھا۔ بدقسمتی سے میرے بال بھی نرم نہ تھے اور انہیں جمانے میں برش سے خاصی کشتی لڑنا پڑتی تھی۔ جب کبھی میں ٹوپی سر پر رکھتا تھا یا اتارتا تھا تو میرا ہاتھ خود بخود بال درست کرنے

کے لئے سر پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مہذب عادت یہ تھی کہ جب شائستہ سوسائٹی میں بیٹھنا ہوتا تھا تو تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ سر پر جاکر مشین کے پرزے کی طرح یہی عمل کراتا تھا۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی جنٹلمین بننے میں ایک آنچ کی کسر تھی! اس لئے میں نے دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی جو انگریز جنٹلمین کے لئے ضروری ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ ناچ، فرانسیسی زبان، اور خطابت سیکھنا میرے لئے ضروری ہے۔ فرانسیسی نہ صرف ہمسایہ ملک فرانس کی زبان تھی بلکہ سارے براعظم یوروپ میں سمجھی جاتی تھی جس کی سیاحت کا میں قصد رکھتا تھا۔ میں نے طے کیا کہ ایک رقاصی کے کلاس میں ناچ سیکھوں گا اور تین پاؤنڈ، ایک ٹرم کی فیس کے ادا کردئے۔ میں تین ہفتے میں کوئی چھ بار کلاس میں گیا لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی کہ جسم کی حرکت میں موزونیت پیدا کروں۔ میں پیانو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے تال کے ساتھ قدم رکھنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اب میں کرتا تو کیا کرتا۔ ایک سادھو کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے چوہوں کو بھگانے کے لئے بلی پالی، بلی کو دودھ پلانے کے لئے گائے رکھی، گائے چرانے کے لئے آدمی رکھا غرض اسی طرح سلسلہ بڑھتا گیا۔ میرے حوصلے بھی اس سادھو کے خاندان کی طرح بڑھتے گئے میں نے سوچا کہ مغربی موسیقی کا مذاق پیدا کرنے کے لئے وایولن بجانا سیکھوں۔ اس لئے میں نے تین پاؤنڈ کا ایک وایولن خریدا اور سکھانے والے کی فیس میں بھی کچھ خرچ ہوا۔ میں ایک تیسرے استاد کے پاس خطابت سیکھنے گیا اور ایک گنی ابتدائی فیس کی ادا کی۔ انہوں نے بیل کی کتاب "کامل خطیب" نصاب کے طور پر مقرر کی اور میں نے اسے خرید لیا۔ پٹ کی ایک اسپیچ سے میں نے ابتدا کی۔

لیکن بیل کی کتاب نے صدائے جرس بنکر مجھے خواب غفلت سے بیدار کیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "مجھے کچھ انگلستان میں عمر تو گذارنا نہیں۔ پھر آخر خطابت سیکھنے سے

کیا فائدہ ؟ اور ناچ سیکھ کر میں جنٹلمین کیسے بن جاؤں گا ؟ رہا وائلن تو وہ میں ہندوستان میں بھی سیکھ سکتا ہوں میں طالب علم ہوں۔ مجھے اپنی پڑھائی کی فکر کرنا چاہئے۔ مجھے "انس آف کورٹ"[1] میں داخل ہونے کی تیاری کرنا چاہئے۔ اگر میں اپنی سیرت کی بدولت جنٹلمین بن جاؤں تو فبہا ورنہ مجھے اس حوصلے سے ہاتھ دھولینا چاہئے۔

اس قسم کے خیالات کا میرے ذہن میں ہجوم تھا اور میں نے انکا اظہار اپنے خطابت کے استاد کے نام ایک خط میں کیا جس میں ان سے یہ درخواست تھی کہ مجھے آئندہ حاضری سے معذور رکھیں۔ میں نے ابتک صرف دو یا تین سبق لئے تھے۔ اسی طرح کا خط میں نے ناچ سکھانیوالی کو لکھا اور وائلن سکھانیوالی کے پاس خود جاکر درخواست کی کہ میرا وائلن جس قیمت پر بکے بیچ دیں۔ وہ مجھ پر مہربان تھیں اس لئے میں نے ان سے کہدیا کہ مجھے یکایک یہ محسوس ہوا ہے کہ میں ایک جھوٹے نصب العین کی پیروی کر رہا ہوں انہوں نے میرے طرز عمل کی کامل تبدیلی میں میری ہمت افزائی کی۔

یہ سودا مجھے کوئی تین مہینے رہا۔ لباس میں اہتمام اور تکلف برسوں باقی رہا لیکن اس وقت سے میں طالب علم بن گیا۔

سولھواں باب

تبدیلیاں

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ زمانہ جس میں میں نے ناچ وغیرہ کے تجربے کئے، میری زندگی میں عیش پرستی کا زمانہ تھا۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اُن دنوں بھی میرے ہوش حواس قائم تھے۔ میں فیشن کی ترنگ میں مست سہی مگر کبھی کبھی مشاہدۂ نفس سے بھی کام لیتا تھا۔ میں پیسے پیسے کا حساب رکھتا تھا اور سمجھ بوجھ کر خرچ کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً آمنی بس(۱) کا کرایہ یا خط کے ٹکٹ یا اخبار کے پیسے بھی درج کر لیتا تھا اور شام کو سونے سے پہلے میزان دے کر باقی نکال لیتا تھا۔ یہ عادت مجھے ہمیشہ رہی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجودیکہ میرے ہاتھ میں قومی کاموں کے لئے لاکھوں روپیہ رہا مگر میں نے اس کے خرچ کرنے میں نہایت کفایت شعاری برتی اور جتنی تحریکیں میری نگرانی میں تھیں ان میں سے کسی پر کبھی قرض نہیں رہا بلکہ ہمیشہ بچت ہی رہی۔ ہر نوجوان مجھ سے سبق حاصل کرے اور جتنا روپیہ اس کے ہاتھ میں آئے اور خرچ ہو سب کا حساب رکھے۔ اس سے اُسے آگے چل کر بڑا فائدہ ہوگا۔

میں اپنی زندگی کا سختی سے احتساب کرتا تھا اس لئے مجھے محسوس ہو گیا کہ کفایت شعاری برتنے کی ضرورت ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا خرچ آدھا کر دوں گا حساب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بس وغیرہ کے کرایہ میں کافی خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ

---

(۱) کرائے کی موٹر لاری جو مسافروں کو لے جاتی ہے۔

خاندان کے ساتھ رہنے میں ہر مہینے اچھی خاصی رقم کا بل ادا کرنا ہوتا تھا۔ پھر اخلاق کا تقاضا تھا کہ خاندان کے ارکان کو کبھی کبھی کھانا کھلانے لے جاؤں اور اُن کے ساتھ دعوتوں میں جاؤں۔ ان باتوں میں سواری کا بہت خرچ تھا خصوصاً اگر کوئی خاتون ساتھ ہو تو دستور کے مطابق کل مصارف مجھی کو ادا کرنا پڑتے تھے۔ کھانے کیلئے باہر جانا ایک جداگانہ مد تھی کیونکہ گھر پر کھانے کی بنا پر ہفتہ وار بل میں کوئی رقم مجرا نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ سب رقمیں بچائی جا سکتی ہیں اور رسمی معاشرت کی بیجا پابندی سے جو بار میرے جیب خرچ پر پڑتا ہے وہ روکا جا سکتا ہے۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ الگ کمرے لے کر رہوں اور اپنے کام کے لحاظ سے تبدیل مقام کرتا رہوں تاکہ کفایت بھی ہو اور تجربہ بھی بڑھے۔ کمروں کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ جہاں مجھے کام کرنا ہو وہاں پیدل چل کر آدھ گھنٹے میں پہنچ جایا کروں اس سے پہلے جب مجھے باہر جانا ہوتو مجبوراً سواری پر جاتا تھا اور ٹہلنے کے لئے الگ وقت نکالنا پڑتا تھا۔ نئے انتظام میں ورزش اور کفایت شعاری کا ساتھ ہو گیا۔ کرائے کا کرایہ بچتا تھا اور آٹھ دس میل چل بھی لیتا تھا۔ زیادہ تر اسی پیدل چلنے کی عادت کی بدولت میں قیام انگلستان کے زمانے میں بیماری سے محفوظ رہا اور میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

غرض میں نے دو کمرے کرائے پر لئے ایک سونے کا کمرا اور ایک نشست کا کمرا۔ یہ میری زندگی کی تبدیلی کی دوسری منزل تھی۔ تیسری ابھی آنے کو تھی۔

اس سے میرا خرچ آدھا ہو گیا۔ اب یہ سوال تھا کہ وقت کو کس طرح کام میں لاؤں مجھے معلوم تھا کہ بیرسٹری کے امتحانوں کے لئے زیادہ مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ میری انگریزی کمزور تھی اور اس کی مجھے ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ لیلی صاحب (جو آگے چل کر سر فریڈرک کہلائے) کے الفاظ اب

تک میرے کانوں میں گونجتے تھے، "پہلے بی اے پاس کرلو تب میرے پاس آؤ"۔ میں نے سوچا کہ مجھے بیرسٹری کے علاوہ کوئی ادبی سند بھی لینا چاہیئے۔ میں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب کے متعلق دریافت کیا اور چند دوستوں سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ اگر میں ان دونوں یونیورسٹیوں میں سے کسی میں جاؤں تو بہت خرچ پڑے گا اور انگلستان میں بہت دن ٹھہرنا ہوگا اس کے لئے میں تیار نہ تھا۔ ایک دوست نے کہا کہ اگر تمہیں واقعی کوئی مشکل امتحان دینے کا شوق ہو تو لندن کا میٹرکولیشن پاس کرلو۔ اس میں محنت بھی کافی ہو، تمہاری عام استعداد بھی بہت بڑھ جائے گی اور کچھ ایسا زائد خرچ بھی نہیں۔ میں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ لیکن اس امتحان کے نصاب نے مجھے ڈرا دیا۔ لاطینی اور کوئی جدید یوروپی زبان (علاوہ انگریزی کے) لازمی تھیں! میں نے کہا بھلا میں لاطینی کیسے سیکھ پاؤں گا۔ مگر میرے دوست نے اس کے فوائد پر بہت زور دیا: "لاطینی زبان وکیلوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ قانون کی کتابوں کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہو اور بیرسٹری کے امتحان میں رومی قانون[1] کا پورا پرچہ لاطینی میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لاطینی جاننے سے انگریزی زبان پر عبور ہو جاتا ہے"۔ یہ بات میرے دل میں کھب گئی اور میں نے طے کر لیا کہ لاطینی چاہے جتنی مشکل ہو میں اسے سیکھ کر رہوں گا۔ فرانسیسی میں پہلے ہی شروع کر چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جدید زبانوں میں سے اسی کو لوں۔ میں میٹرکولیشن کے ایک پرائیوٹ کلاس میں شریک ہوگیا۔ امتحان سال میں دوبار ہوا کرتا تھا اور اب اگلے امتحان کو پانچ مہینے باقی تھے۔ اتنے عرصے میں تیاری کرلینا میرے لئے قریب قریب ناممکن امر تھا۔ مگر انگریز جنٹلمین بننے کا شائق اب محنتی طالب علم بننے پر تیار ہوگیا۔ میں نے ایک ایک منٹ کا نقشۂ اوقات بنایا۔ لیکن نہ تو میری ذہانت سے اور نہ میرے حافظے سے یہ توقع تھی کہ اتنے دن میں امتحان کے دوسرے مضامین کے ساتھ لاطینی اور فرانسیسی دونوں قابو میں آ جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں لاطینی میں فیل

---

(1) Roman Law

ہوگیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ مجھے لاطینی کا مذاق پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا کہ دوسری بار کوشش کرونگا تو فرانسیسی اور اچھی ہوجائے گی اور اب کی میں سائنس کے حلقے میں بھی کوئی نیا مضمون لے لوں گا۔ کیمیا جو میرا مضمون تھی بہت دلچسپ ہونا چاہئے تھی لیکن تجربات کا موقع نہ ملنے سے اس میں جی نہیں لگتا تھا۔ یہ میرے ہندوستانی کے امتحان میں لازمی مضامین میں سے تھی اسی لئے میں نے لندن میٹرکولیشن میں بھی اسی کو لے لیا تھا۔ مگر اس بار میں نے بجائے کیمیا کے "روشنی اور حرارت" کا انتخاب کیا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ مضمون آسان ہے اور مجھے بھی آسان معلوم ہوا۔

دوبارہ امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ میں نے کوشش کی کہ اپنی زندگی کو اور سادہ بناؤں۔ مجھے یہ احساس تھا کہ میری زندگی کا معیار ابھی تک میرے خاندان کی محدود آمدنی کی نسبت سے اونچا ہی۔ جب مجھے اپنے بھائی کی مشکلوں کا خیال آتا تھا جو دریا دلی سے میرے متواتر مالی امداد کے مطالبے پورے کرتے تھے تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ آٹھ پاؤنڈ[1] سے لے کر پندرہ پاؤنڈ ماہوار تک خرچ کرتے تھے ان میں سے اکثر کو وظیفے کی امداد ملتی تھی۔ میرے سامنے انتہائی سادگی کی مثالیں تھیں مجھے متعدد غریب طالب علم ملے جو مجھ سے زیادہ تنگی سے بسر کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بیچارہ غریبوں کے محلے میں دو شلنگ[2] ہفتہ وار کے کمرے میں رہتا تھا اور لوکھارٹ کی سستی کوکو کی دوکان میں، دن میں چند بار دو پینی[3] کی کوکو اور روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ میں اُس کا مقابلہ تو کیا کرتا لیکن مجھے یہ خیال ہوا کہ میں یقیناً دو کمروں کے

---

(۱) (۲) (۳) لارڈ کرزن کے زمانے میں پاؤنڈ اور روپے کی شرح مبادلہ معین کر دی گئی تھی پاؤنڈ پندرہ روپے کا، شلنگ بارہ آنے کا اور پینی ایک آنے کی ہوتی تھی۔ اس سے پہلے شرح مختلف رہا کرتی تھی۔

بجائے ایک کمرے سے کام چلا سکتا ہوں اور دو ایک وقت کا کھانا گھر پر پکا سکتا ہوں۔
اس میں چار یا پانچ پاؤنڈ ماہوار بچ جائیں گے۔ میں نے سادہ زندگی کے متعلق بعض
کتابیں بھی پڑھیں۔ میں نے یہ کمرے چھوڑ کر ایک کمرا کرائے پر لیا، ایک گیس کا چولھا خریدا
اور اپنا کھانا گھر پر پکانا شروع کیا۔ اس میں مجھے بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔
کیونکہ صرف جئی کا دلیا پکانا تھا اور کوکو بنانا۔ دوپہر کا کھانا میں باہر کھاتا تھا اور شام
کو گھر آکر روٹی اور کوکو پر گذر کرتا تھا۔ اس طرح میرا روزانہ خرچ ایک شلنگ تین پنس رہ گیا
یہی زمانہ محنت کی پڑھائی کا بھی تھا۔ سادہ زندگی کے سبب سے میرا بہت وقت بچتا تھا
اور میں اپنے امتحان میں پاس ہو گیا۔

پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ اس طرح رہنے میں میری زندگی بے لطفی سے گذرتی
تھی۔ بلکہ اس کے برعکس اس تبدیلی کی بدولت میری بیرونی اور اندرونی زندگی میں
ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ اور یہ طریقہ خاندان کی آمدنی کے لحاظ سے بھی مناسب تھا۔
میری زندگی زیادہ سچی بن گئی اور میری روحانی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

سترھواں باب

غذائیات کے تجربے

جب میں نے اپنے نفس کا زیادہ گہرا احتساب کیا تو مجھے روز بروز اندرونی اور بیرونی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ۔ اپنے طرز زندگی اور اخراجات میں تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ہی ، بلکہ اس سے بھی پہلے ، میں نے اپنی غذا میں تبدیلی شروع کر دی ۔ میں نے دیکھا کہ جن لوگوں نے "نباتاتی مشرب" پر کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس مسئلے کی باریکیوں پر مذہبی ، علمی ، عملی اور طبی پہلو سے غور کیا ہے ۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جانوروں پر ہاتھ صاف کرے بلکہ اعلیٰ مخلوق کو ادنیٰ مخلوق کی حفاظت کرنا چاہیئے اور ان دونوں میں ویسا ہی اتحاد عمل ہونا چاہیئے جیسا انسانوں میں آپس میں ہوتا ہے ۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا تھا کہ انسان کی اصلی غرض کھانے سے زبان کا مزا نہیں بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہے ۔ اس لئے ان میں سے بعض کی یہ رائے تھی کہ نہ صرف گوشت سے بلکہ انڈے اور دودھ سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے اور وہ خود اس پر عمل کرتے تھے سائنس کے نقطۂ نظر سے ان کا خیال تھا کہ انسان کی جسمانی ساخت ہی سے ظاہر ہے کہ اس کے لئے غذا کو پکا کر کھانا مناسب نہیں بلکہ اسے کچے پھل اور ترکاریوں پر گذر کرنا چاہیئے ۔ طبی نقطۂ نظر سے ان کی یہ رائے تھی کہ ہر قسم کے مسالے سے پرہیز کرنا چاہیئے اقتصادی اور عملی دلیلوں سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ نباتاتی غذا میں سب سے کم خرچ ہے ۔ مجھ پر ان سب باتوں کا اثر ہوا اور مجھے نباتاتی ریستوران میں ان سب

قسموں کے نباتاتی[1] ملا کرتے تھے۔ انگلستان میں ایک نباتاتی انجمن تھی جس کا ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا۔ میں اس اخبار کا خریدار اور انجمن کا رکن ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی دن میں اس کی مجلس انتظامی میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں مجھے ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نباتاتی مشرب کے رکن رکین سمجھے جاتے تھے اور میں نے غذائیات پر تجربے شروع کر دئے۔

میں نے مٹھائی اور مسالے دار چیزیں جو گھر سے آئیں تھیں، کھانا چھوڑ دیں۔ طبیعت کا رنگ بدل جانے سے چٹپٹی چیزوں کا شوق رفتہ رفتہ کم ہو گیا اور اب مجھے بغیر مسالے کی ابلی ہوئی پالک میں جو رچمنڈ میں سیٹھی معلوم ہوتی تھی مزا آنے لگا اس قسم کے بہت سے تجربوں سے میں نے یہ سیکھا کہ ذائقے کا تعلق اصل میں زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔

ظاہر ہے کہ اقتصادی مصلحت بھی ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی تھی اس زمانے میں بعض لوگ چائے اور قہوے کو مضر سمجھتے تھے اور کوکو کے موافق تھے اور چونکہ میرا یہ عقیدہ ہو گیا کہ انسان کو صرف وہی چیزیں کھانا چاہئے جو جسم کی قوت کو قائم رکھتی ہیں اس لئے میں نے چائے اور قہوے کی عادت چھوڑ دی اور ان کی جگہ کوکو استعمال کرنے لگا۔

جس ریستوران میں میں جایا کرتا تھا اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں خوشحال لوگ جایا کرتے تھے۔ یہاں بہت سے کھانے تیار رہتے تھے جس میں سے کھانیوالا اپنی پسند کی چیزیں چن لیتا تھا اور انکی قیمت دے دیتا تھا۔ اس طرح ہر کھانے کی قیمت ایک شلنگ سے دو شلنگ تک ہوتی تھی۔ دوسرے حصے میں چھ پینی میں تین قسم کے کھانے اور ایک روٹی کا ٹکڑا ملتا تھا۔ انتہائی کفایت شعاری کے زمانے میں میرا کھا

---

(1) Vegetarian

جسے میں کھانا کھایا کرتا تھا۔

اس بڑے تجربے کے ساتھ ساتھ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے تجربے بھی کرتا رہا تھا مثلاً کچھ دن نشاستے دار چیزیں[1] چھوڑ دیں، کچھ دن محض روٹی اور پھل پر گزارا کیا، کچھ دن پنیر دودھ اور انڈوں پر۔ یہ آخری تجربہ قابل ذکر ہے۔ یہ دو ہفتے سے بھی کم چلا۔ جس مصلح نے بے نشاستے کی غذا پر زور دیا تھا اس نے انڈے کی بڑی تعریف کی تھی اور اسکی رائے تھی کہ انڈا گوشت میں داخل نہیں۔ بہ قول اُس کے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انڈا کھانے میں کسی زندہ مخلوق کو نقصان نہیں پہنچتا۔ میں اس دلیل سے دھوکے میں آگیا اور باوجودیکہ گوشت سے پرہیز کرنے کا عہد کر چکا تھا، میں نے انڈے کھالئے لیکن یہ لغزش عارضی تھی۔ مجھے اپنے عہد کی تاویل کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مجھے اس کے وہی معنی سمجھنا چاہیئے تھے جو عہد لیتے وقت میری والدہ کے ذہن میں تھے۔ میں جانتا تھا کہ انکے نزدیک انڈے بھی گوشت میں شامل ہیں جیسے ہی اس عہد کا صحیح مفہوم میری سمجھ میں آیا میں نے انڈے بھی چھوڑے اور اس تجربے سے بھی ہاتھ دھویا۔

اس دلیل میں ایک باریکی ہے جو غور کے قابل ہے۔ میں نے انگلستان میں گوشت کی تین تعریفیں سنیں۔ پہلی کی روسے گوشت سے مراد محض پرندوں اور چوپایوں کا گوشت ہے۔ جو نباتی اس تعریف کے قائل تھے وہ پرندوں اور چوپایوں کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے مگر مچھلی اور انڈا کھاتے تھے۔ دوسری تعریف کی روسے گوشت کے مفہوم میں ہر جانور کا گوشت آجاتا ہے۔ اس لئے مچھلی کھانا ناجائز ہے مگر انڈا جائز ہے۔ تیسری تعریف کے مطابق گوشت میں سب جانوروں کا گوشت اور جو چیزیں ان سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً انڈا اور دودھ سب داخل ہیں۔ اگر میں پہلی تعریف کو قبول کر لیتا تو میں نہ صرف

---

(۱) جیسے چاول، آلو وغیرہ۔

انڈا بلکہ مچھلی بھی کھا سکتا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسی تعریف کا پابند ہوں جس کی قائل میری والدہ ہیں اس لئے اگر میں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہوں تو مجھے دونوں چیزیں چھوڑ دینا چاہئیں۔ چنانچہ میں نے یہی کیا۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ نباتاتی ریستوران میں بھی بہت سے کھانوں میں انڈا پڑتا ہے۔ مثلاً بہت سی قسم کی پڈنگ اور کیک میں۔ اس کے معنی یہ تھے، اگر مجھے خود نہ معلوم ہو تو پوچھنا پڑتا تھا کہ فلاں چیز میں انڈا ہے یا نہیں اور یہ بہت برا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اپنے فرض کے احساس سے یہ دقت تو ضرور ہوئی مگر میرے کھانے کا مسئلہ اور بھی سہل ہو گیا۔ البتہ بہت سی چیزیں جن کا مجھے شوق ہو گیا تھا با دل ناخواستہ چھوڑنا پڑیں۔ یہ دقتیں عارضی تھیں کیونکہ اپنے عہد کی سختی سے پابندی کرنے سے مجھے ظاہری مزے کے بدلے باطنی روحانی مزا ملا جو صریحی طور پر زیادہ صحت بخش، زیادہ لطیف اور زیادہ پائدار تھا۔

اصلی امتحان ابھی باقی تھا۔ یہ دوسرے عہد کے متعلق تھا۔ لیکن جسے خدا بچانا چاہے کس کی مجال ہے کہ اس کو گرا سکے۔

یہاں چند کلمے عہد و پیمان کی تاویل کے متعلق کہنا بیجا نہ ہوگا۔ عہدوں کی تاویل سے ساری دنیا میں سیکڑوں جھگڑے پیدا ہوئے ہیں۔ چاہے کتنا ہی صاف عہد ہو لوگ اسے توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا بنا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ امیروں سے لیکر غریبوں تک اور راجا سے لیکر پرجا تک سماج کے ہر طبقے میں موجود ہیں۔ خود غرضی انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ مبہم لفظوں سے غلط منطقی نتیجے نکال کر وہ اپنے آپ کو دنیا کو اور خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ ایک زریں اصول یہ ہے کہ عہد کے وہی معنی سمجھے جائیں جو عہد لینے والا ایمانداری سے سمجھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب ایک عہد کے دو مفہوم ہو سکتے ہوں تو اسے ترجیح دی جائے جو کمزور فریق کے نزدیک صحیح ہو۔ ان اصولوں پر عمل نہ کرنے سے فساد اور بے انصافی پیدا ہوتی ہے جس کی جڑ جھوٹ ہے۔ جو

شخص جو صرف حق کا طالب ہے آسانی سے زریں اصول پر عمل کر سکتا ہے۔ اسے تاویل کے لئے عالموں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ زریں اصول کے مطابق گوشت کے جو معنی میری والدہ سمجھتی تھیں صرف وہی میرے لئے سچے معنی ہو سکتے تھے نہ وہ مفہوم جو میرے وسیع تر تجربے یا بہتر علم کے غرور نے مجھے سکھایا تھا۔ انگلستان میں جو تجربے میں نے کئے وہ کفایت شعاری اور حفظان صحت کے نقطہ نظر سے کئے۔ اس مسئلے کے مذہبی پہلو پر میں نے اس وقت غور کیا جب میں جنوبی افریقہ گیا۔ وہاں میں نے بڑی محنت اور جفاکشی سے تجربے کئے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ مگر ان سب کی بنیاد انگلستان ہی میں پڑ گئی تھی۔

جو آدمی کوئی مذہب نیا نیا اختیار کرتا ہے اس میں اس شخص سے زیادہ جوش ہوتا ہے جس کا وہ آبائی مذہب ہے۔ نباتاتی مشرب انگلستان والوں کے لئے ایک نیا عقیدہ تھا اور میرے لئے بھی کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ میں پہلے گوشت کھانے کا سختی سے قائل تھا اور نباتاتی مشرب ذہنی عقیدے کی حیثیت سے میں نے بعد کو اختیار کیا۔ نئی عقیدت کے جوش میں میں نے لندن کے اس حصے میں جس میں رہتا تھا ایک نباتاتی کلب قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ سر ایڈون آرنلڈ کو جو وہیں رہتے تھے میں نے صدر بنایا اور رسالہ "نباتاتی" کے اڈیٹر ڈاکٹر اولڈفیلڈ کو نائب صدر۔ میں خود اس کا معتمد بنا۔ کلب کچھ دن چلتا رہا مگر چند مہینے کے بعد بند ہو گیا۔ کیونکہ میں اپنی تبدیل مقام کی عادت کے مطابق اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ مگر اس مختصر اور محدود تجربے سے مجھے انجمنیں قائم کرنے اور چلانے کا تھوڑا بہت سلیقہ ہو گیا۔

اٹھارھواں باب

حجاب میری سپر بن گیا

میں نباتاتی انجمن کی مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب ہوا اور پابندی سے اُس کے ہر جلسے میں شریک ہونے لگا۔ مگر ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر اولڈ فیلڈ نے مجھ سے کہا "تم مجھ سے تو خوب باتیں کرتے ہو، مگر یہ کیا بات ہے کہ کمیٹی کے جلسے میں کبھی زبان نہیں کھولتے؟ نکھٹو کی طرح بیٹھے رہتے ہو۔ میں اس پھبتی کو سمجھ گیا۔ شہد کی مکھیاں ہمیشہ کام میں لگی رہتی ہیں مگر زر پورا احدی ہوتا ہے۔ اور واقعی یہ تعجب کی بات تھی کہ دوسرے تو ان جلسوں میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے مگر میں بالکل چپ بیٹھا رہتا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ میرا جی بولنے کو نہ چاہتا ہو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے خیالات کیونکر ظاہر کروں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اور سب ارکان کی معلومات مجھ سے زیادہ ہیں۔ پھر اکثر یہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی میں نے ہمت کر کے بولنا چاہا کوئی نئی بات چھڑ جاتی تھی۔ یہ صورت عرصے تک رہی۔

اس اثنا میں ایک بہت اہم مسئلہ بحث کے لیے پیش ہوا۔ میں نے غیر حاضر رہنا فرض شناسی کے خلاف سمجھا اور چپ چاپ رائے دیدینا بزدلی معلوم ہوئی۔ حسب ذیل واقعے پر بحث چھڑی تھی۔ انجمن کے صدر ہلس صاحب تھے جو ٹیمز آئرن ورکس[1] کے مالک تھے۔ یہ پیوریٹن[2] مذہب رکھتے تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے

---

(۱) لوہے کا کارخانہ۔

(۲) پروٹسٹنٹ عیسائیت کا ایک فرقہ جس کے پیرو اخلاقی امور میں بہت تشدد کرتے ہیں۔

کہ انجمن کا وجود انکی مالی امداد پر منحصر تھا۔ کیٹی کے اکثر ممبران کے آورٹے تھے۔ ڈاکٹر
ایلنسن بھی جن کی نباتاتی حلقوں میں بہت شہرت ہی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ یہ انضباط
ولادت(۱) کی تحریک کے جو اس زمانے میں نئی نئی چلی تھی، حامی تھے اور مزدوروں میں
اس کے طریقوں کی تلقین کرتے تھے۔ ہلس صاحب کا خیال تھا کہ ان طریقوں سے اخلاق
کی جڑ کٹ جائے گی۔ انکے نزدیک نباتاتی انجمن کا مقصد محض غذا کی اصلاح نہیں تھی
بلکہ اخلاقی اصلاح بھی اور ڈاکٹر ایلنسن جیسے شخص کو جو پیوریٹن عقیدے کا مخالف تھا
اس انجمن کا رکن رہنے دینا نامناسب تھا۔ اس لئے انکے اخراج کی تحریک پیش
ہوئی۔ مجھے اس مسئلے میں گہری دلچسپی تھی۔ میں ڈاکٹر ایلنسن کے انضباط ولادت کے
طریقوں کو خطرناک سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ ہلس صاحب کو بہ حیثیت پیوریٹن کے
ان کی مخالفت کرنے کا حق ہے۔ یوں بھی میں ہلس صاحب کی فیاضی کی بہت قدر کرتا
تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ ناانصافی تھی کہ کوئی شخص ایک نباتاتی انجمن سے محض اس
بنا پر خارج کر دیا جائے کہ وہ پیوریٹن اخلاق کو انجمن کے مقاصد میں سے نہیں سمجھتا۔
یہ ہلس صاحب کی ذاتی رائے تھی کہ پیوریٹن مذہب کے مخالف انجمن سے خارج
کر دئے جائیں۔ اسے انجمن کے علانیہ مقصد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کا مقصد
تو محض نباتاتی مشرب کو فروغ دینا تھا نہ کہ کسی خاص نظام اخلاق کی حمایت کرنا۔
اس لئے میری رائے تھی کہ ہر شخص جو اس کا قائل ہے کہ سوائے نباتاتی غذا کے
کچھ نہ کھانا چاہئے اس انجمن کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ اور
اخلاقی مسائل میں اس کا کیا عقیدہ ہے۔ کیٹی میں اور لوگ بھی میرے ہم رائے تھے
لیکن میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں خود اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ اب سوال
یہ تھا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ تقریر کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اس لئے میں نے

---

(۱) Birth Control

یہ طے کیا کہ اپنے خیالات قلم بند کر لوں میں جب جلسے میں گیا تو یہ کاغذ میری جیب میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مجھ سے یہ بھی نہ بن پڑا کہ اسے پڑھ کر سنا دوں بلکہ صدر نے کسی اور سے پڑھوایا۔ ڈاکٹر ایلنسن ہار گئے۔ یہ میری اس قسم کی پہلی جنگ تھی اور اس میں میں ہارنے والے فریق کے ساتھ تھا۔ لیکن مجھے اس خیال سے تسکین تھی کہ ہم حق بجانب ہیں مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ اس کے بعد میں نے مجلس انتظامیہ سے استعفا دیدیا۔

جبتک میں انگلستان رہا مجھ میں یہ حجاب باقی رہا۔ اگر میں کسی سے ملنے بھی جاتا تھا اور وہاں پانچ چھ آدمی موجود ہوتے تھے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔

ایک بار میں مضمونداری کے ساتھ وینٹنر گیا۔ یہاں ہم ایک نباتاتی مشرب خاندان کے ساتھ ٹھہرے۔ "اخلاقیات غذا" کے مصنف ڈاکٹر ہاورڈ بھی اسی صحت گاہ میں مقیم تھے۔ ہم ان سے ملے اور انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ ایک جلسے میں نباتاتی مشرب کی تلقین کے لئے تقریر کریں۔ میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ تقریر لکھ کر پڑھ دینا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ بہت سے لوگ اپنے خیالات اختصار اور تسلسل کے ساتھ ادا کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ زبانی تقریر کرنا میرے لئے ناممکن تھا اس لئے میں نے اپنی تقریر قلمبند کر لی تھی۔ میں پڑھنے کھڑا ہوا مگر مجھ سے نہیں پڑھی گئی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور میں سارے بدن سے کانپنے لگا حالانکہ تقریر فلسکیپ کے ایک صفحے سے زیادہ نہ تھی۔ آخر میری طرف سے مضمونداری کو پڑھنا پڑی۔ خود ان کی تقریر بہت اچھی تھی اور لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ مجھے اپنی نالائقی پر شرم آئی اور رنج ہوا۔

انگلستان میں مجمع عام میں تقریر کرنے کی آخری کوشش میں نے اپنی روانگی سے ایک دن پہلے کی۔ مگر اس بار بھی میں نے اپنا مضحکہ کرایا۔ میں نے ہوبرن ریستوران میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اپنے نباتاتی دوستوں کی دعوت کی۔ میں نے دل میں

سوچا کہ نباتاتی ریستوران میں تو نباتاتی دعوت ہوا ہی کرتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ غیر نباتاتی ریستوران میں ایسی دعوت نہ ہو۔ اور میں نے ہوبرن ریستوران کے منیجر سے مل کر یہ طے کیا کہ ایسا کھانا پکے جس میں کوئی غیر نباتاتی چیز مطلق نہ ہو۔ نباتاتی مشرب والوں نے بڑی خوشی سے اس تجربے کا خیر مقدم کیا۔ دعوتیں ہمیشہ لطف صحبت کے لئے ہوتی ہیں لیکن مغرب نے انہیں اتنی ترقی دی ہے کہ ایک مستقل فن بنالیا ہے۔ وہاں دعوت میں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے، باجہ بجتا ہے، تقریریں کی جاتی ہیں میری چھوٹی سی دعوت بھی اس طمطراق سے خالی نہ تھی۔ اس لئے تقریروں کا ہونا ضروری تھا جب میری باری آئی تو میں بھی تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ میں نے بڑے اہتمام سے ایک تقریر سوچی تھی جس میں چند جملوں سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن میں ایک جملے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میں نے ایڈیسن کا قصہ پڑھا تھا کہ جب وہ پہلی بار دارالعوام میں تقریر کرنے لگا تو اس نے تین بار کہا "مجھے امید ہے" مگر اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس پر ایک ظریف نے اٹھ کر کہا "حضرت کو امید[1] تین بار رہی مگر ہوا ہوایا کچھ نہیں" میرا ارادہ تھا کہ اسی قصے سے ابتدا کر کے ایک ظریفانہ تقریر کروں۔ ابتدا تو میں نے کر دی مگر ایک جملہ کہہ کر اٹک گیا۔ میرے حافظے نے بالکل کام نہ دیا۔ اور ظریفانہ تقریر کی کوشش میں میں خود آماج گاہ ظرافت بن گیا۔ میں نے سلسلے کو چھوڑ کر کہا "میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری دعوت قبول کی" اور بیٹھ گیا۔

جنوبی افریقہ پہنچ کر میرا یہ حجاب کچھ کم ہوا مگر رفع نہیں ہوا۔ فی البدیہ تقریر کرنا میرے لئے ناممکن تھا جب کبھی اجنبی مجمع کا سامنا ہوتا تو میں جھجکتا اور جہاں تک

---

(1) امید اردو میں حمل کو بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں Conceive کا لفظ تھا جس میں یہی ایہام ہے۔ اس کے معنی خیال کرنے کے بھی ہیں اور حمل سے ہونے کے بھی۔

ہوسکتا تقریر کرنے سے پہلو بچاتا۔ آج بھی نہ مجھ سے یہ ممکن ہے اور نہ میں چاہتا ہوں کہ دوستوں کے مجمع کو فضول باتوں میں الجھائے رکھوں۔

مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس خلقی حجاب سے سوائے اس کے کہ کبھی کبھی میرا مضحکہ اڑایا گیا، مجھے اور کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ چیز میرے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ رک رک کر تقریر کرنے سے مجھے ایک زمانے میں تکلیف ہوتی تھی مگر اب خوشی ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے مجھے لفظوں کی کفایت شعاری سکھائی۔ میں نے خیالات کو قابو میں رکھنے کی عادت ڈالی اور اب میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زبان سے یا میرے قلم سے کوئی لفظ بے سوچے سمجھے نہیں نکلتا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے اپنی تحریر یا تقریر میں کوئی لفظ ایسا استعمال کیا ہو جس پر بعد میں پشیمانی ہوئی ہو۔ اس طرح میں خدا جانے کتنی مصیبت سے اور تضیع اوقات سے محفوظ رہا۔ تجربے نے مجھے سکھایا ہے کہ خاموشی طالب حق کی روحانی تربیت کا جز ہے۔ انسان میں یہ قدرتی کمزوری ہے کہ وہ جان بوجھ کر یا انجان پن میں سچی بات کو گھٹا بڑھا کے بیان کرتا ہے۔ اور اس پر قابو پانے کے لئے خاموشی ضروری ہے۔ کم سخن آدمی عموماً بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولتا ایک ایک لفظ کو تولتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو بات کرنے کی بےصبری ہوتی ہے۔ ہر جلسے میں لوگ تقریر کی اجازت کے لئے پرچے لکھ لکھ کر صدر کی ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اور جب اجازت ملتی ہے تو عموماً لوگ مقررہ وقت سے آگے بڑھ جاتے ہیں، اور وقت مانگتے ہیں اور پھر بغیر اجازت کے تقریر کرتے رہتے ہیں۔ آخر اس قدر باتیں کرنے سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میرا حجاب دراصل میرا زرہ بکتر ہے۔ اس کے سبب سے مجھے روحانی ترقی کا موقع ملا۔ اس نے مجھے حق و باطل میں تمیز کرنا سکھایا۔

انیسواں باب

جھوٹ کا ناسور

چالیس سال پہلے انگلستان میں ہندوستانی طالب علم آج کل کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ ان لوگوں کا دستور تھا کہ چاہے بیاہے بھی ہوں مگر کنوارے بنتے تھے۔ انگلستان میں اسکول اور کالج کے طالب علم سب کنوارے ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کے نزدیک طالب علمی اور شادی کی زندگی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔ ہمارے یہاں بھی پرانے زمانے میں یہی رواج تھا۔ ان دنوں طالب علم برہمچاری کہلاتے تھے۔ مگر آجکل بچپن میں شادی ہوجاتی ہے جو انگلستان میں اَن سنی بات ہے۔ اس لئے وہاں ہندوستانی طالب علموں کو یہ کہتے شرم آتی تھی کہ ہماری شادی ہوگئی ہے۔ اس سخن سازی کا ایک اور بھی سبب تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اصلی حال معلوم ہوگیا تو جس خاندان میں وہ رہتے ہیں اُس کی لڑکیوں کے ساتھ سیر کرنے یا اُن سے عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ چھیڑ چھاڑ کم و بیش پاکبازانہ ہوتی تھی۔ خود والدین اس معاملے میں شہ دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ نوجوان مرد عورت کا اس طرح ملنا اس ملک میں ضروری ہو کیونکہ وہاں ہر نوجوان کو اپنے رفیق کا انتخاب خود کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی نوجوان انگلستان جا کر یہ تعلقات قائم کرتے ہیں جو وہاں کے نوجوانوں کے لئے بالکل قدرتی ہیں تو نتیجہ عموماً مہلک ہوتا ہے جس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے نوجوانوں کا قدم ترغیب سے ڈگمگا جاتا ہے اور وہ جھوٹ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُس میل جول کی خاطر جو انگریز

نوجوانوں کے لئے کتنا ہی معصومانہ کیوں نہ ہو مگر انکے لئے اچھا نہیں۔ مجھے بھی یہ روگ لگ گیا۔ میں بے تکلف اپنے آپ کو کنوارا کہتا تھا حالانکہ میں بیاہا اور ایک بچے کا باپ تھا۔ لیکن اس بناوٹ میں میرا بھلا نہ ہوا۔ محض میری دیرآشنائی اور کم سخنی نے مجھ کو بچایا ورنہ میں قعرِ گناہ میں گر جاتا۔ جب میں بات ہی نہیں کرتا تھا تو کوئی لڑکی مجھ سے کیوں بولتی یا میرے ساتھ جانے پر کیوں راضی ہوتی۔

میری بزدلی بھی میری دیرآشنائی سے کچھ کم نہ تھی۔ جن لوگوں کے یہاں میں ونٹنر میں ٹھہرا تھا اس قسم کے خاندانوں میں قاعدہ تھا کہ مالکِ مکان کی لڑکی مہمانوں کو لے کر ٹہلنے جایا کرتی تھی۔ میری میزبان کی لڑکی ایک دن مجھے اُن خوبصورت پہاڑیوں پر لے گئی جو ونٹنر کے گرد واقع ہیں۔ میں خاصا تیز چلتا تھا لیکن میری رفیق مجھ سے بھی تیز رفتار تھی۔ وہ مجھے کھینچے لئے جاتی تھی اور اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ میں اس کی باتوں پر کبھی کبھی آہستہ سے "ہوں ہاں" کہدیتا تھا یا زیادہ سے زیادہ "ہاں سچ مچ کیسی خوبصورت جگہ ہے"۔ وہ پرندے کی طرح اڑی چلی جاتی تھی اور میں اس فکر میں تھا کہ لوٹ کر گھر کب پہنچیں گے۔ اس طرح ہم ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اب یہ سوال تھا کہ نیچے کیسے اتریں۔ یہ بیس برس کی پھرتیلی لڑکی، اگرچہ اس کے بوٹ اونچی ایڑی کے تھے، تیر کی طرح زن سے نیچے پہنچ گئی۔ میں جھینپتا ہوا، ٹھوکریں کھاتا ہوا، آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ وہ پہاڑی کے دامن میں کھڑی مسکرا رہی تھی، میری ہمت بڑھا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہو تو میں ہاتھ پکڑ کر اتار لاؤں۔ بھلا اس ایسی بزدلی بھی کیا کرتا۔ بہ ہزار دقت زمین پر بیٹھ بیٹھ کر میں کسی طرح نیچے اترا۔ وہ زور سے ہنسی اور "شاباش شاباش" پکارنے لگی۔ غرض اُس نے مجھے اور بھی شرمندہ کیا اور اُسے اس کا حق بھی تھا۔

لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میں بالکل صاف بچ جاتا کیونکہ خدا کو تو یہ منظور تھا کہ مجھے

جھوٹ کے ناسور سے نجات دے۔ میں ایک بار برائٹن گیا جو وینٹنر کی طرح ایک صحت گاہ ہے۔ یہ وینٹنر جانے سے پہلے کا ذکر ہے۔ وہاں ہوٹل میں ایک متوسط الحال بوڑھی بیوہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ انگلستان میں میرا پہلا سال تھا۔ طعام نامے پر جتنے کھانوں کے نام تھے سب فرانسیسی میں تھے جو میں اس وقت تک نہیں سمجھتا تھا۔ جس میز پر میں تھا اسی پر یہ بوڑھی خاتون بھی تھیں یہ دیکھکر کہ میں اجنبی ہوں اور اس وقت پریشانی میں ہوں انہوں نے فوراً میری مدد کی۔ انہوں نے کہا "معلوم ہوتا ہے تم یہاں اجنبی ہو اور اس وقت کسی دقت میں مبتلا ہو۔ تم نے اب تک کھانے کے لئے کوئی چیز کیوں نہیں منگوائی؟" میں طعام نامے کے ہجے کر رہا تھا اور ویٹر کو بلا کر یہ پوچھنے والا تھا کہ ان کھانوں میں کیا کیا چیزیں ہیں کہ اتنے میں ان نیک خاتون نے مداخلت کی میں نے انکا شکریہ ادا کیا، اور ان سے کہا میں فرانسیسی نہیں جانتا اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا ان میں سے کون کون سے کھانے بناتا تی ہیں۔

انہوں نے کہا "آئیے میں آپ کی مدد کروں۔ میں طعام نامہ[1] آپ کو سمجھا دونگی اور یہ بتا دوں گی کہ آپ کیا کیا چیزیں کھا سکتے ہیں"۔ میں نے احسانمندی سے ان کی مدد قبول کی۔ اس طرح میری ان کی ملاقات کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر دوستی بن گئی۔ یہ دوستی میرے قیام انگلستان کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد بہت دن تک قائم رہی انہوں نے مجھے اپنا لندن کا پتہ دیا اور دعوت دی کہ ہر اتوار کو میرے یہاں کھانا کھایا کرو۔ اس کے علاوہ خاص خاص تقریبوں میں وہ مجھے بلایا کرتی تھیں، میرے حجاب کو رفع کرنے کی کوشش کرتی تھیں مجھے نوجوان خاتونوں سے ملاتی تھیں اور گفتگو اس طرح چھیڑتی تھیں کہ مجھے ان سے باتیں کرنا پڑیں۔ اس گفتگو میں خاص طور پر وہ ایک نوجوان خاتون کو شریک کرتی تھیں جو انکے گھر میں رہتی تھیں اور اکثر ہم دونوں کو بالکل تنہا چھوڑ دیتی تھیں۔

Menu (۱)

شروع شروع میں میں ان باتوں سے بہت گھبراتا تھا۔ نہ میں گفتگو شروع کرسکتا تھا اور نہ مجھے مذاق کرنا آتا تھا۔ مگر انہوں نے میری رہنمائی کی اور میں رفتہ رفتہ آداب مجلس سیکھنے لگا۔ کچھ دن کے بعد مجھے سنیچر کا انتظار رہنے لگا اس نوجوان دوست سے گفتگو میں لطف آنے لگا۔

یہ بوڑھی خاتون اسی طرح میرے آس پاس حال بچھاتی رہیں۔ انہیں ہم دونوں کے ملنے سے دلچسپی تھی۔ شاید اس میں خود امکا بھی کوئی مقصد تھا۔

میں عجب کشمکش وپیچ میں تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "کاش میں ان نیک خاتون سے یہ کہدیتا کہ میری شادی ہوگئی ہے اِتب ہم دونوں کی نسبت کا منصوبہ نہ باندھتیں۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اگر میں سچا حال بیان کردوں تو ممکن ہے آئندہ کے لئے اس مصیبت سے بچ جاؤں" یہ باتیں سوچ کر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس کا مضمون قریب قریب یہ تھا:۔

"جب سے میری آپ کی ملاقات برائٹن میں ہوئی آپ مجھ پر بہت مہربان رہی ہیں۔ آپ نے اس طرح میری خبرگیری کی جیسے ماں بیٹے کی کرتی ہے۔ آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ میں شادی کرلوں اور اس غرض سے آپ نے مجھے نوجوان خاتونوں سے ملایا۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ بات اس سے آگے بڑھے اس سے تو میں یہ اچھا سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے اعتراف کرلوں کہ میں آپ کی محبت کے قابل نہیں۔ جب میں نے آپ کے یہاں آمد و رفت شروع کی مجھے اسی وقت آپ سے کہدینا چاہئے تھا کہ میری شادی ہوچکی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ انگلستان میں جو ہندوستانی طالب علم ہیں وہ اپنی شادی کو چھپاتے ہیں اور میں نے بھی انکی تقلید کی۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے یہ بھی کہدینا چاہئے کہ میری شادی بچپن میں ہوگئی تھی اور اب میں ایک لڑکے کا باپ ہوں۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ اب خدا نے مجھے سچ بولنے کی ہمت

عطا فرمائی ہو۔ کیا آپ میرا قصور معاف کر دیں گی؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ان نوجوان خاتون سے جن سے آپ نے مجھے ملایا تھا ایسی بے تکلفی نہیں برتی جو نامناسب ہو۔ میں جانتا تھا کہ دوستی کی حد کہاں تک ہے۔ آپ کو میری شادی کا حال تو معلوم نہیں تھا اس لئے قدرتی طور پر آپ کی خواہش تھی کہ اُن کی نسبت مجھ سے ہو جائے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو سچے واقعات سے مطلع کر دوں تاکہ بات اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔"

"اگر یہ خط پہنچنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں کہ میں آپ کی مہماں نوازی کا مستحق نہیں ہوں تو یقین مانئے مجھے ناگوار نہ ہوگا۔ آپ نے اپنی مہربانی اور شفقت سے مجھے ہمیشہ کے لئے زیر بار احسان کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ مجھے اپنے یہاں سے نہ نکالیں اور بدستور مہمانی کے قابل سمجھیں جس کا مستحق بننے کی میں انتہائی کوشش کرونگا تو ظاہر ہے مجھے بیحد مسرت ہوگی اور میں اسے آپ کے لطف و کرم کی مزید علامت سمجھوں گا۔"

ناظرین کو سمجھ لینا چاہیے کہ میرے لئے ایسا خط لکھنا تھوڑی دیر کا کام نہ تھا۔ میں نے خدا جانے کتنی بار مسودہ بنا بنا کر بدلا ہوگا۔ اسے بھیجنے کے بعد میرے دل پر سے وہ بوجھ ہٹ گیا جس سے وہ دبا جاتا تھا۔ تقریباً بواپسی ڈاک ان کا جواب آیا جس کا مضمون کم و بیش یہ تھا:۔

"آپ کا خط آیا جس میں آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ ہم دونوں کو خوشی ہوئی اور ہم خوب دل کھول کر ہنسے۔ جس غلط بیانی کے ارتکاب کا آپ کو اعتراف ہے وہ معافی کے قابل ہے مگر یہ اچھا ہوا کہ آپ نے ہمیں اصلی صورت حال بتا دی۔ میری دعوت بدستور قائم ہے۔ امید ہے کہ آپ اگلے اتوار کو ضرور آئیں گے۔ ہمیں اشتیاق ہے کہ آپ کی بچپن کی شادی کے سارے واقعات سنیں اور آپ کا مضحکہ اڑائیں

کیا اب بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے ہماری دوستی میں اس واقعے سے کوئی فرق نہیں آیا ؟ "

اس طرح میں نے جھوٹ کے ناسور سے نجات پائی۔ اس کے بعد جب کبھی ضرورت ہوئی میں نے بے تامل لوگوں سے اپنی شادی کا ذکر کر دیا۔

بیسواں باب
مختلف مذہبوں کا مطالعہ

میرے قیام انگلستان کے دوسرے سال کے آخر میں دو تھیوسوفوں[1] سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ دو بھائی تھے اور دونوں کنوارے۔ انہوں نے مجھ سے "بھگوت گیتا" کا ذکر کیا۔ وہ سر ایڈون آرنلڈ کا ترجمہ "نغمۂ آسمانی" پڑھ رہے تھے اور انہوں نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ اصل کتاب انکے ساتھ مل کر پڑھوں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کیونکہ میں نے یہ مقدس کتاب نہ سنسکرت میں دیکھی تھی نہ گجراتی میں۔ مجھے اُن سے یہ کہنا پڑا کہ میں نے "گیتا" ابھی تک نہیں پڑھی مگر میں بڑی خوشی سے آپ کے ساتھ اس کا مطالعہ کروں گا اور اگرچہ میں سنسکرت بہت کم جانتا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ اصل کتاب کو اس حد تک سمجھ لوں گا کہ ترجمے کی معنوی غلطیوں کو پہچان لوں۔ غرض انکے ساتھ گیتا کی تلاوت کرنے لگا اور جب دوسرے باب کے یہ اشلوک پڑھے:۔

جہاں کسی نے محسوس چیزوں کی طرف توجہ کی
اس کے دل کو ان سے ایک لگاؤ سا ہو جاتا ہے
یہ لگاؤ رفتہ رفتہ خواہش بن جاتا ہے۔
خواہش بڑھتے بڑھتے لگن بن جاتی ہے اور آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔
حافظہ ہراساں ہو کر اونچے مقصد سے ہاتھ دھو لیتا ہے اور دل میں زہر پھیلا دیتا ہے۔

---

(۱) Theosofhist

یہانتک کہ انسان کا دل، اسکا مقصد اور خود انسان ہلاک ہوجاتا ہے۔

تو میرے دل پر بہت اثر ہوا اور یہ آجتک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ مجھے اس کتاب کی انتہائی قدر و قیمت اور عظمت کا احساس ہوا اور اس دن سے برابر یہ احساس بڑھتا گیا یہانتک کہ اب میرے نزدیک حق کی معرفت حاصل کرنے کے لئے اس سے بڑھکر کوئی کتاب نہیں۔ اس نے مایوسی اور افسردگی کی گھڑیوں میں میری بڑی مدد کی ہے۔ میں نے قریب قریب سب انگریزی ترجمے پڑھے ہیں اور ان سب میں میرے خیال میں سر ایڈون آرنلڈ کا ترجمہ بہترین ہے۔ انہوں نے متن کی پوری پابندی کی ہے اور پھر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ اگرچہ میں نے ان دوستوں کے ساتھ "گیتا" پڑھی لیکن میں یہ دعوےٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے اس دفعہ اس کا مطالعہ جیسا چاہئے کیا۔ البتہ چند سال کے بعد میں نے اس کی مزاولت شروع کی۔

ان بھائیوں نے مجھے سر ایڈون آرنلڈ کی "نور ایشیا" پڑھنے کی بھی ہدایت کی۔ میں آرنلڈ صاحب کو اب تک محض "گیتا" کے مترجم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کی "نور ایشیا" مجھے "گیتا" سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوئی۔ جب میں نے اسے شروع کیا تو بغیر ختم کئے نہ چھوڑ سکا۔ یہ دونوں بھائی مجھے بلاواٹسکی لاج میں بھی لے گئے اور میڈم بلاواٹسکی اور مسز بیسنٹ سے میرا تعارف کرایا۔ مسز بیسنٹ حال ہی میں تھیوسوفی انجمن میں داخل ہوئی تھیں اور ان کے تبدیل عقائد کے متعلق جو نزاع ہو رہی تھی اس کا میں بہت دلچسپی سے مطالعہ کرتا تھا۔ ان دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تھیوسوفی انجمن میں شریک ہوجاؤں لیکن میں نے بہ طریق مناسب انکار کر دیا اور کہا "مجھے اپنے مذہب سے بہت کم واقفیت ہے اسلئے میں کسی مذہبی انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔" مجھے یاد ہے کہ میں نے ان دونوں بھائیوں کے کہنے سے میڈم بلاواٹسکی کی کتاب "تھیوسوفی کی کنجی" بھی پڑھی۔ اس کتاب کو پڑھکر مجھے ہندو مذہب کی کتابیں پڑھنے کا اور بھی شوق ہوگیا اور

میرے دل سے وہ غلط خیال نکل گیا جو مشنریوں نے جما رکھا تھا کہ ہندو مذہب میں ضعیف الاعتقادی بھری پڑی ہے۔

اسی زمانے میں ایک نباتاتی بورڈنگ[1] ہاؤس میں مجھے مانچسٹر کے ایک نیک عیسائی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے مجھ سے عیسائیت کے متعلق گفتگو کی۔ میں نے ان سے راجکوٹ کے واقعات کا جو مجھے یاد تھے، ذکر کیا۔ انہیں یہ سن کر تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا" میں گوشت نہیں کھاتا ہوں اور شراب بھی نہیں پیتا۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے عیسائی گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ لیکن کتاب مقدس میں ان دونوں چیزوں کا حکم نہیں دیا گیا۔ مہربانی کرکے آپ بائبل ضرور پڑھئے۔ میں نے انکا مشورہ قبول کرلیا اور انہوں نے مجھے کتاب کا ایک نسخہ لادیا۔ مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ وہ خود بائبل فروخت کرتے تھے اور میں نے ان سے ایک نسخہ خریدا تھا جس میں مقامات کے نقشے، انڈکس اور دوسری چیزیں تھیں جن سے پڑھنے والے کو مدد ملے۔ میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا لیکن توریت کسی طرح مجھ سے آخر تک نہیں پڑھی جاتی تھی۔ میں نے کتاب تخلیق پڑھ ڈالی لیکن اس کے بعد کے حصے پڑھتے پڑھتے نیند آجاتی تھی۔ مگر صرف یہ کہنے کے لئے کہ میں نے کتاب ختم کرلی ہے۔ دوسرے حصے بھی بہ ہزار دشواری دیکھے مگر مطلق دلچسپی نہیں ہوئی اور نہ کچھ سمجھ میں آیا۔ "کتاب اعداد" کو پڑھ کر مجھے بہت کوفت ہوئی۔

لیکن انجیل کا مجھ پر کچھ اور ہی اثر ہوا خصوصاً "پہاڑی کا وعظ" تو بالکل دل میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا مقابلہ "گیتا" سے کیا۔ ان آیتوں کو پڑھ کر "مگر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بدی میں مزاحم نہ ہو بلکہ جو تیرے سیدھے گال پر طمانچہ مارے

---

(۱) خانگی ہوٹل۔

اس کی طرف دوسرا گال بھی پھیر دے۔ اگر کوئی تیری قبا لے لے تو اسے عبا بھی لیجانے دے" مجھے بیحد خوشی ہوئی اور شامل بھٹ کے وہ شعر یاد آئے " جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلا الخ" میرے خام کار ذہن نے اپنی بساط کے موافق "گیتا" " نور ایشیا" اور "پہاڑی کے وعظ" کی تعلیم کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات میرے دل کو لگی کہ ترک دنیا مذہب کا سب سے اونچا درجہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے میرا یہ شوق اور بھی بڑھ گیا کہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کروں۔ ایک دوست نے مجھے کارلائل کی " ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" پڑھنے کی ہدایت کی۔ میں نے اس کا ایک باب "ہیرو بہ حیثیت پیمبر کے" پڑھا اور مجھ پر پیغمبر اسلام کی عظمت، شجاعت اور زہد و اتقا کی حقیقت منکشف ہوئی۔

اُس زمانے میں میں مذہب سے اس سے زیادہ واقفیت نہ حاصل کرسکا کیونکہ امتحان کی کتابوں کے مطالعے سے مجھے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ کچھ اور پڑھ سکوں لیکن میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اور مذہبی کتابیں بھی پڑھوں گا اور تمام بڑے مذہبوں سے واقفیت حاصل کروں گا۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں دہریت سے بھی تھوڑا بہت واقف نہ ہو جاتا؟ ہر ہندوستانی بریڈلا کو اور اس کی نام نہاد دہریت کو جانتا تھا۔ میں نے بھی اس کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میں دہریت کے لق و دق صحرا سے پہلے ہی گذر چکا تھا۔ مسز بیسنٹ نے جن کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی، دہریت سے خدا پرستی کی طرف رجوع کیا تھا۔ اس بات سے اس نفرت کو اور تقویت ہوئی جو میں دہریت کی طرف سے رکھتا تھا۔

اسی زمانے میں بریڈلا کا انتقال ہوا اور وہ ووکنگ کے قبرستان میں دفن کیا گیا میں اُس کے جنازے میں شریک ہوا اور مجھ پر کیا موقوف ہے لندن میں جتنے ہندوستانی تھے سبھی شریک ہوئے چند پادری بھی اسے دفن کرنے آئے تھے۔ قبرستان سے واپس آتے وقت ہمیں ریل کے انتظار میں اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑا مجمع میں ایک دہریہ مجاہد ایک پادری کے پیچھے پڑا ہوا تھا "کیوں صاحب آپ خدا کے قائل ہیں"

بیچارے پادری نے آہستہ سے کہا "بیشک ہوں"۔

دہریے نے بر خود غلط تبسم کے ساتھ کہا "آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ کرۂ زمین کا قطر اٹھائیس ہزار میل ہے"

"جی ہاں"

"اچھا تو بتائیے آپ کا خدا کتنا بڑا ہے اور کہاں ہے"

"کاش ہم جانتے کہ وہ ہم دونوں کے دل میں رہتا ہے"

مجاہد نے فخریہ ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا "بس بس رہنے دیجئے۔ آپ نے مجھے کوئی بچہ مقرر کیا ہے"

پادری عاجزی سے خاموش ہو گیا۔

اس گفتگو نے مجھے دہریت سے اور بھی بدظن کر دیا۔

اکیسواں باب

نربل کے بل رام[1]

گو ہندو مذہب اور دوسرے مذہبوں سے مجھے کچھ یونہی سی واقفیت ہو گئی تھی مگر مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ مجھے آزمائشوں میں ثابت قدم رکھنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ امتحان کے وقت انسان مطلق نہیں جانتا کہ کونسی چیز اس کے کام آئی۔ اگر وہ بیدین ہے تو اپنی نجات کو اتفاق سمجھتا ہے اگر دیندار ہے تو کہتا ہے خدا نے بچا لیا۔ وہ بعد میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مذہبی تعلیم یا روحانی تربیت کی بدولت توفیق الہی نے اس کا ساتھ دیا۔ لیکن عین نجات کے وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ بچانے والی اسکی روحانی تربیت ہی یا کوئی اور چیز۔ کون ایسا ہے جسے اپنی روحانی قوت پر ناز ہوا ور اس نے اسے مٹی میں ملتے نہ دیکھا ہو؟ ان آزمائش کے موقعوں پر دینیات کا علم بغیر دینداری کے جذبے کے پرکاہ کے برابر وقعت نہیں رکھتا۔

انگلستان ہی میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ خالی خولی مذہبی علم محض بیکار ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے متعدد موقعوں پر میں نے کیونکر نجات پائی تھی کیونکہ اُن دنوں میری عمر بہت کم تھی۔ مگر اب میں بیس برس کا ہو چکا تھا اور بیوی

---

(۱) سورداس کے مشہور بھجن کی ٹیپ جو ہر بند کے آخر میں آتی ہے "اللہ ہے حامی بیکس کا اللہ سہارا بے بس کا۔"

بچے والا بھی تھا اس لئے مجھے ان باتوں کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔
جہاں تک مجھے یاد ہے میرے قیام انگلستان کے آخری سال یعنی ۱۸۹۰ء میں پورٹسمتھ میں نباتاتیوں کی کانفرنس تھی جس میں میں اور میرے ایک ہندوستانی دوست مدعو تھے۔ پورٹسمتھ ایک بندرگاہ ہے جس میں بحری افسروں اور خلاصیوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ وہاں بہت سے مکان ایسے ہیں جن میں بدوضع عورتیں رہتی ہیں جو رنڈیاں تو نہیں ہیں مگر اپنے اخلاق کی طرف سے بہت بے پرواہ ہیں۔ ہم اسی قسم کے ایک مکان میں ٹھہرائے گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجلس استقبالیہ اس بات سے بالکل ناواقف تھی۔ پورٹسمتھ ایسے شہر میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ ہمارے جیسے مسافروں کے لئے جو دو چار دن کے لئے آتے ہیں کون سے مکان اچھے ہیں اور کون سے برے۔
ہم شام کو کانفرنس سے لوٹے۔ کھانے کے بعد ہم برج کھیلنے بیٹھے اور اس میں ہماری مالکۂ مکان بھی شریک ہو گئی جیسا کہ انگلستان کے اچھے خاندانوں میں بھی دستور ہے۔ ایسے موقعے پر کھیلنے والے آپس میں بے ضرر مذاق بھی کیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں میرے دوست میں اور مالکۂ مکان میں فحش مذاق ہونے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے دوست اس فن میں استاد ہیں۔ مجھ پر بھی یہ رنگ چھا گیا اور میں بھی شریک ہو گیا۔ عین اس وقت جب میں سیتے چھوڑ چھاڑ کر حد سے آگے بڑھنے والا تھا خدا نے میرے نیک رفیق کی زبان سے یہ مبارک الفاظ کہلوائے: "صاحبزادے، تم میں کہاں سے یہ شیطان سما گیا! جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ!"
میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے اس تنبیہ پر عمل کیا اور دل ہی دل میں اپنے دوست کا بہت شکرگزار ہوا۔ مجھے وہ عہد یاد آ گیا جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شکار کی طرح جو شکاری

سے بچ کر بھاگا ہوا ہانپتا کانپتا اپنے کمرے میں پہنچا۔ میرا بند بند لرز رہا تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو دیکھ کر میرے دل میں شہوانی خواہش ہوئی۔ میں نے وہ رات جاگ کر کاٹی۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا۔ کیا میں یہ مکان چھوڑ دوں؟ یا اس شہر سے بھاگ جاؤں؟ میں کہاں ہوں؟ اگر میرے حواس بجا نہ رہے تو کیا انجام ہوگا؟ میں نے یہ طے کیا اب بہت احتیاط سے کام لوں گا۔ اس مکان سے اٹھ کر کسی اور مکان میں نہ جاؤں گا بلکہ کسی ترکیب سے پورٹسمتھ ہی سے چل دوں گا۔ کانفرنس صرف دو دن کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں دوسرے دن شام کو پورٹسمتھ سے روانہ ہوگیا۔ میرے دوست وہاں کچھ دن اور ٹھہرے رہے۔

مجھے اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ مذہب کی یا خدا کی حقیقت کیا ہے اور خدا ہمارے دلوں پر کیونکر اثر ڈالتا ہے۔ مجھے محض ایک دھندلا سا خیال تھا کہ اس موقع پر خدا نے بچایا۔ ہر امتحان کے وقت اسی نے مجھے بچایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب یہ الفاظ: "خدا نے مجھے بچایا" میرے لئے بڑے گہرے معنی رکھتے ہیں پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی پوری اہمیت ابتک نہیں سمجھا۔ جب تک میرا روحانی تجربہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوگا میں ان کو کما حقہٗ سمجھنے سے قاصر رہوں گا۔ لیکن مجھے جتنے امتحان پیش آئے۔ روحانی زندگی میں، وکالت کے پیشے میں، اداروں کے چلانے میں، سیاست میں۔ سب میں مجھے خدا نے بچایا۔ جب کوئی امید نہیں رہتی جب "مددگار کام نہیں آتے اور سہارے ٹوٹ جاتے ہیں" تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں سے مدد پہنچی، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے، الحاح و زاری، عبادت، دعا او ہام نہیں ہیں یہ حقیقی افعال ہیں اور ان میں کھانے، پینے، بیٹھنے، چلنے سے

زیادہ حقیقت ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ صرف یہی چیزیں حقیقی ہیں اور جو کچھ ہے وہ مجازی ہے۔

یہ عبادت یا دعا خطابت کا طوفان نہیں، محض زبانی طاعت اور بندگی نہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ اگر ہم تزکیہ قلب کی اس منزل پر پہنچ جائیں کہ دل "سوائے محبت کے ہر چیز سے خالی ہو" اگر اس کے سب تار کسے ہوئے ہوں تو "ان کی لرزش نغمہ بن کر حد نظر سے آگے چلی جاتی ہے" دعا کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں۔ وہ بجائے خود سعی محسوس سے مستغنی ہے۔ مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دعا دل کو شہوانی جذبات سے پاک کرنے کیلئے اکسیر ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی عاجزی بھی ہو۔

بائیسواں باب

نرائن ہیم چندر

اسی زمانہ میں نرائن ہیم چندر انگلستان آئے۔ میں نے انکا نام بحیثیت مصنف
کے سنا تھا۔ ہم دونوں کی ملاقات مس میننگ کے یہاں ہوئی جو نیشنل انڈین ایسوسی
ایشن کی کارکن تھیں۔ مس میننگ جانتی تھیں کہ میں لوگوں سے ملنے جلنے اور بات
چیت کرنے میں بہت کچا ہوں۔ جب کبھی میں انکے ہاں جاتا تھا تو خاموش بیٹھا رہتا
تھا اور جب تک کوئی مجھے مخاطب نہ کرے میں کسی سے نہیں بولتا تھا۔ انہوں نے مجھے
نرائن ہیم چندر سے ملایا۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے انکا لباس عجیب تھا۔ بھدا سا
پتلون، میلا کچیلا پارسی وضع کا بھورا کوٹ جس میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں، اس
کے ساتھ نہ کالر نہ نکٹائی، پھندنے دار اونی ٹوپی۔

وہ اکہرے بدن کے پستہ قد آدمی تھے۔ گول چہرے پر چیچک کے داغ، ناک
نہ ستواں نہ زیادہ پھیلی ہوئی۔ منہ پر داڑھی تھی جس میں وہ برابر ہاتھ سے کنگھی کرتے
رہتے تھے۔

ایسی انوکھی شکل اور نرالی پوشاک کے آدمی پر خوش وضع لوگوں کے مجمع میں
خواہ مخواہ نظر کھٹکتی تھی۔ میں نے ان سے کہا "میں نے آپ کا ذکر اکثر سنا ہے اور
آپ کی بعض کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ آپ میرے یہاں تشریف لائے تو بڑی
عنایت ہو۔"

نرائن ہیم چندر کی آواز بھاری تھی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا "اچھی بات ہے

م رہتے کہاں ہو؟"
"اسٹور اسٹریٹ میں"
"تب تو ہم دونوں پاس ہی پاس رہتے ہیں۔ میں انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں
پڑھا دوگے؟"
"مجھے جو تھوڑا بہت آتا ہے بڑی خوشی سے اور بڑی محنت سے آپ کو
پڑھاؤں گا۔ آپ فرمائیں تو میں آپ کے یہاں حاضر ہو جایا کروں"
"اجی نہیں۔ میں خود تمہارے یہاں آؤنگا اور ترجمے کی کتاب بھی لیتا آؤں گا"
غرض ہم نے وقت مقرر کرلیا۔ تھوڑے دنوں میں ہم دونوں میں گہری
دوستی ہوگئی۔
نرائن ہیم چندر صرف و نحو کے بکھیڑے سے پاک تھے "گھوڑا" انکے نزدیک
فعل تھا اور "دوڑو" اسم۔ مجھے ایسی بہت سی مضحک مثالیں یاد ہیں۔ مگر وہ اس
واقفیت کی کب پروا کرتے تھے۔ میرا صرف و نحو کا ناچیز علم انکی نظر میں کوئی وقعت نہ
رکھتا تھا۔ گرامر نہ جاننا انکے نزدیک کوئی شرم کی بات نہیں تھی۔
وہ بڑی بے پروائی سے کہا کرتے تھے "میں نے تمہاری طرح اسکول میں
نہیں پڑھا۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے مجھے کبھی صرف و نحو کی ضرورت محسوس
نہیں ہوئی۔ بنگالی بھی جانتے ہو؟ میں جانتا ہوں۔ میں ہی نے مہارشی دیویندر ناتھ
ٹھاکر کی تصانیف کا گجراتی میں ترجمہ کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اور بہت سی
زبانوں کے ادبی خزانے گجراتی میں منتقل کردوں۔ تم جانتے ہو کہ میں لفظی ترجمہ کبھی
نہیں کرتا۔ میں تو بس اصل مطلب کو اپنی زبان میں ادا کر دیتا ہوں۔ ممکن ہے کہ آگے
چل کر مجھ سے زیادہ قابل لوگ بہتر ترجمہ کریں۔ مگر میں اپنے اسی کام میں خوش ہوں
جو میں نے بغیر صرف و نحو کے کرلیا ہے، میں ہندی، مرہٹی، بنگالی جانتا ہوں اور اب

انگریزی پڑھ رہا ہوں - میری بس یہی خواہش ہے کہ بہت سے الفاظ سیکھ لوں - اور کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا حوصلہ بس اتنا ہی ہے ؟ نہیں نہیں میں ابھی فرانس جاکر فرانسیسی سیکھوں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس زبان کا بڑا وسیع ادب ہے - پھر ممکن ہوا تو جرمنی جاکر جرمن زبان سیکھوں گا - غرض وہ اسی طرح باتیں کرتے چلے جاتے تھے - انہیں زبانیں سیکھنے کا اور غیر ملکوں کی سیاحت کا بڑا شوق تھا -

"آپ امریکہ بھی جائیں گے نہ ؟"

"ضرور جاؤں گا - بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر نئی دنیا دیکھے ہندوستان واپس جاؤں ؟"

"مگر آپ کو روپیہ کہاں سے ملے گا ؟"

"مجھے روپیہ کی کیا ضرورت ہے ؟ میں کچھ تمہاری طرح فیشن ایبل آدمی تو ہوں نہیں - مجھے تو بس پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا چاہئے - اور اس کے لئے جو تھوڑا بہت مجھے اپنی کتابوں سے اور دوستوں سے مل جاتا ہے ، کافی ہے - میں ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتا ہوں - امریکہ بھی "ڈیک" پر جاؤں گا -

سادگی نراین ہیم چندر کا حصہ تھی اور اُنکی صاف گوئی بھی اسی شان کی تھی غرور انہیں چھو بھی نہیں گیا تھا - البتہ بہ حیثیت مصنف کے وہ اپنی قابلیت کا اندازہ کسی قدر زیادہ کرتے تھے -

ہم دونوں میں روزانہ ملاقات ہوتی تھی - ہمارے خیالات اور طرز عمل میں بہت کچھ مشابہت تھی - دونوں نباتاتی تھے - اکثر دوپہر کا کھانا ساتھ کھاتے تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ میں سترہ شلنگ ہفتہ وار میں گذر کرتا تھا - اور اپنا کھانا آپ پکاتا تھا - کبھی میں اُنکے یہاں چلا جاتا تھا ، کبھی وہ میرے یہاں چلے آتے تھے - میں انگریزی طریقہ پر پکاتا تھا - مگر انہیں سوائے ہندوستانی کھانے کے کچھ پسند نہ تھا - دال

کے بغیر وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ میں گاجر وغیرہ کا شوربا تیار کرتا تھا اور وہ میرے مذاق پر افسوس کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہیں کہیں سے مونگ کی دال مل گئی اور وہ پکا کر میرے یہاں لائے۔ میں نے بڑے شوق سے کھائی۔ اس کے بعد سے ہم دونوں میں مبادلے کا باقاعدہ سلسلہ قائم ہو گیا۔ میں جو اچھی چیز پکاتا تھا انکے لئے لے جاتا تھا اور وہ اپنی محبوب چیزیں میرے لئے لاتے تھے۔

اس زمانے میں کارڈنل مینگ کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔ کھاڑی کے مزدوروں کی ہڑتال جان برنس اور کارڈنل مینگ کی کوششوں سے قبل از وقت ختم ہو گئی تھی۔ میں نے نارائن ہیم چندر سے ذکر کیا کہ ڈزرائیلی نے کارڈنل کی سادگی کی بڑی تعریف کی۔ انہوں نے کہا "پھر تو میں اس رشی سے ضرور ملوں گا"، میں نے کہا "وہ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کی رسائی ان تک کیسے ہو گی"

"کیوں اس میں کیا مشکل ہے؟ تم میری طرف سے انہیں خط لکھو۔ ان کو یہ بتاؤ کہ میں مصنف ہوں اور ان سے مل کر انہیں اس کار خیر پر مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ یہ بھی لکھ دینا کہ میں تمہیں ترجمان کے طور پر لاؤں گا کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا"

میں نے اس مضمون کا خط لکھا۔ دو تین دن کے بعد اس کے جواب میں کارڈنل صاحب کا کارڈ آیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فلاں وقت ہم دونوں سے ملیں گے۔ میں نے وہاں جانے کے لئے دستور کے مطابق ملاقات کا سوٹ پہنا۔ نرائن ہیم چندر کے وہی ٹھاٹ تھے، وہی کوٹ، وہی پتلون۔ میں نے چاہا کہ اس لباس کی ہنسی اڑاؤں۔ مگر انہوں نے الٹا مجھی کو بنا ڈالا۔

"تم جیسے مہذب لوگ سب بزدل ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی کسی شخص کے لباس کو نہیں دیکھتے اس کے دل کو دیکھتے ہیں"

ہم کارڈنل کے دولت خانے پر پہنچے۔ ابھی ہم جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک دبلے پتلے لمبے سے پیر مرد برآمد ہوئے اور انہوں نے ہم سے مصافحہ کیا۔ نرائن ہیم چندر نے سلسلۂ گفتگو یوں شروع کیا :۔

"میں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے آپ کی بہت تعریف سنی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ یہاں آکر اس نیک کام کا شکریہ ادا کروں جو آپ نے ہڑتالیوں کے لئے کیا ہے۔ میری عادت ہے کہ دنیا میں جتنے رشی ہیں سب کی خدمت میں جایا کرتا ہوں۔ اسی لئے میں نے آپ کو بھی زحمت دی"

ظاہر ہے کہ یہ ان الفاظ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے گجراتی میں کہے تھے۔

"مجھے آپ کے آنے سے خوشی ہوئی، خدا کرے آپ کو لنڈن کا قیام راس آئے اور یہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملے۔ خدا آپ پر برکت نازل کرے"

یہ الفاظ کہہ کر کارڈنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہمیں رخصت کر دیا۔

ایک بار نرائن ہیم چندر قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے میرے یہاں چلے آئے بیچاری مالکۂ مکان نے دروازہ کھولا تو وہ ڈر گئی، دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ (اس کے یہاں میں نیا نیا آیا تھا اس لئے یہ نرائن ہیم چندر کو نہیں جانتی تھی) اور کہنے لگی "ایک پاگل سا آدمی تم سے ملنے آیا ہے" میں دروازے پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نرائن ہیم چندر کھڑے ہیں۔ مجھے سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ مگر اُن کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ رہتی تھی۔

"مگر یہ تو کہئے آپ کو سڑک پر لڑکوں نے نہیں چھیڑا۔"

''

"ابھی وہ میرے پیچھے دوڑے مگر میں نے کچھ پروا نہیں کی تو وہ بھی چپ ہو رہے"

نرائن ہیم چندر چند مہینے لنڈن میں قیام کرنے کے بعد پیرس گئے۔ انہوں نے فرانسیسی پڑھنا، فرانسیسی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ میں اتنی فرانسیسی جانتا تھا کہ انکے ترجمے پر نظر ثانی کر سکوں۔ اس لئے وہ ترجمہ کر کے مجھے دکھایا کرتے تھے۔ یہ ترجمہ کیا خلاصہ ہوتا تھا۔

آخر انہوں نے امریکہ جانے کا قصد بھی پورا کیا۔ بڑی مشکل سے انہیں ڈیک کا ٹکٹ ملا۔ وہاں بھی وہ ایک بار قمیص اور دھوتی پہن کر نکلے۔ ان پر "غیر مہذبانہ لباس پہننے" کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ بری کر دئے گئے تھے۔

تئیسواں باب

عظیم الشان نمائش

۱۸۹۰ء میں پیرس میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ میں نے اس کی دھوم دھام کا حال پڑھا تھا اور مجھے پیرس دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اس وقت پیرس ہو آؤں تو ایک پنتھ دو کاج کا مضمون ہوگا۔ نمائش کی ایک خاص کشش ایفل مینار تھا جو خالص لوہے کا اور ایک ہزار فٹ بلند تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ چیزیں بھی تھیں لیکن یہ مینار سب سے بڑھ کر تھا کیونکہ اس وقت تک لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا اونچا مینار قائم نہیں رہ سکتا۔

میں نے پیرس کے نباتاتی ریستوران کا نام سنا تھا۔ میں نے وہاں ایک کمرہ لے لیا اور سات دن ٹھہرا۔ میں نے پیرس کے سفر اور وہاں کی سیر دونوں میں بہت کم خرچ میں کام چلایا۔ میں شہر کا ایک نقشہ اور نمائش کی گائڈ[1] لے کر پیدل پھرا کرتا تھا۔ انکے ذریعے سے انسان تمام بڑی سڑکوں پر اور خاص دلچسپ جگہوں پر جاسکتا تھا۔

مجھے نمائش کے متعلق سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ بڑی عظیم الشان تھی اور وہاں مختلف قسم کی دلچسپ چیزیں تھیں۔ ایفل ٹاور مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں دو تین بار اس پر چڑھا تھا۔ پہلی منزل پر ایک ریستوران تھا اور صرف یہ کہنے کے لئے میں نے اتنی بلندی پر کھانا کھایا ہے۔ میں نے سات شلنگ دوپہر کے کھانے

---

(۱) وہ کتاب جس میں کسی تاریخی عمارت یا کسی شہر کے متعلق تفصیلات لکھی ہوتی ہیں۔

پر ضائع کئے۔

پیرس کے پرانے گرجے مجھے اتک یاد ہیں۔ انکی رفعت اور شوکت اور انکا سکون جس نے دیکھا ہے وہ بھول نہیں سکتا۔ نوتر دام کی حیرت انگیز عمارت اور سنگتراشی کے خوبصورت نمونے جن سے اُس کی اندرونی آرائش کی گئی ہے ان چیزوں کی تصویر دل سے نہیں مٹ سکتی۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے کروڑوں خرچ کرکے یہ خوبصورت گرجے بنوائے ہیں انکے دل میں یقیناً خدا کی محبت ہوگی۔

میں نے پیرس کی تراش خراش اور وہاں کے لہو ولعب کے بہت سے قصے پڑھے تھے۔ یہ چیزیں ہر سڑک پر نظر آتی تھیں لیکن گرجے ان مناظر سے الگ تھلگ دوسری ہی شان سے کھڑے تھے۔ جہاں انسان ان میں سے کسی گرجے میں داخل ہوا وہ بھول جاتا تھا کہ باہر اتنا شور وشغب ہے اس کا انداز بدل جاتا تھا اور جب وہ کسی شخص کے پاس سے گذرتا تھا جو کنواری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہو تو اس کی نقل وحرکت سنجیدگی اور عقیدت سے معمور ہو جاتی تھی۔ مجھے جو احساس اس وقت تھا وہ اب اور گہرا ہوتا جاتا ہے کہ یہ تعظیم اور عبادت محض ضعیف الاعتقادی نہیں تھی اور یہ لوگ جو کنواری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے محض سنگ مرمر کی پرستش نہیں کر رہے تھے۔ انکے دل میں سچی عقیدت کا جوش تھا اور وہ پتھر کو نہیں بلکہ ذات الٰہی کو پوجتے تھے جن کا جلوہ انہیں اس میں نظر آتا تھا۔ مجھے یہ خیال آتا تھا کہ اس پرستش سے وہ خدا کے عظمت وجلال کو گھٹا نہیں رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔

میں چند الفاظ ایفل مینار کے متعلق بھی کہوں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب اس سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ مگر اس زمانے میں اس کی تعریف بھی بہت کیجاتی

تھی اور مذمت بھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی مذمت کرنے والوں میں ٹالسٹائے پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایفل مینار انسان کی دانشمندی کی نہیں بلکہ اس کی حماقت کی یادگار ہے وہ تمباکو کو سب سے بڑا نشہ سمجھتا تھا کیونکہ تمباکو پینے والوں سے اس کے نزدیک ایسے جرم سرزد ہوتے ہیں جن کے ارتکاب کی شرابیوں کو کبھی جرأت نہیں ہوتی۔ شراب تو انسان کو بالکل دیوانہ کر دیتی ہے مگر تمباکو سے اس کا تخیل دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے وہ خیالی پلاؤ پکانے اور یا در ہوا عمارتیں بنانے لگتا ہے۔ ایفل مینار اس کے خیال میں ایسا ہی تخلیقی کارنامہ ہے جو انسان تمباکو کے نشے میں کر دکھاتا ہے۔ اس مینار میں آرٹ کی کوئی خوبی نہیں۔ اس سے نمائش کی خوبصورتی میں کوئی مدد نہیں ملی۔ لوگ اسے جوق جوق دیکھنے کو آتے تھے اور اس پر چڑھتے تھے کیونکہ وہ ایک نئی چیز تھی اور اونچائی میں بے نظیر۔ یہ نمائش کا کھلونا تھا جب تک ہم میں بچپن ہے ہم کھلونوں کو دیکھ کر پھسل جاتے ہیں۔ اور یہ مینار اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم سب بچے ہیں اور دکھاوے کی چیزوں پر جان دیتے ہیں۔ یہی ایفل مینار کا مقصد کہا جا سکتا ہے۔

چوبیسواں باب

بیرسٹر تو ہو گئے۔ مگر اب؟

میں نے ابتک اُس چیز کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس کے لئے میں انگلستان گیا تھا
یعنی بیرسٹری کا امتحان۔ اب ذرا اس کا بھی مختصر سا حال بیان کر دوں۔

باضابطہ بیرسٹر بننے کے لئے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں: - بارہ ٹرم
یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی۔ حاضری سے مراد یہ تھی کہ
ٹرم کی چوبیس ڈنر کی دعوتوں میں سے کم سے کم چھ میں شرکت کیجائے۔ شرکت کے
لئے کھانا کھانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ مقررہ وقت پر پہنچ جانا اور ڈنر کے آخر تک موجود
رہنا کافی تھا۔ عام طور پر لوگ بہت خوشی سے یہاں کے ڈنر اور نفیس شرابوں سے
لطف اٹھاتے تھے۔ ایک ڈنر کی قیمت ڈھائی شلنگ سے تین شلنگ تک یعنی دو روپئے
سے تین روپئے تک ہوتی تھی۔ یہ کم سمجھی جاتی تھی کیونکہ ہوٹلوں میں اتنے دام فقط
شراب ہی کے دینا پڑتے تھے۔ ہمارے ہندوستان میں جو لوگ "مہذب" نہیں ہیں
انہیں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پینے کی چیز کے دام کھانے سے زیادہ ہوں۔
مجھے جب یہ پہلی بار معلوم ہوا تو سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ میں سوچتا تھا کہ لوگ
شراب پر اتنا روپیہ ضائع کر دیتے ہیں اور انکا دل نہیں دُکھتا۔ آگے چل کر میں اس
کو سمجھ گیا۔ میں اکثر ان دعوتوں میں کچھ نہیں کھاتا تھا کیونکہ میرے کھانے کی چیزیں
صرف روٹی، آلو اور گوبھی تھیں۔ ابتدا میں یہ چیزیں نہیں کھاتا تھا کیونکہ یہ مجھے پسند
نہیں تھیں اور آگے چل کر جب یہ پسند آنے لگیں تو اس وقت تک مجھ میں اتنی

جرأت بھی پیدا ہوگئی تھی کہ اور کھانوں کی فرمائش کرسکوں۔

منتظموں کو طالب علموں سے اچھا کھانا ملتا تھا۔ میں نے اور ایک پارسی طالب علم نے جو میری طرح نباتاتی تھا یہ درخواست دی کہ نباتاتی مشرب کی رعایت سے ہمیں وہ نباتاتی کھانے ملیں جو منتظموں کو دئے جاتے ہیں۔ یہ درخواست منظور ہوگئی اور ہمیں منتظموں کی میز سے پھل اور ترکاریاں ملنے لگیں۔

چار چار آدمیوں میں شراب کی دو دو بوتلیں ملتی تھیں اور چونکہ میں انہیں چھوتا تک نہ تھا اس لئے مجھ سے لوگ ہمیشہ اصرار کرتے تھے کہ انکے حلقے میں شریک ہو جاؤں تاکہ دو بوتلیں تین آدمیوں کے حصے میں آئیں۔ ہر ٹرم میں ایک "بڑی رات" منائی جاتی تھی اور اس موقع پر علاوہ پورٹ اور شیری کی مقررہ بوتلوں کے شامپین وغیرہ بھی ملتی تھی۔ مجھ سے اس رات آنے کے لئے خاص اصرار ہوتا تھا اور سب لوگ مجھے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

میری سمجھ میں نہ اس وقت آیا تھا اور نہ اب تک آیا ہے کہ یہ ڈنر کھا کر طالب علموں میں بیرسٹری کی قابلیت کیونکر پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک زمانے میں ان دعوتوں میں بہت کم طالب علم آیا کرتے تھے اس لئے انہیں منتظموں سے گفتگو کا موقع ملتا تھا اور تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ ان صحبتوں سے انہیں دنیا کا تجربہ حاصل ہوتا تھا ان کے مذاق میں ستھراپن اور نفاست پیدا ہوتی تھی اور ان کی قوت گویائی بڑھ جاتی تھی۔ لیکن میرے زمانے میں یہ باتیں ناممکن تھیں کیونکہ منتظموں کی میز حفظ مراتب کے خیال سے طالب علموں سے دور بچھتی تھی۔ یہ رسم رفتہ رفتہ بے معنی ہوگئی ہے لیکن قدامت پسند انگلستان نے اسے بدستور قائم رکھا ہے۔

نصاب تعلیم بہت سہل تھا اور بیرسٹروں کو لوگ مذاق میں "ڈنر بیرسٹر" کہتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ امتحانوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ میرے زمانے میں دو امتحان

ہوتے تھے ایک رومی قانون میں اور ایک عام قانون میں۔ ان کے لئے باقاعدہ کتابیں مقرر تھیں جن میں لوگ کئی بار کرکے امتحان دے سکتے تھے۔ مگر شائد ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگوں نے محض خلاصہ اور شرح پڑھ کر رومی قانون کا امتحان دو ہفتے میں اور عام قانون کا دو تین مہینے میں پاس کرلیا۔ سوالات کے پرچے سہل ہوتے تھے اور ممتحن دل کھول کر نمبر دیتے تھے۔ رومی قانون کے امتحان میں پچانوے سے ننانوے فیصدی تک اور آخری امتحان میں ستر فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ امیدوار پاس کئے جاتے تھے۔ اس لئے فیل ہونے کا خوف بہت کم تھا اور امتحان سال میں ایک بار نہیں بلکہ چار بار ہوتا تھا۔ ان سہل امتحانوں میں کسی کو دشواری محسوس نہ ہوتی تھی۔

لیکن میں نے اپنے لئے دشواری پیدا کرہی لی۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ساری درسی کتابیں پڑھوں۔ میرے خیال میں کتابوں کو نہ پڑھنا دغا بازی تھی۔ میں نے ان کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا۔ میں نے یہ طے کیا کہ رومی قانون لاطینی کتابوں سے پڑھوں گا۔ جتنی لاطینی میں نے لندن کے میٹرکولیشن امتحان کے لئے پڑھی تھی وہ بہت کام آئی۔ اور اس مطالعے سے آگے چل کر جنوبی افریقہ میں بڑا فائدہ ہوا کیونکہ وہاں رومی ولندیزی قانون رائج تھا۔ جسٹینین کی کتابیں پڑھنے سے مجھے جنوبی افریقہ کا قانون سمجھنے میں بہت مدد ملی۔

انگلستان کے عام قانون کو پڑھنے میں مجھے نو مہینے تک اچھی خاصی محنت کرنا پڑی۔ کیونکہ بروم کی "قانون عام" کو (یہ ضخیم کتاب ہے مگر دلچسپ) پڑھنے میں بہت دن لگ گئے۔ اسنیل کی "EQUITY" دلچسپ تھی اس کا سمجھنا ذرا مشکل تھا۔ وائٹ اور ٹیوڈر کی کتاب "معرکے کے مقدمے" جس میں سے چند مقدمے نصاب میں تھے دلچسپ اور مفید تھی۔ میں نے ولیم کی "Real Property" اور گوڈایو کی "اصول

عدل" کو بھی شوق سے پڑھا۔ وتیم کی کتاب ناول معلوم ہوتی تھی۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے صرف ایک کتاب مین کی "دھرم شاستر" اس قدر شوق سے پڑھی ہے۔ مگر یہاں ہندوستان کی قانونی کتابوں کے ذکر کا موقع نہیں۔

میں نے اپنے امتحانات پاس کر لئے۔ ۱۰ رجون ۱۸۹۱ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی، ۱۱ رجون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور ۱۲ رجون کو میں جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان روانہ ہو گیا۔

لیکن باوجود تعلیم ختم کرنے کے مجھ پر خوف اور مایوسی طاری تھی۔ میں اپنے آپ میں وکالت کرنے کی قابلیت نہیں پاتا تھا۔

اس یاس اور بے بسی کو بیان کرنے کے لئے ایک علحدہ باب چاہئے۔

پچیسواں باب

میری بےبسی اور مایوسی

بیرسٹر ہو جانا سہل تھا مگر بیرسٹری کرنا دشوار۔ میں نے قانون پڑھا تھا لیکن قانون سے کام لینا نہیں سیکھا تھا میں نے "قانونی مقولے" شوق سے پڑھے تھے مگر انہیں اپنے پیشے میں برتنا نہیں جانتا تھا۔ ان میں سے ایک مقولہ تھا "اپنی ملک کو اس طرح استعمال کرو کہ اس سے دوسروں کی املاک کو نقصان نہ پہنچے" مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے انسان اپنے موکل کے حق میں کیونکر استعمال کرے۔ اس مقولے کے متعلق جتنے معرکے کے مقدمے تھے میں نے سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں اسے خود اپنے مقدموں میں کام میں لا سکوں گا۔

علاوہ اس کے میں نے ہندوستان کا قانون بالکل نہیں پڑھا تھا۔ دھرم شاستر اور قانون شرح محمدی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھے عرضی دعوے تک لکھنا نہ آتا تھا اور حیران تھا کہ کیسے کام چلے گا۔ میں نے سنا تھا کہ سر فیروز شاہ مہتا عدالت میں شیر کی طرح گرجتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے انگلستان میں یہ کیسے سیکھ لیا۔ انکی سی قانونی سوجھ بوجھ حاصل کرنا تو درکنار مجھے اس میں بھی بہت شبہ تھا کہ میں اس پیشے سے پیٹ بھرنے کے لائق کما سکوں گا۔

جب میں قانون پڑھتا تھا تو یہ شبہے اور وسوسے میرے دل میں رہتے تھے میں نے اپنی مشکلیں اپنے چند دوستوں سے بیان کیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ دادا بھائی نوروجی سے مشورہ کرو۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انگلستان جاتے

وقت میرے پاس دادا بھائی نوروجی کے نام تعارف کا خط تھا۔ میں نے اس سے بہت دیر میں کام لیا۔ میں سوچتا تھا کہ مجھے اتنے بڑے آدمی کو زحمت دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب کبھی انکی کسی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو میں وہاں جاتا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں بیٹھ کر سنتا تھا اور دیدار و گفتار کا لطف اٹھا کر چلا آتا تھا۔ طالبعلموں سے گہرا تعلق پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ میں اس کے جلسوں میں جایا کرتا تھا، اور دادا بھائی کو طالبعلموں سے جو محبت تھی اور ان لوگوں کے دل میں انکا جو احترام تھا اسے دیکھکر خوش ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اتنی ہمت ہوئی کہ میں نے تعارف کا خط پیش کر دیا انہوں نے کہا "تمہارا جب جی چاہے آؤ اور مجھ سے مشورہ لو"۔ لیکن میں نے اس دعوت سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں سمجھتا تھا کہ بغیر اشد ضرورت کے انہیں زحمت دینا مناسب نہیں۔ اس لئے جب میرے دوست نے کہا میں دادا بھائی نوروجی سے مل کر اپنی مشکلیں انکے سامنے پیش کروں تو مجھے اسکی جرأت نہ ہوئی۔ انہیں دوست یا کسی اور صاحب کی رائے ہوئی کہ میں فریڈرک پنکٹ صاحب سے ملوں۔ یہ قدامت پسند تھے مگر انہیں ہندوستانی طالب علموں سے خالص اور بے غرض محبت تھی۔ بہت سے طالب علم ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ میں نے بھی ملاقات کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ میں اس ملاقات کو کبھی نہ بھولوں گا۔ انہوں نے دوستانہ میرا خیر مقدم کیا اور میری مایوسی کو اپنے قہقہوں سے دور کر دیا۔ انہوں نے کہا "تم سمجھتے ہو کہ ہر شخص کے لئے فیروز شاہ مہتا ہونا ضروری ہے؟ فیروز شاہ اور بدرالدین جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ یقین مانو کہ معمولی وکیل ہونے کے لئے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں۔ وہ محض ایمانداری اور محنت کی بدولت گذر کر سکتا ہے۔ سب مقدمے پیچیدہ نہیں ہوتے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمہارا عام مطالعہ کہاں تک ہے؟"

جب میں نے ان سے اپنے محدود ذخیرۂ معلومات کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا کہ انہیں کسی قدر مایوسی ہوئی۔ مگر یہ حالت محض ایک لمحے تک رہی چشم زدن میں انکا چہرہ خوشگوار تبسم سے دمکنے لگا اور وہ کہنے لگے "میں تمہاری مشکل سمجھ گیا۔ تمہارا عام مطالعہ بہت کم ہے۔ تمہیں دنیا کا تجربہ مطلق نہیں حالانکہ یہ ایک وکیل کے لئے ناگزیر ہے۔ تم نے ہندوستان کی تاریخ تک نہیں پڑھی۔ وکیل کو انسانی فطرت سے واقف ہونا چاہئے۔ اس میں یہ قابلیت ہونا چاہئے کہ انسان کی سیرت کو اسکی صورت سے پہچان لے۔ اور ہندوستان کی تاریخ جاننا تو ہر ہندوستانی کے لئے ضروری ہے۔ اسے قانونی پیشے سے کوئی تعلق نہیں مگر تمہیں اتنی معلومات ضرور ہونا چاہئے۔ تمہارے کہنے سے معلوم ہوا کہ تم نے کے اور میلیسن کی تاریخ غدر ۱۸۵۷ء بھی نہیں پڑھی۔ جاؤ اسے فوراً شروع کردو اور دو اور کتابیں پڑھو جن سے انسانی فطرت کو سمجھنے میں مدد ملے۔" آخر میں انکا اشارہ لافاٹر اور شیمیل پینگ کی کتابوں کی طرف تھا جو علم قیافہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔

میں ان محترم دوست کا بہت شکر گزار ہوا۔ انکے سامنے میرا سارا خوف جاتا رہا لیکن جیسے ہی میں ان سے رخصت ہوا پھر فکروں میں گھر گیا۔ گھر جاتے ہوئے مجھے ان دونوں کتابوں کا خیال آیا اور میں اس ادھیڑبن میں مبتلا ہو گیا کہ انسان کی صورت سے اس کی سیرت کا پتہ کیونکر چلایا جاتا ہے۔ دوسرے دن میں نے لافاٹر کی کتاب خریدی۔ شیمیل پینگ والی دوکاندار کے یہاں نہیں تھی۔ میں نے لافاٹر کی کتاب پڑھی۔ جو مجھے اسنیل کی "EQUITY" سے بھی زیادہ مشکل معلوم ہوئی میری طبیعت اس میں بالکل نہیں لگی۔ میں نے اس میں شیکسپیر کے قیافے کا بہت غور سے مطالعہ کیا مگر مجھے یہ ڈھب نہ آیا کہ ان لوگوں میں سے جو لندن کی سڑکوں پر پھرتے تھے، شیکسپیروں کو چھانٹ لوں۔

لافاٹر کی کتاب سے میرے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ پنکٹ صاحب کی نصیحت سے مجھے براہ راست بہت کم فائدہ ہوا مگر ان کی محبت بہت کام آئی۔ انکا مسکراتا ہوا بے بناوٹ چہرہ میری آنکھوں میں پھرتا رہا اور مجھے انکی اس رائے پر بھروسا ہو گیا کہ وکیل بننے کے لئے اس سوجھ بوجھ قابلیت اور حافظے کی ضرورت نہیں جو فیروز شاہ میں ہے۔ بلکہ ایمانداری اور محنت کافی ہے۔ اور چونکہ مجھ میں ان دونوں چیزوں کی کمی نہ تھی اس لئے مجھے کسی قدر اطمینان ہو گیا۔

میں کے اور میلیسن کی تاریخ انگلستان میں نہیں پڑھ سکا مگر میں نے جنوبی افریقہ میں پڑھی کیونکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ جب موقع ملا اس کتاب کا مطالعہ کروں گا۔

غرض دل میں مایوسی کے ساتھ ساتھ خفیف سی امید لئے ہوئے میں "آسام" نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر اترا۔ بندرگاہ میں سمندر میں تلاطم تھا اس لئے مجھے ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے پر جانا پڑا۔

تلاش حق

حصہ دوم

پہلا باب

رائے چند بھائی

میں پچھلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ بمبئی کی بندرگاہ میں سمندر میں تلاطم تھا۔ جون اور جولائی میں بحرِ ہند کا طوفانی ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ عدن سے یہاں تک کم و بیش ہوا کا زور رہا۔ قریب قریب ہر مسافر متلی اور دوران سر میں مبتلا تھا۔ البتہ میں بالکل چاق تھا اور ڈیک پر کھڑا طوفانی سمندر کا تماشا دیکھتا تھا اور موجوں کے تھپیڑوں کا لطف اٹھاتا تھا۔ ناشتے کے وقت میرے علاوہ دو ہی ایک آدمی اور ہوتے تھے۔ جئی کا دلیہ کھاتے وقت رکابیوں کو احتیاط سے گود میں رکھ لیتے تھے کہ کہیں سارا دلیہ انکے جسم پر نہ آن پڑے۔

یہ بیرونی طوفان میرے لئے اندرونی طوفان کی علامت تھا۔ مگر جس طرح پہلے طوفان سے میرے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی اسی طرح دوسرے طوفان سے بھی میں نہیں گھبرایا۔ ایک طرف برادری سے نبٹنا تھا دوسری طرف وکالت شروع کرنے کی دقتیں تھیں جن کا میں ذکر کر چکا ہوں، تیسری طرف مصلح کی حیثیت سے میں دماغ سوزی کر رہا تھا کہ فلاں فلاں اصلاحوں کے شروع کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ لیکن ابھی میرے لئے اور مصیبتیں تھیں جن کی مجھے خبر تک نہ تھی۔

میرے بڑے بھائی مجھ سے ملنے کے لئے بندرگاہ پر آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر مہتا اور انکے بڑے بھائی سے پہلے ہی مل چکے تھے اور چونکہ ڈاکٹر مہتا نے مجھے اپنے یہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا اس لئے ہم سیدھے ان کے یہاں گئے۔ اس طرح جو ملاقات

انگلستان میں شروع ہوئی تھی وہ ہندوستان میں جاری رہی اور رفتہ رفتہ دونوں خاندانوں میں مستقل دوستی ہو گئی۔

میں اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے گلے سے لگانے کے لئے دنیا میں موجود نہیں۔ اب مجھے یہ اندوہناک خبر ملی اور میں نے دستور کے مطابق اشنان وغیرہ کیا۔ انکا انتقال میرے قیام انگلستان ہی کے زمانے میں ہو چکا تھا مگر میرے بھائی نے مجھ سے یہ خبر پوشیدہ رکھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ پردیس میں مجھے یہ شدید صدمہ نہ پہنچے۔ پھر بھی جب میں نے یہ خبر سنی تو میرے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ مگر اس کا ذکر تفصیل سے کرنا مناسب نہیں۔ مجھے اتنا رنج ہوا کہ والد کے مرنے کا بھی نہ ہوا تھا۔ بہت سی امیدیں جنہیں میں نے دل میں جگہ دی تھی خاک میں مل گئیں۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اظہار غم میں بے اعتدالی نہیں کی۔ میں آنسو تک پی جاتا تھا اور زندگی کے دھندوں میں مصروف رہتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر مہتا نے مجھے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ ان میں سے ایک ان کے بھائی ریوا شنکر جگجیون تھے جن سے مجھ سے عمر بھر کے لئے دوستی ہو گئی۔ لیکن خاص طور پر قابل ذکر ملاقات رائے چند یا راجا چندر شاعر کی ہے۔ یہ ڈاکٹر مہتا کے بڑے بھائی کے داماد تھے اور اس جوہری کی دوکان میں حصہ دار تھے جو ریوا شنکر جگجیون کے نام سے تھی۔ اس زمانے میں انکی عمر پچیس سے بھی کم تھی لیکن پہلی ہی ملاقات میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ذی علم اور نیک سیرت ہیں۔ وہ "شتو دھنی"[1] بھی سمجھے جاتے تھے اور ڈاکٹر مہتا نے مجھ سے اصرار کیا کہ انکے حافظے کے کارنامے ضرور دیکھوں۔ مجھے یورپ کی زبانوں کے جتنے الفاظ آتے تھے سب میں نے کہہ دالے۔

---

(۱) وہ شخص جو ایک وقت میں سو باتیں یاد رکھتا ہے یا سو کاموں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

اور پھر ان شاعر سے فرمائش کی کہ انہیں دُہرائیں۔ انھوں نے بالکل اسی ترتیب سے جیسے میری زبان سے نکلے تھے دُہرا دئے۔ مجھے ان کی اس قوت پر رشک آیا لیکن میرے دل پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ البتہ ایک چیز نے میرے دل کو موہ لیا اور اس کی مجھے بعد میں خبر ہوئی۔ یہ انکا وسیع مذہبی علم ان کا بیداغ کردار اور انکا تکمیل نفس کا جوش تھا۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہی آخری چیز انکی زندگی کا مقصد ہے۔ مکتانند کے یہ شعر ان کے ورد زبان رہتے تھے اور انکی لوح دل پر نقش تھے۔

میں اپنے آپ کو سعید صرف اس وقت سمجھوں گا
جب مجھے روزمرہ کے ہر کام میں اس کا جلوہ نظر آئے۔
سچ تو یہ ہے کہ اسی کی ذات پاک
مکتانند کا رشتہ حیات ہے۔

رائے چند بھائی کا تجارتی کاروبار لاکھوں کا تھا وہ ہیرے موتی کے بڑے مبصر تھے۔ کاروبار کے مشکل سے مشکل مسئلوں کو وہ چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ لیکن یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کا مرکز اور مدار نہ تھیں۔ اس کا مرکز عرفان الٰہی تھا۔ ان کی کاروباری میز پر علاوہ اور چیزوں کے مذہبی کتابیں اور اُن کا روزنامچہ بھی رہتا تھا۔ جیسے ہی انہیں کام سے فرصت ہوتی تھی وہ کوئی مذہبی کتاب یا اپنا روزنامچہ کھولکر بیٹھ جاتے تھے انکی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں اکثر اسی روزنامچے سے نقل کی گئیں ہیں۔ جو شخص اہم تجارتی معاملوں کی گفتگو ختم کرتے ہی روح کے پوشیدہ اسرار پر خامہ فرسائی کرنے لگے ظاہر ہے کہ وہ کاروباری آدمی نہیں بلکہ سچا طالب حق ہے اور میں نے انہیں ایک دو بار نہیں بلکہ اکثر عین کاروبار کے درمیان معرفت الٰہی کے خیالوں میں ڈوبا ہوا دیکھا ہے۔ میرے سامنے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انکے اطمینان قلب میں خلل آیا ہو۔ مجھ میں اور ان میں کوئی کاروباری یا خود غرضی کے تعلقات نہیں تھے مگر آپس میں بڑا میل جول تھا۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی تھی وہ سنجیدہ مذہبی مسائل پر

گفتگو چھیڑ دیتے تھے۔ اگرچہ میں اس وقت تک گمراہی میں تھا اور مذہبی بحثوں سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا پھر بھی مجھے ان کی گفتگو میں بیحد لطف آتا تھا۔ جب سے ابتک میں بہت سے مذہبی پیشواؤں اور معلموں سے ملا ہوں۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر مذہب کے سردار کی زیارت کروں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا رائے چند بھائی سے۔ انکے الفاظ میرے دل میں اُتر جاتے تھے۔ ان کی دماغی قابلیت کی میں اتنی ہی عزت کرتا تھا جتنی ان کے اخلاقی جوش کی اور مجھے صمیم قلب سے یقین تھا کہ وہ مجھے کبھی جان بوجھ کر گمراہ نہیں کرینگے اور مجھے اپنے دل کے گہرے بھید بتا دیں گے۔ اس لئے جب میں روحانی کشمکش میں مبتلا ہوتا تھا تو انہیں کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔

مگر باوجود اسکے کہ میں انکا اس قدر احترام کرتا تھا۔ میں انہیں اپنے دل میں گرو کی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ جگہ ابتک خالی ہے اور میری تلاش جاری ہے۔

میں ہندوؤں کے گرو کے نظریے کا قائل ہوں اور اسے تکمیل نفس کیلئے بہت اہم سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ اصول بڑی حد تک صحیح ہے کہ بے گرو کے سچا علم حاصل نہیں ہوتا۔ دنیاوی چیزوں میں تو ناقص استاد پر بھی قناعت کی جا سکتی ہے مگر دینی امور میں بے مرشد کامل کے تسکین نہیں ہوتی۔ گرو کے تخت پر صرف وہی شخص بٹھایا جا سکتا ہے جو پورا گیانی ہو۔ اسلئے انسان کو خود اپنی تکمیل نفس کی انتھک کوشش کرنا چاہئے کیونکہ اسکو گرو اُس کے استحقاق کا ملتا ہے۔ تکمیل نفس کی انتہائی کوشش ہر شخص کا حق ہے۔ یہ آپ ہی اپنا اجر ہے۔ باقی جو کچھ ہے خدا کے ہاتھ میں ہے۔

گو میں رائچند بھائی کو اپنے دل میں گرو کی جگہ نہ دے سکا مگر ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ متعدد موقعوں پر وہ میرے رہنما اور مددگار رہے۔ جدید زمانے کے تین شخصوں نے مجھے متاثر کیا اور میرے دل کو موہ لیا: رائچند بھائی نے اپنے فیض صحبت سے۔ ٹالسٹائے نے اپنی اس کتاب سے "سلطنت الٰہی تمہارے دل کے اندر ہے" اور رسکن نے اپنے "آخری انجام" سے۔ مگر ان چیزوں کی تفصیل اپنی اپنی جگہ بیان کی جائے گی۔

دوسرا باب
میں نے زندگی کیونکر شروع کی

میرے بڑے بھائی نے مجھ سے بہت کچھ امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ ان کو مال و دولت اور عزت و شہرت کی بڑی آرزو تھی۔ وہ بڑے فراخدل تھے۔ حد سے زیادہ فیاض۔ ان صفتوں کے علاوہ انکی طبیعت میں سادگی بہت تھی۔ اس لئے ان سے بہت سے لوگوں سے دوستی تھی۔ انہیں امید تھی کہ ان دوستوں کے ذریعے سے مجھے مقدمے دلوائیں گے۔ انہوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری وکالت خوب چلے گی اور اس توقع پر گھر کا خرچ بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے میری وکالت کے لئے زمین ہموار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

میری برادری کے لوگوں میں میرے پردیس کے سفر کے سبب سے اب تک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس مسئلے نے برادری کو دو فریقوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ایک نے تو مجھے فوراً پھر سے ذات میں شامل کر لیا مگر دوسرا میرے اخراج پر اڑا ہوا تھا۔ پہلے فریق کو خوش کرنے کے لئے میرے بھائی مجھے راجکوٹ لیجانے سے پہلے پاک دریا میں اشنان کرانے ناسک لے گئے اور راجکوٹ پہنچ کر انہوں نے برادری کو دعوت دی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں تھیں لیکن میرے بھائی کو مجھ سے بیحد محبت تھی اور میں دل و جان سے انکی اطاعت کرتا تھا اس لئے جو وہ کہتے تھے میں چپ چاپ کرتا تھا۔ اور انکی مرضی کو قانون سمجھتا تھا۔

جس حلقے نے مجھے داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا میں نے اس میں بعلنے

کی کبھی کوشش نہیں کی اور اس کے کسی سرگروہ کی طرف سے میرے دل میں ذرا بھی شکایت نہ تھی ۔ ان میں سے بعض مجھے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن میں بہت خیال رکھتا تھا کہ انکے جذبات کو ٹھیس نہ لگے ۔ میں برادری کے قواعد اخراج کی پوری پابندی کرتا تھا ۔ ان کی رو سے میرے عزیزوں میں سے کوئی یہاں تک کہ میرے ساس سسر اور سالے سالیاں بھی مجھے اپنے یہاں نہیں رکھ سکتے تھے اور میں انکے یہاں پانی تک نہیں پی سکتا تھا ۔ وہ اس کے لئے تیار تھے کہ پوشیدہ طور پر اس ممانعت کی خلاف ورزی کریں لیکن یہ بات میری طبیعت کے خلاف تھی کہ جو کام کھلم کھلا نہ کرسکوں اسے چھپا کر کروں ۔

میری اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ برادری والوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا بلکہ جو لوگ مجھے ابتک برادری سے خارج سمجھتے ہیں ان میں سے اکثر نے میرے ساتھ ہمیشہ لطف و کرم کا برتاؤ کیا ہے یہانتک کہ انہوں نے میرے کام میں میری مدد کی ہے اور اس کے بدلے میں مجھ سے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ میں برادری کی کوئی خدمت کروں ۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ انکا یہ حسن سلوک میرے عدم مزاحمت کا نتیجہ ہے ۔ اگر میں برادری میں داخل ہونے کیلئے جدوجہد کرتا اس میں اور تفرق ڈالنے کی کوشش کرتا ، برادری والوں کو اشتعال دلاتا تو وہ مجھ سے بدلہ لیتے اور انگلستان سے آنے کے بعد میں اس طوفان سے محفوظ رہنے کے بجائے فتنہ و فساد کے گرداب میں مبتلا ہو جاتا اور کوئی عجب نہیں کہ مجھے ظاہرداری اور زمانہ سازی سے کام لینا پڑتا ۔

بیوی سے میرے تعلقات ابتک حسب دلخواہ نہیں تھے ۔ انگلستان کے قیام سے بھی میری بدگمانی کی عادت دور نہیں ہوئی تھی ۔ میں ذرا ذرا سی بات میں بیجا تنک اور چڑچڑے پن سے کام لیتا تھا جس کے سبب سے میری دلی خواہشیں پوری نہیں ہوتی تھیں ۔ میں نے طے کیا تھا کہ اپنی بیوی کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں لیکن میری

شہوت پرستی اس میں حائل ہوتی تھی اور میرے عیبوں کی سزا انہیں بھگتنا پڑتی تھی۔
ایک بار تو میں نے یہاں تک کیا کہ انہیں میکے بھیجدیا اور جب تک بیچاری رنج سے
ہلکان نہ ہو گئیں واپس نہیں بلایا۔ آگے چل کر میری سمجھ میں آیا کہ یہ سب باتیں محض
میری حماقت کا نتیجہ تھیں۔

میں نے بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی تجویز سوچی تھی۔ میرے بھائی کے کئی بچے
تھے اور میرا لڑکا جسے گھر چھوڑ کر میں انگلستان گیا تھا اب چار برس کا تھا۔ میری خواہش
تھی کہ ان سب کو ورزش سکھا کر مضبوط اور جفاکش بناؤں اور خود اُنکی نگرانی کیا کروں۔
اس میں میرے بھائی نے بھی مدد کی اور مجھے اپنی کوششوں میں کم و بیش کامیابی ہوئی
مجھے بچوں کی صحبت بہت پسند تھی اور ان سے ہنسنے کھیلنے کی مجھے آج تک عادت ہے۔
اس وقت سے میرا یہ خیال ہے کہ بچوں کے لئے اچھا معلم ہو سکتا ہوں۔

غذا کے "ریفارم" کی صریحی ضرورت تھی۔ چائے اور قہوے کا استعمال گھر
شروع ہو چکا تھا۔ میرے بھائی جانتے تھے کہ جب میں واپس آؤں تو مجھے تھوڑی بہت
انگریزیت کی فضا ملے۔ اس خیال سے چینی کے برتن وغیرہ جو پہلے خاص خاص موقعوں
کے لئے رکھے رہتے تھے اب روزمرہ استعمال ہونے لگے۔ رہی سہی کمی میرے
"ریفارم" نے پوری کر دی۔ میں نے جئی کا دلیہ کھانا سکھایا اور کوکو کا استعمال
اس نیت سے شروع کرایا کہ یہ چائے اور قہوے کی قائم مقام ہو جائے لیکن ہوا یہ
کہ چائے اور قہوہ بدستور باقی رہا اور یہ ایک اور اضافہ ہو گیا۔ بوٹ اور شو پہلے سے
رائج تھے میں نے انگریزی لباس شروع کرا کے فرنگیت کی تکمیل کر دی۔

اس طرح خرچ بڑھتا گیا۔ روز نئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ ہم نے ایک
سفید ہاتھی دروازے پر باندھ رکھا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے کھلائیں کہاں سے
راجکوٹ میں وکالت شروع کرنا اپنا مضحکہ کرانا تھا۔ میری قابلیت ایک

اچھے وکیل کے برابر بھی نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا۔ کون موکل ایسا بیوقوف تھا کہ میرے پاس آتا؟ اور فرض کیجئے کوئی پھنس بھی جاتا تو کیا میں اپنی جہالت پر خود پسندی اور فریب کا بھی اضافہ کر لیتا اور دنیا کا مجھ پر جتنا قرض تھا اس کا بوجھ اور بڑھا لیتا۔

دوستوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لئے بمبئی جاؤں وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں، ہندوستان کے قانون کا مطالعہ کروں اور مقدمے ملنے کے لئے ہاتھ پیر ماروں۔ میں نے انکے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔

بمبئی میں گھر بار کے کام میں میرا مددگار ایک رسوئیا[1] تھا جو میرا ہی جیسا نالائق تھا وہ ذات کا برہمن تھا۔ میں اس سے ایسا برتاؤ نہیں کرتا تھا جیسا نوکروں سے کیا جاتا ہے بلکہ عزیزوں کی طرح پیش آتا تھا۔ وہ اپنے جسم پر پانی ڈالتا تھا مگر نہاتا کبھی نہ تھا۔ اس کی دھوتی اتنی ہی میلی رہتی تھی جتنا اس کا جنیؤ اور اسے مذہبی کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ لیکن مجھے کھانا پکانے کے لئے اور کوئی آدمی ملنا دشوار تھا

میں اس سے کہا کرتا تھا "بھئی راوی شنکر تم چاہے کھانا پکانا نہ جانتے ہو مگر "سندھیا" (روزمرہ کی پوجا) تو ضرور جانتے ہوگے؟"

"سندھیا، کیسی، بابو صاحب۔ ہماری "سندھیا"، ہل ہے اور ہماری پوجا پھاوڑا ہے۔ میں تو ایسا ہی برہمن ہوں۔ آپ کے پاس اسے لئے آیا ہوں کہ آپ کی کرپا سے میری پرورش ہو جائے۔ نہیں تو پھر اپنی کھیتی تو کہیں گئی نہیں۔"

غرض مجھے راوی شنکر کا استاد بننا پڑا۔ میں پکانے کا آدھا کام خود کرتا تھا اور ساگ تیار کرنے میں انگریزی طریقے سے کام لیتا تھا۔ میں نے ایک گیس کا چولھا

---

(۱) باورچی۔

خرید لیا۔ اور راوی شنکر کے ساتھ مل کر رسوئی بنانے لگا۔ مجھے غیر ذات والوں کے ساتھ کھاتے میں کوئی تامل نہ تھا راوی شنکر کا پرہیز بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا دونوں میں خوب نبھنے لگی۔ بس ایک دقت تھی۔ راوی شنکر نے قسم کھائی تھی کہ ہمیشہ میلا رہے گا۔ اور کھانے کو بھی میلا رکھے گا۔

مگر بمبئی میں میرے لئے چار پانچ مہینے سے زیادہ رہنا ناممکن تھا کیونکہ خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور آمدنی کچھ نہ تھی۔

اس طرح میری زندگی شروع ہوئی۔ میں نے بیرسٹری کے پیشے کو بُرا پایا۔ نمائش بہت اور علم کم۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس تھا کہ میں اس کے بوجھ سے دبا جاتا تھا۔

تیسرا باب

پہلا مقدمہ

بمبئی کے قیام کے زمانے میں ایک طرف تو میں نے ہندوستانی قانون کا مطالعہ شروع کیا اور دوسری طرف غذائیات کے تجربے جس میں میرے ایک دوست ویرچند گاندھی میرے ساتھ شریک تھے۔ ادھر میرے بھائی میرے لئے مقدمے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہندوستانی قانون کے مطالعے سے میری طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ قانون ضابطہ فوجداری کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر قانون شہادت میں یہ بات نہ تھی ویرچند گاندھی سالیسٹر کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور وہ مجھے بیرسٹروں اور وکیلوں کے متعلق طرح طرح کے قصے سنایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے "سر فیروز شاہ کی قابلیت کا راز یہ ہے کہ انہیں قانون پر پورا عبور ہے۔ قانون شہادت انہیں حفظ یاد ہے اور دفعہ تیس کے متعلق سارے مقدمے نوک زبان ہیں۔ بدرالدین طیب کی بحث اس قیامت کی ہے کہ ججوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔"

ایسے ایسے نامی وکیلوں کا حال سن کر میری ہمت پست ہو جاتی تھی۔

وہ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہتے تھے "بیرسٹر کیلئے پانچ سات برس خالی بیٹھے رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اسی لئے میں نے سالیسٹر کا کام شروع کیا ہے۔ تمہاری کشتی اگر تین برس میں بھی چل نکلے تو غنیمت سمجھو۔"

خرچ ہر مہینے بڑھتا جاتا تھا۔ باہر بیرسٹر کا سائن بورڈ لگانا اور گھر میں بیٹھ کر بیرسٹری

کا کام سیکھنا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ اس لئے میں بسہولی سے مطالعہ نہیں کرسکتا تھا۔
مجھے قانون شہادت سے دلچسپی ہوگئی تھی اور مَین کی "دھرم شاستر" میں نے بڑے
شوق سے اور غور سے پڑھی تھی لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ کسی مقدمے کی پیروی کروں۔
میری بے بسی بیان سے باہر ہے۔ یہ حال تھا جیسے دلہن نئی نئی سسرال میں آتی ہے!

اس زمانے میں میرے پاس مامی بائی نام ایک عورت کا مقدمہ آیا۔ یہ ایک
خفیفہ کا معاملہ تھا۔ مجھ سے لوگوں نے کہا "تمہیں دلال کو کمیشن دینا پڑے گا" میں نے
قطعاً انکار کر دیا۔

"مگر فوجداری کا فلاں نامی وکیل جس کی تین چار ہزار ماہوار کی آمدنی ہے
وہ بھی دلالی دیتا ہے۔" "مجھے انکی ریس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لئے تین
سو روپیہ کافی ہے۔ میرے والد کی آمدنی بھی اس سے زیادہ نہ تھی۔"

"اب وہ دن گئے بمبئی میں خرچ اتنا بڑھ گیا ہے کہ کچھ ٹھکانا نہیں تمہیں کاروباری
اصول کا لحاظ کرنا چاہئے۔"

میں ثابت قدم رہا۔ مامی بائی کا مقدمہ بغیر دلالی دئے ہوئے مجھے مل گیا۔
سیدھا سادہ معاملہ تھا۔ میں نے تیس روپیہ محنتانہ لیا۔ ایک دن سے زیادہ کا کام نہ تھا۔

یہ عدالت خفیفہ میں میرا پہلا داخلہ تھا۔ میں مدعا علیہا کی طرف سے تھا اس لئے
میرا کام یہ تھا کہ مدعی کے گواہوں سے جرح کروں۔ میں کھڑا ہوا لیکن میرا دل بیٹھ گیا۔
میرے سر میں چکر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے۔ میری سمجھ میں
کوئی سوال نہیں آیا جو میں پوچھتا۔ جج یقیناً ہنسا ہوگا اور وکیلوں کو اس تماشے سے لطف آیا
ہوگا۔ مگر مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور میں نے مختار سے کہا کہ میں
پیروی نہیں کرسکتا۔ تم مجھ سے فیس واپس لو اور پٹیل کو وکیل کرلو۔ پٹیل صاحب نے
اکاون روپئے لئے اور وکالت نامہ داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے یہ مقدمہ بچوں

کا کھیل تھا۔

میں عدالت سے جلدی سے اُٹھ کر چلا آیا اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی کہ میری موکلہ جیتی یا ہاری۔ مگر مجھے بڑی شرم آئی اور میں نے یہ طے کیا کہ آئندہ کوئی مقدمہ اس وقت تک نہ لوں گا جبتک مجھ میں پیروی کرنے کی ہمت نہ پیدا ہو جائے۔ اور سچ مچ میں نے اس کے بعد بس جنوبی افریقہ ہی میں عدالت میں قدم رکھا۔ اس فیصلے میں میری کوئی تعریف نہ تھی۔ عصمت بی بی از بے چادری کا معاملہ تھا۔ بھلا کون ایسا بیوقوف تھا کہ مجھ ہارنے کے لئے مقدمہ دیتا۔

لیکن بمبئی میں مجھے ایک معاملہ اور ملا۔ یہ ایک عرضداشت لکھنے کا کام تھا۔ ایک غریب مسلمان کی زمین پوربندر میں ضبط کرلی گئی تھی۔ وہ مجھے نیک باپ کا سپوت بیٹا سمجھ کر میرے پاس آیا۔ اس کا دعوےٰ بظاہر کمزور تھا لیکن میں اس شرط پر اس کی طرف سے عرضداشت لکھنے پر راضی ہو گیا کہ چھپائی کا خرچ اس کے ذمہ رہے۔ میں نے اس کا مسودہ لکھکر دوستوں کو سنایا۔ انہوں نے پسند کیا اور اس سے مجھے تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ میں عرضداشت لکھنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور یہ واقعہ بھی تھا۔

اگر میں بغیر فیس کے عرضداشتیں لکھا کرتا تو مجھے کام خوب ملتا۔ لیکن اس سے پیٹ کا دھندا کیسے چلتا؟ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ مدرسی کروں۔ میری انگریزی اچھی تھی اور اگر مجھے کسی اسکول میں انٹرنس کے لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کا کام ملجاتا تو میں بڑی خوشی سے کرتا۔ اس طرح میرے خرچ کا کچھ حصہ تو نکل ہی آتا۔ میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا "ضرورت ہے انگریزی کے مدرس کی۔ ایک گھنٹہ روز سبق تنخواہ پچھتر روپیہ" یہ اشتہار ایک مشہور اسکول کی طرف سے تھا۔ میں ملاقات کے لئے طلب ہوا اور خوش خوش پہنچا۔ مگر جب پرنسپل کو معلوم ہوا کہ میں گریجویٹ نہیں ہوں تو انہوں نے افسوس کیساتھ انکار کردیا۔ "مگر میں نے لندن میٹرکیولیشن پاس کیا ہے اور میری اختیاری زبان لاطینی تھی۔"

"یہ سچ ہے مگر ہمیں تو کریجویٹ چاہئے"
ایسی صورت میں مجبوری تھی۔ میں مایوس ہو کر کف افسوس ملنے لگا۔ میرے بھائی کو بھی بڑی تشویش تھی۔ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اب بمبئی میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں راجکوٹ میں بسنا چاہئے۔ وہاں میرے بھائی کی وکالت تھوڑی بہت چلتی ہے اور وہ مجھے درخواستیں اور عرضداشتیں لکھنے کا کام دے سکتے ہیں۔ پھر راجکوٹ میں گھر بار موجود ہی ہے اس لئے بمبئی میں گھر لے کر رہنے کا بھاری خرچ بچ جائیگا۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ اس طرح بمبئی میں چھ مہینے قیام کرنے کے بعد میں بوریا بدھنا اٹھا کر چل دیا۔

بمبئی میں میں روز ہائیکورٹ جایا کرتا تھا لیکن میں نے وہاں کچھ بھی نہیں سیکھا۔ میں اتنی قابلیت ہی نہیں رکھتا تھا کہ وہاں جانے سے پورا فائدہ اٹھا سکوں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مقدمے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے اور میں اونگھنے لگتا تھا۔ اس معاملے میں اور لوگ بھی میرے ساتھی تھے اس لئے میری شرم کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ بلکہ کچھ دن کے بعد تو شرم کا احساس ہی نہیں رہا کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہائیکورٹ میں اونگھنا فیشن میں داخل ہے۔

اگر آج کل بھی بمبئی میں میرے جیسے بیکار بیرسٹر ہیں تو میں انہیں زندگی کا ایک عملی نکتہ بتاتا ہوں۔ اگرچہ میں گرگام میں رہتا تھا لیکن بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ گاڑی یا ٹرام پر بیٹھوں۔ میں نے ہائیکورٹ پیدل جانے کا معمول کر لیا تھا۔ مجھے وہاں جانے میں پورے پینتالیس منٹ لگتے تھے اور واپس بھی ہمیشہ پیدل ہی آتا تھا۔ دھوپ میں چلنے کی میں نے عادت ڈال لی تھی۔ عدالت پیدل آنے جانے سے خاصی رقم بچتی تھی اور پھر یہ فائدہ بھی تھا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میری طبیعت کبھی ناساز نہیں ہوئی حالانکہ میرے دوست جو بمبئی میں مقیم تھے بیمار رہا کرتے تھے۔ جب میں روپیہ کمانے لگا تب بھی میں نے پیدل دفتر آنے جانے کی عادت قائم رکھی اور اس سے میری صحت کو جو فائدہ پہنچا اس کا اثر آج تک محسوس ہو رہا ہے۔

چوتھا باب

پہلا دھچکا

میں مایوس ہو کر بمبئی سے راجکوٹ آیا اور یہاں میں نے اپنا دفتر قائم کیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا۔ درخواستوں اور عرضداشتوں کے سودے لکھ کر میں اتنا کما لیتا تھا کہ میری آمدنی کا اوسط تین سو روپیہ ماہوار تھا۔ یہ کام مجھے میری قابلیت کی بدولت نہیں بلکہ تعلقات کی بنا پر ملتا تھا کیونکہ جن وکیلوں کی شرکت میں میرے بھائی کام کرتے تھے ان کی وکالت بہت اچھی چلتی تھی۔ جو درخواستیں وغیرہ اُن کے نزدیک واقعی اہم تھیں انہیں وہ نامی بیرسٹروں کے پاس بھیجتے تھے۔ میرے حصے میں غریب موکلوں کی درخواستیں آتی تھیں۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرا کمیشن دینے کا اصول جس پر میں بمبئی میں بہت سختی سے عامل تھا، یہاں پوری طرح قائم نہیں رہ سکا۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ ان دونوں صورتوں میں بہت اختلاف ہے۔ بمبئی میں کمیشن دلالوں کو دینا پڑتا تھا اور یہاں وکیلوں کو دیا جاتا ہے جن سے مقدمے ملتے ہیں۔ یہاں بھی بمبئی کی طرح سارے بیرسٹر اپنی فیس میں سے چند فیصدی کمیشن کے طور پر دیتے ہیں۔ میرے بھائی نے جو دلیل پیش کی اس کا مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ انہوں نے کہا "تم جانتے ہو کہ میں ایک وکیل کی شرکت میں کام کرتا ہوں میں ہمیشہ یہ چاہوں گا کہ ہمارے مقدموں میں سے جتنے تمہارے بس کے ہوں وہ تمہیں دیدئے جائیں۔ اب اگر تم میرے شریک کو کمیشن دینے سے انکار کرو گے تو میں بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ میرا تمہارا تو گھر بار ایک ہے اس لئے تمہاری فیس ہم دونوں

کے کام آتی ہے۔ اور مجھے اُس میں سے خود بخود حصہ مل جاتا ہے۔ مگر میرا شریک کہاں جائے؟
فرض کرو جو مقدمہ وہ تمہیں دیتا ہے وہ کسی اور بیرسٹر کو دے تو اسے کمیشن ملے گا یا نہیں؟"
میں اس دلیل سے دھوکے میں آگیا اور میں نے یہ سوچا کہ اگر مجھے بیرسٹری کرنا ہے تو
میں ان صورتوں میں اپنے کمیشن والے اصول پر زور نہیں دے سکتا۔ میں نے اس طرح
اپنے آپ کو سمجھایا بلکہ تکلف برطرف۔ اپنے ضمیر کو فریب دیا۔ لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہئے
کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے سوائے اس صورت کے کسی مقدمے میں کمیشن نہیں دیا۔
اب میرا خرچ تنگی ترشی سے چلنے لگا۔ مگر اسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی میں
پہلی بار غم اور غصہ کا دھچکا لگا۔ میں نے سنا تھا کہ برطانوی حاکم کیسے ہوتے ہیں مگر مجھے
اب تک کسی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

میرے بھائی آں جہانی رانا صاحب پور بندر کے تخت نشین ہونے سے پہلے انکے
سکرٹری اور مشیر رہے تھے۔ آجکل ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے
میں ممدوح کو غلط مشورہ دیا تھا۔ معاملہ پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچا جو میرے بھائی سے پہلے
سے بدظن تھے۔ میں ان صاحب سے انگلستان میں مل چکا تھا اور وہاں انکا برتاؤ مجھ
خاصا دوستانہ تھا۔ میرے بھائی کا خیال تھا کہ مجھے اس دوستی سے فائدہ اٹھانا چاہئے
اور پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر انکی سفارش کرنا چاہئے تاکہ انکے دل میں جو بدگمانی ہے
وہ دور ہو جائے۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی میں نے دل میں سوچا کہ مجھ انگلستان
کی معمولی سی ملاقات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں اگر میرے بھائی واقعی قصور
وار ہیں تو میری سفارش سے کیا فائدہ؟ اور اگر وہ بے قصور ہیں تو انہیں باقاعدہ
عرضداشت پیش کرنا چاہئے اور اپنی بے گناہی پر بھروسا کر کے بے کھٹکے نتیجے کا منتظر
رہنا چاہئے۔ میرے بھائی اس مشورہ سے خوش نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا "تم
ابھی کاٹھیاواڑ کی حالت سے واقف نہیں اور دنیا کا تجربہ نہیں رکھتے۔ یہاں تو بس

سفارش ہی سے کام چلتا ہے۔ تم میرے بھائی ہو۔ جب تم صریحًا ایک حاکم کو جانتے ہو اور اس سے میری سفارش کر سکتے ہو تو تمہیں اپنے فرض سے جی چرانا مناسب نہیں۔"

میں ان سے انکار نہیں کر سکتا تھا اس لئے جبرًا قہرًا پولٹیکل ایجنٹ کے پاس گیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے اس معاملے میں ان سے کچھ کہنے سننے کا حق نہیں اور مجھے پورا احساس تھا کہ میں اپنی خودداری کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی اور انہوں نے قبول کر لی۔ میں نے انہیں پرانی واقفیت یاد دلائی لیکن مجھے فورًا یہ محسوس ہو گیا کہ کاٹھیاوار اور انگلستان میں فرق ہے اور انگریز حاکم رخصت کی حالت میں کچھ اور ہوتا ہے اور اپنے کام پر کچھ اور۔ پولٹیکل ایجنٹ نے واقفیت کا اقرار کیا لیکن اس کے یاد دلانے سے وہ مجھ سے کھنچ گئے۔ ان کی یہ کشیدگی اور ان کے تیور زبان حال سے کہہ رہے تھے "کہیں تم اس شناسائی سے بیجا فائدہ اٹھانے تو نہیں آئے ہو؟" اس پر میں نے اپنا مدعا کہہ ڈالا۔ صاحب جھنجلا کر بولے "تمہارا بھائی بڑا فطرتی آدمی ہے۔ میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اگر تمہارے بھائی کو کچھ کہنا ہے تو اس سے کہو کہ ضابطے کی درخواست پیش کرے۔" یہ جواب کافی تھا اور شاید میں اسی کا مستحق بھی تھا۔ مگر غرضمند اندھا ہوتا ہے۔ میں اپنا دکھڑا روتا رہا۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے کہا، "مگر میری پوری بات تو سن لیجئے،" یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ انہوں نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازے کے باہر پہنچا دے۔ میں اب تک پس و پیش کر رہا تھا کہ چپراسی نے آ کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔

صاحب اور چپراسی دونوں ہٹ گئے اور میں غصے میں بھرا ہوا چلا آیا۔ میں نے فورًا اس مضمون کا رقعہ لکھ کر بھیجا "آپ نے میری ہتک کی۔ آپ اپنے چپراسی کے

توسط سے مجھ پر حملہ کرنے کے مرتکب ہوئے۔ اگر آپ نے اس کی تلافی نہ کی تو مجھے قانونی چارہ جوئی کرنا پڑے گی"

ذرا سی دیر میں ایک سوار کے ہاتھ یہ جواب پہنچا:

تم نے مجھ سے گستاخی کا برتاؤ کیا۔ میں نے تم سے کہا کہ چلے جاؤ مگر تم نہیں گئے۔ اب سوائے اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ میں چپراسی سے کہوں تمہیں دروازے کے باہر پہنچا دے۔ اس کے کہنے پر بھی تم دفتر سے نہیں ہلے۔ اسے مجبوراً اتنی جسمانی قوت سے کام لینا پڑا جتنی تمہیں ہٹانے کے لئے ضروری تھی۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو چارہ جوئی کرو"

یہ جواب جیب میں رکھے، ملول اور دل شکستہ میں گھر آیا اور اپنے بھائی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ انہیں بہت رنج ہوا مگر وہ حیران تھے کہ مجھے کیونکر تسکین دیں۔ انہوں نے اپنے ملنے والے وکیلوں سے گفتگو کی کیونکہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ صاحب پر مقدمہ کس طرح چلایا جائے۔ ان زمانے میں اتفاق سے سر فیروز شاہ مہتا کسی مقدمے میں بمبئی سے راجکوٹ آئے ہوئے تھے۔ مگر میرے جیسے مبتدی وکیل میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ ان سے مل سکتا۔ اس لئے میں نے اُن وکیل کی معرفت جنہوں نے انہیں بلایا تھا اپنے مقدمے کے کاغذات اُنکے پاس بھیجے اور اُن سے التجا کی کہ مجھے مشورہ دیں۔ انہوں نے کہا "گاندھی سے کہہ دو کہ یہ باتیں وکیلوں اور بیرسٹروں کو روز مرہ پیش آتی ہیں۔ وہ ابھی نئے نئے انگلستان سے آئے ہیں اور ان کے خون میں گرمی ہے۔ انہیں انگریز حکام کا تجربہ نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کمانا چاہتے ہیں اور چین سے رہنا چاہتے ہیں تو رقعے کو پھاڑ ڈالیں اور بات کو پی جائیں۔ صاحب پر مقدمہ چلانے سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ خود ہی تباہ ہو جائیں تو عجب نہیں۔ ان سے کہو کہ ابھی کچھ دن سیکھیں کہ زندگی کیا چیز ہے"

نصیحت مجھے زہر کی طرح کڑوی معلوم ہوئی مگر یہی دارو ئے تلخ پینا پڑی۔ میں اس توہین کو چپ چاپ پی گیا اور میں نے اس سے آئندہ کے لئے سبق بھی حاصل کیا۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا "اب میں کبھی ایسے پھیر میں نہ آؤں گا کہ مجھے اپنے اصول کے خلاف عمل کرنا پڑے اور کبھی دوستی سے یوں بیجا فائدہ نہ اٹھاؤں گا۔" اس وقت سے آجتک میں نے کبھی اس عہد کو نہیں توڑا۔ اس دھچکے نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔

پانچواں باب

جنوبی افریقہ جانیکی تیاریاں

بیشک یہ میری غلطی تھی کہ میں پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس گیا۔ لیکن اُن کا یہ طیش اور قہر میری غلطی کے تناسب سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے ایسا قصور نہیں کیا تھا کہ نکال دیا جاتا۔ میں نے ان کا پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا ہوگا۔ لیکن انہیں تو میرا بات کرنا ہی ناگوار تھا۔ وہ چاہتے تو مجھ سے آدمیت سے کہہ دیتے کہ چلے جاؤ مگر وہ تو حکومت کے نشے میں چور تھے۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ ان صاحب کی صفات حسنہ میں تحمل داخل نہ تھا ان کی عادت تھی کہ جو ملاقات کے لئے آتا اس کی توہین کرتے۔ کوئی بات ذرا بھی خلاف مزاج ہوئی اور صاحب بگڑے۔

اب دقت یہ تھی کہ میرے مقدمے زیادہ تر انہیں کی عدالت میں ہوتے تھے۔ ان کے غصے کو دور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مجھے انکی چاپلوسی کرنے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک بار نالش کی دھمکی دے کر چپ چاپ بیٹھ رہنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اس عرصے میں مجھے اپنے ملک کی ادنٰی درجے کی سیاسی چالوں کا حال معلوم ہوا۔ کاٹھیاواڑ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ ہے اس لئے قدرتی طور پر یہاں جوڑ توڑ لگانے والوں کی کمی نہ تھی۔ ریاستوں کا باہم ساز باز کرنا اور عہدہ داروں کا اپنی قوت بڑھانے کے لئے سازشیں کرنا معمولی بات تھی۔ رئیس ہر وقت اپنے رازداروں سے دبے رہتے تھے اور خوشامدیوں کی باتوں پر فوراً اعتبار کر لیتے تھے۔ صاحب کے

چپراسی تک کی خوشامد کرنا پڑتی تھی اور سررشتہ دار تو گویا صاحب کے بھی آقا تھے کیونکہ وہی انکے آنکھ کان تھے وہی انہیں ہر چیز ترجمہ کرکے سمجھاتے تھے۔ سررشتہ دار کی مرضی قانون تھی اور کہا جاتا ہے کہ انکی آمدنی صاحب سے زیادہ تھی۔ ممکن ہے کہ یہ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ انکا خرچ بہت تھا اور تنخواہ اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ فضا مجھے زہریلی معلوم ہوتی تھی اور میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ اس کے اثر سے کیونکر محفوظ رہوں۔

میں بہت پژمردہ رہتا تھا اور میرے بھائی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے، ہم دونوں کا خیال تھا کہ اگر مجھے کوئی مستقل کام ملجائے تو اس سازش کی فضا سے چھٹکارا ہو جائے۔ لیکن بغیر سازش کے دیوانی یا جی ملنا ناممکن تھا اور وکالت میں یہ دقت تھی کہ صاحب سے جھگڑا ہو گیا تھا۔

پور بندر میں اس زمانے میں راجہ صاحب بااختیار نہ تھے، انگریزی حکومت کی طرف سے ایک منتظم مقرر تھے۔ مجھے ان سے اس لئے ملنا تھا کہ راجہ صاحب کو کچھ اختیارات دلواؤں اور "میروں" پر جو بھاری "وگھوتی" (مالگذاری) باندہ دی گئی ہے اسے کم کراؤں۔ یہ منتظم تھے تو ہندوستانی مگر میں نے انہیں صاحب سے بھی بڑھ کر مغرور پایا۔ یہ قابل آدمی تھے لیکن ان کی قابلیت کی بدولت رعایا کچھ خوشحال نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں راجہ صاحب کو تھوڑے بہت اختیارات دلوانے میں تو کامیاب ہوا لیکن میروں کی کوئی دادرسی نہ ہو سکی مجھے یہ محسوس ہوا کہ انکے معاملے پر اچھی طرح غور تک نہیں کیا گیا۔

غرض یہاں بھی مجھے اپنی کوشش میں ایک لحاظ سے مایوسی ہی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ میرے موکلوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا لیکن کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں پولیٹکل ایجنٹ یا گورنر کے یہاں اپیل کرسکتا تھا۔ مگر وہ یقیناً

میری اپیل کو خارج کر دیتے اور مداخلت کرنے سے انکار کرتے۔ اگر ان فیصلوں کی نگرانی کے لئے کوئی قاعدہ یا ضابطہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی مگر وہاں تو صاحب کی مرضی قانون تھی۔

میں یہاں کی زندگی سے اور بھی بیزار ہو گیا۔

اس عرصے میں ایک میمن نے جن کی دوکان پور بندر میں تھی میرے بھائی کو یہ پیغام بھیجا "ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں۔ ہمارا کاروبار بڑا ہے اور وہاں عدالت میں ہمارا ایک بہت بڑا مقدمہ ہے جس میں ہماری طرف سے چالیس ہزار پونڈ کا دعوٰے کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ بہت دن سے چل رہا ہے۔ ہم نے بہترین وکیلوں اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کی ہیں، اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیجدیں تو انکے لئے بھی اچھا ہے اور ہمارے لئے بھی۔ وہ ہمارے وکیلوں کو ہم سے بہتر ہدایتیں دے سکیں گے۔ انہیں یہ فائدہ ہے کہ ایک نئے ملک کی سیر کر لیں گے اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہو جائیگی"

بھائی صاحب نے مجھ سے اس معاملے میں گفتگو کی۔ میں یہ صاف طور پر نہیں سمجھ سکا کہ مجھے صرف وکیلوں کو ہدایتیں دینا ہوگا یا عدالت میں بھی جانا پڑے گا۔ مگر بات ایسی تھی کہ میرا جی للچا گیا۔

بھائی صاحب نے مجھے سیٹھ عبدالکریم جھاویری سے ملوایا۔ یہ اسی عبداللہ کمپنی میں جس کا یہ معاملہ تھا حصہ دار تھے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں انہوں نے کہا "وہاں ہم سے بڑے بڑے یورپینوں سے دوستی ہے آپ کی بھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ سے دوکان کے کام میں بھی مدد ملے گی۔ ہماری خط و کتابت زیادہ تر انگریزی میں ہوتی ہے۔ اس میں آپ ہاتھ بٹا لیں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ وہاں ہمارے مہمان ہوں گے اور آپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا"

میں نے پوچھا "آپ میری خدمات کتنے دن کے لئے چاہتے ہیں اور معاوضہ

کیا ہو گا؟"

"آپ کو ایک سال سے زیادہ نہیں لگے گا۔ ہم آپ کو آنے جانے کا اول درجے کا کرایہ دیں گے اور کل اخراجات کے علاوہ ایک سو پانچ پاؤنڈ اور۔"

یہ بیرسٹر کی حیثیت سے جانا تو کہا نہیں جا سکتا۔ یوں کہنا چاہئے کہ میں دوکان کے ایک ملازم کی حیثیت سے جا رہا تھا لیکن مجھے تو یہ فکر تھی کسی طرح ہندوستان سے نکلوں۔ پھر یہ لالچ تھا کہ نیا ملک دیکھنے میں آئے گا اور نیا تجربہ حاصل ہو گا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ایک سو پانچ پاؤنڈ بھائی صاحب کو بھیج سکوں گا جس سے گھر کے خرچ میں مدد ملے گی۔ غرض میں نے بغیر ردوبدل کئے ان شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

جنوبی افریقہ جاتے وقت مجھے وہ جدائی کا درد محسوس نہیں ہوا جو انگلستان جاتے وقت ہوا تھا۔ اب میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں دنیا دیکھ چکا تھا اور غیر ملکوں کے سفر کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ راجکوٹ سے بمبئی جانا غیر معمولی بات ہو۔

اس بار مجھے صرف اپنی بیوی کی جدائی شاق گذری۔ میرے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ایک اور بچہ پیدا ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کی محبت ابھی شہوانی خواہش سے خالی نہ تھی مگر روز بروز پاک ہوتی جاتی تھی۔ جب سے میں یورپ سے واپس آیا مجھے بہت کم انکے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔ اب میں جیسا کچھ برا بھلا مجھ سے ممکن تھا، انہیں پڑھاتا تھا اور بعض اصلاحوں میں ان کی مدد کرتا تھا اس لئے ہم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہم زیادہ دن یکجا رہیں تاکہ یہ اصلاحیں جاری رہ سکیں لیکن جنوبی افریقہ کے شوق میں میں فراق کا صدمہ برداشت کرنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر تسکین دی ”ہم دونوں ایک سال میں ضرور ملیں گے“ اور راجکوٹ سے بمبئی روانہ ہو گیا۔

یہاں مجھے دادا عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کے ذریعے سے جہاز کا ٹکٹ لینا تھا۔ مگر جو جہاز جانے والا تھا اس میں بالکل جگہ نہ تھی اور مجھے یہ مشکل کہ اگر اس جہاز سے نہ جاؤں تو بمبئی میں بیکار پڑا رہنا پڑے۔ ایجنٹ نے کہا ”ہم نے اول درجے کا ٹکٹ لینے کی

انتہائی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ہاں آپ ڈیک پر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ اس کا انتظام کر دیا جائیگا کہ کھانا آپ دوسرے مسافروں کے ساتھ کمرے میں کھا سکیں" یہ وہ زمانہ تھا جب میں اول درجے سے کم میں سفر ہی نہیں کرتا تھا اور یوں بھی بھلا بیرسٹر صاحب ڈیک پر کیسے جا سکتے تھے ؟ اس لئے میں نے اس دعوت سے انکار کر دیا۔ مجھے ایجنٹ کی سچائی میں شبہ تھا کیونکہ یقین نہیں آتا تھا کہ اول درجے میں کوئی جگہ خالی نہیں۔ آخر اس کی رضامندی سے میں خود کوشش کرنے نکلا۔ میں جہاز پر گیا اور کپتان سے ملا۔ اس نے صاف صاف کہدیا ہمارے یہاں عام طور پر مسافروں کی اتنی کثرت نہیں ہوتی لیکن چونکہ موزمبیق کے گورنر جنرل اس جہاز سے جا رہے ہیں اس لئے سب جگہیں بھر گئی ہیں "

میں نے پوچھا "کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ میرے لئے کسی طرح گنجایش نکال دیں ؟" اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا اور مسکرا کر کہا "صرف ایک صورت ہے۔ میرے کیبن میں ایک زائد جگہ ہے جو عموماً مسافروں کو نہیں دیجاتی۔ مگر میں آپ کو دے دوں گا" میں نے شکریہ ادا کیا اور ایجنٹ کو بھیج کر ٹکٹ منگوالیا۔ اپریل ۱۸۹۳ء میں میں دل میں بڑے ولولے لئے ہوئے قسمت آزمائی کرنے جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔

پہلی بندرگاہ جہاں جہاز ٹھہرا لامو تھی۔ یہاں ہم تیرہ دن میں پہنچے۔ اس عرصے میں مجھ میں اور کپتان میں بڑی دوستی ہو گئی۔ اسے شطرنج کھیلنے کا شوق تھا مگر وہ نوآموز تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا شخص ساتھ کھیلنے کو ملے جو اس سے بھی زیادہ مبتدی ہو اس لئے اس نے مجھ سے کھیلنے کی فرمایش کی۔ میں نے اس کھیل کی بہت تعریف سنی تھی مگر کھیلا نہ تھا۔ کھیلنے والے کہا کرتے تھے کہ اس میں ذہانت سے کام لینے کا بہت موقع ہے۔ کپتان نے کہا میں تمہیں کھیلنا سکھا دوں گا اور چونکہ مجھ میں صبر بےحد تھا اس لئے وہ مجھے بڑا مستعد شاگرد سمجھتا تھا۔ ہر بار میں ہی ہارتا تھا اس لئے وہ مجھے اور بھی

شوق سے سکھاتا تھا۔ کھیل مجھے پسند آیا مگر میری رغبت بس جہاز ہی تک رہی اور میری معلومات سیدھی سادی چالوں سے آگے نہیں بڑھی۔

لامو میں جہاز تین چار گھنٹے لنگر انداز رہا اور میں نیچے اتر کر بندرگاہ دیکھنے گیا۔ کپتان بھی کنارے پر گیا مگر اس نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ یہاں سمندر کی حالت اعتبار کے قابل نہیں اور تاکید کر دی تھی کہ ذرا پہلے سے لوٹ آؤں۔

یہ چھوٹی سی جگہ تھی۔ میں ڈاک خانے پہنچا۔ وہاں میں ہندوستانی کلرکوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے افریقی بھی نظر آئے اور میں نے انکے طرز زندگی سے جس سے مجھے بہت دلچسپی تھی، واقف ہونے کی کوشش کی۔ اس میں کچھ دیر لگ گئی۔

چند ڈیک کے مسافر بھی، جن سے مجھے واقفیت ہو گئی تھی، ساحل پر آئے تھے کہ ذرا اطمینان سے کھانا پکا کر کھائیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ واپسی کی تیاری کر رہے ہیں اور ہم سب کے سب ایک ہی کشتی میں بیٹھ گئے۔ سمندر باڑھ پر تھا اور ہماری کشتی مناسب مقدار سے زیادہ لدی ہوئی تھی۔ پانی کا دھارا اتنا تیز تھا کہ کشتی جہاز کی سیڑھی کے برابر کسی طرح نہیں ٹھہرتی تھی۔ روانگی کی پہلی سیٹی بج چکی تھی۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ کپتان اوپر کھڑا ہماری پریشانی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جہاز کو اور پانچ منٹ ٹھہرانے کا حکم دیا۔ جہاز کے قریب ایک اور کشتی تھی جسے ایک دوست نے دس روپئے میں میرے لئے کرائے پر لے لیا۔ اس کشتی نے مجھے جہاز کے قریب پہنچایا۔ سیڑھی اٹھالی گئی تھی اس لئے میں ایک رسی کے ذریعے سے اوپر کھینچا گیا اور جہاز فوراً روانہ ہو گیا۔ دوسرے مسافر رہ گئے۔ اب مجھے کپتان کی نصیحت کی قدر ہوئی۔

لامو کے آگے دوسری بندرگاہ ممباسا تھی اور تیسری زنجبار۔ یہاں کوئی آٹھ دس دن ٹھہرنا پڑا۔ اور یہاں سے ہم دوسرے جہاز میں سوار ہوئے۔

کپتان کو مجھ سے انس ہو گیا تھا مگر اس انس کی بدولت ایک ناگوار واقعہ پیش آیا
اس نے مجھے اور انگریز دوست کو اپنے ساتھ سیر کرنے کی دعوت دی۔ ہم تینوں ایک
کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر گئے۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس سیر کے کیا معنی
ہیں۔ اور کپتان بیچارہ کیا جانے کہ میں ان معاملات میں کتنا سادہ لوح ہوں۔
ایک دلال ہم لوگوں کو حبشی عورتوں کے یہاں لے گیا اور اس نے ہم تینوں کو علیحدہ
علیحدہ کمروں میں پہنچا دیا۔ میں دم بخود کھڑا تھا اور شرم سے گڑا جاتا تھا۔ خدا جانے وہ
بیچاری عورت مجھے کیا سمجھتی ہوگی۔ جب کپتان نے مجھے پکارا تو جیسا گیا تھا ویسا ہی
آگیا۔ اُس نے میرے چہرے سے میری پاکدامنی معلوم کرلی۔ پہلے تو مجھے بہت
شرم آئی لیکن چونکہ اس فعل کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اس
لئے شرم کا احساس رفتہ رفتہ جاتا رہا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس عورت
کو دیکھ کر میرے دل میں ذرا بھی بدی نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت
آتی تھی کہ میں نے جرأت سے کام لے کر کمرے میں جانے سے انکار کیوں نہ کر دیا۔
میری زندگی میں یہ اس قسم کی تیسری آزمائش تھی خدا جانے کتنے نوجوان جو
ابتدا میں پاکدامن ہونگے جھوٹی شرم کی بدولت گناہ میں آلودہ ہوگئے ہوں گے
میری اس میں کوئی تعریف نہیں کہ میں بیداغ بچ کر چلا آیا۔ تعریف تو جب ہوتی کہ
میں کمرے میں جانے ہی سے انکار کر دیتا۔ مجھے اُس رحمٰن رحیم کا شکر کرنا چاہئے
کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ اس واقعے سے مجھے ذات الٰہی پر اور بھی عقیدہ ہو گیا اور ایک
حد تک جھوٹی شرم سے نجات ملی۔
چونکہ اس بندرگاہ میں ایک ہفتہ ٹھہرنا تھا اس لئے میں نے شہر میں کمرے کرائے پر لے لئے
اور آس پاس پھر کر خوب سیر کی۔ زنجبار میں درختوں اور سبزہ زاروں کی جو کثرت تھی اسکا اندازہ
رہو سکتا ہے تو لا بار کو دیکھ کر۔ مجھے وہاں کے اونچے درختوں اور بڑے بڑے پھلوں کو دیکھ کر حیرت
ہوتی تھی۔ اسکے بعد موزمبیق میں قیام ہوا اور وہاں سے چلکر ہم مئی کے آخر میں نٹال پہنچ گئے۔

ساتواں باب

چند تجربے

نٹال کی بندرگاہ ڈربن ہے۔ اسے پورٹ نٹال بھی کہتے ہیں۔ وہاں عبداللہ سیٹھ مجھے لینے کے لئے آئے۔ جب جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچا تو میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے جہاز پر آئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستانی کچھ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ عبداللہ سیٹھ کے جاننے والوں کا جو برتاؤ انکے ساتھ تھا اس سے ایک طرح کی رعونت ظاہر ہوتی تھی جس سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ عبداللہ سیٹھ اس کے عادی ہوگئے تھے۔ مجھے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے لباس کے سبب سے اور ہندوستانیوں سے ممتاز نظر آتا تھا۔ میں فراک کوٹ پہنے تھا اور میرے سر پر بنگالی وضع کی پگڑی تھی۔

میں دوکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرے میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت کا اندازہ کرنے میں دقت ہوئی اُن کاغذات کو پڑھ کر جو انکے بھائی نے میرے ساتھ بھیجے تھے وہ الجھن میں پڑ گئے۔ وہ سمجھے کہ ان کے بھائی نے ان کے گھر ایک سفید ہاتھی بھیج دیا ہے جسے کھلاتے کھلاتے دیوالہ نکل جائیگا۔ میرے لباس اور طرز معاشرت میں انہیں فرنگیوں کا سا اسراف نظر آیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس وقت کوئی خاص کام ہی نہیں جو ان حضرت کو دیا جاسکے۔ مقدمہ ٹرانسوال میں ہے۔ فوراً وہاں بھیجنا بالکل فضول ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قابلیت اور دیانتداری پر کہاں تک اعتبار کیا جاسکتا

ہے ؟ میں تو پرٹوریا میں رہوں گا نہ کہ ان کی نگرانی کر سکوں۔ مدعا علیہ سب وہیں ہیں ممکن ہے کہ وہ لوگ انپر ناجائز اثر ڈالیں۔ اب اگر مقدمے کا کام نہیں دیا جاسکتا تو پھر اور کون سا کام دیا جائے۔ دوسرے کام تو میرے محرران سے کہیں اچھا کر لیتے ہیں۔ اور محرر اگر غلطی کریں تو اُن سے بازپرس ہو سکتی ہے لیکن ان سے غلطی ہو تو کیا کیا جائے۔ اس لئے اگر مقدمے کے متعلق کوئی کام انہیں نہ دیا جائے تو گویا مفت میں انکا بار میرے سر پڑ گیا۔

عبداللہ سیٹھ قریب قریب ان پڑھ تھے مگر انکا تجربہ بہت وسیع تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ غضب کی تھی اور انہیں اس کا احساس بھی تھا۔ مشق سے انہوں نے بس اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں۔ مگر وہ اسی سے سارا کام چلاتے تھے۔ چاہے بنک کے منیجروں اور یورپی تاجروں سے معاملہ کرنا ہو یا وکیل کو مقدمہ سمجھانا ہو۔ ہندوستانی اُنکی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُنکی دوکان ہندوستانی دوکانوں میں چوٹی کی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن سب خوبیوں کے ساتھ ان میں ایک عیب تھا۔ وہ فطری طور پر شکّی واقع ہوئے تھے۔

انہیں اس بات پر فخر تھا کہ انکا مذہب اسلام ہے اور اس مذہب کے فلسفے پر تقریر کرنیکا انہیں بڑا شوق تھا وہ عربی نہیں جانتے تھے مگر قرآن مجید کی تفسیر اور عام اسلامی علوم میں خاصا دخل رکھتے تھے۔ مثالیں انہیں بہت کثرت سے یاد تھیں اور جب چاہتے تھے ان سے کام لیتے تھے۔ اُنکی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی عملی واقفیت ہو گئی جب ہم دونوں میں بے تکلفی ہو گئی تو ہم اکثر مذہبی مسئلوں پر بحث کیا کرتے تھے۔

میرے آنیکے دوسرے تیسرے دن وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے کئی آدمیوں سے ملوایا اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا۔ مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا۔ آخر میں اس نے مجھ سے کہا کہ پگڑی اتار ڈالو۔ میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہاں بھی میری تقدیر میں لڑائی لڑنا لکھا ہے۔ عبداللہ سیٹھ

نے مجھے سمجھایا کہ بعض ہندوستانیوں کو پگڑی اتارنا پڑتا ہے۔ انہوں نے کہا جو لوگ اسلامی لباس پہنتے ہیں وہ پگڑی باندھے رہتے ہیں لیکن اور ہندوستانیوں کو عموماً عدالت میں جاتے وقت پگڑی اتارنے کا حکم ہے۔

اس باریک فرق کو سمجھانے کیلئے مجھے کسی قدر تفصیل سے کام لینا چاہئے۔ اس دو تین دن کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہاں ہندوستانی چار طبقوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا طبقہ مسلمان تاجروں کا جو اپنے آپ کو عرب کہتے تھے۔ دوسرا طبقہ ہندو محرروں کا اور تیسرا پارسی محرروں کا تھا۔ ہندو محرر کسی شمار قطار میں نہ تھے سوائے ان لوگوں کے جو عربوں میں مل جل گئے تھے۔ پارسی محرر اپنے آپ کو "ایرانی" کہتے تھے۔ ان تینوں طبقوں میں آپس میں سماجی تعلقات تھے مگر سب سے بڑا طبقہ تامل، تیلیگو اور شمالی ہندوستان کے پابند اور آزاد مزدوروں کا تھا۔ پابند مزدور وہ تھے جو پانچ سال کی خدمت کا معاہدہ کرکے نٹال گئے تھے اور "گرمٹی" کہلاتے تھے۔ "گرمٹی" "گرمٹ" سے نکلا ہے جو انگریزی لفظ "ایگریمنٹ" (معاہدہ) کی خرابی ہے۔ مذکورہ بالا تینوں طبقے اس چوتھے طبقے سے محض کاروباری تعلقات رکھتے تھے۔ انگریز ان لوگوں کو "قلی" کہتے تھے اور چونکہ اکثر ہندوستانی مزدور تھے اس لئے سبھی "قلی" یا "سامی" کہلانے لگے۔ "سامی" تامل زبان کا لاحقہ ہے جو اکثر تامل ناموں کے آخر میں آتا ہے اور یہ اصل میں سنسکرت لفظ "سوامی" ہے جس کے معنی مالک کے ہیں۔ اسلئے جب کسی ہندوستانی کو جس کی طبیعت میں ظرافت ہو کوئی شخص سامی کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو وہ یہ جواب دیتا تھا "آپ مجھے "سامی" کہتے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ "سامی" کے معنی مالک کے ہیں۔ میں آپ کا مالک تو نہیں ہوں" بعض انگریز یہ سن کر جھینپ جاتے تھے بعض اس ہندوستانی کو گالیاں دیتے تھے بلکہ موقع ملے تو مار بیٹھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک "سامی" حقارت کا لفظ تھا۔ اس کے معنی "مالک" بتانا گویا ان کی توہین کرنا تھا!۔

گاندھی جی ۱۹۰۶ع میں

اسلئے لوگ مجھے "قلی بیرسٹر" کہتے تھے۔ ہندوستانی تاجر "قلی تاجر" کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ "قلی" کے معنی بھول گئے تھے اور یہ ہندوستانیوں کا عام لقب ہوگیا تھا کسی مسلمان تاجر کو کوئی انگریز "قلی" کہدے تو وہ بہت بگڑتا تھا اور کہتا تھا "میں قلی نہیں ہوں بلکہ عرب ہوں" یا "میں تاجر ہوں" اور انگریز اگر مہذب ہوا تو اس سے معافی مانگ لیتا تھا۔

ایسی صورت میں پگڑی کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے گویا چپ چاپ ذلت سہ لی۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ اب ہندوستانی پگڑی کو خیرباد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہئے تاکہ میری ذلت نہ ہو اور اس ناگوار جھگڑے سے پیچھا چھوٹے۔

مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا "اگر تم ایسا کروگے تو بہت برا اثر پڑے گا۔ تمہارے سبب سے ان لوگوں کی بات بگڑ جائے گی جو پگڑی باندھنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اور تمہارے سر پر ہندوستانی پگڑی بھلی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم انگریزی ہیٹ لگاؤگے تو ہوٹل کے بیرے معلوم ہونے لگوگے۔"

یہ نصیحت مصلحت اندیشی، حب وطن اور کسی قدر تنگ نظری پر مبنی تھی۔ مصلحت تو ظاہر ہے اور حب وطن نہ ہوتا تو وہ ہندوستانی پگڑی باندھنے پر اتنا زور کیوں دیتے مگر بیرے کی حقارت آمیز پھبتی سے ایک طرح کی تنگ نظری ظاہر ہوتی تھی۔ ہندوستانی پابند مزدوروں میں تین مذہب کے لوگ تھے۔ ہندو، مسلمان اور عیسائی۔ آخرالذکر پابند مزدوروں کی اولاد تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ۱۸۹۳ء ہی میں ان کی تعداد خاصی بڑی ہوگئی تھی۔ وہ انگریزی لباس پہنتے تھے اور ان میں سے اکثر ہوٹلوں میں بیرے کا کام کرکے گذر کرتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ نے جب انگریزی ہیٹ پر اعتراض کیا تو انکا اشارہ اسی گروہ کی طرف تھا۔ ہوٹل کا بیرا ہونا ذلت سمجھی جاتی تھی بہت سے لوگ ابتک اس خیال پر قائم ہیں۔

مجموعی حیثیت سے مجھے عبداللہ سیٹھ کی نصیحت پسند آئی۔ میں نے اخبار وں

میں اس واقعے کا حال لکھا اور اپنے پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا اس مسئلے پر اخباروں میں خوب بحث ہوئی اور انہوں نے میرا لقب "ناپسندیدہ نووارد" رکھ دیا۔ بعض میری تائید کرتے تھے اور بعض میری بیباکی پر سختی سے اعتراض کرتے تھے۔

میں جب تک جنوبی افریقہ میں رہا قریب قریب ہمیشہ پگڑی باندھتا رہا۔ البتہ ایک زمانے میں میں نے پگڑی ٹوپی وغیرہ سب چھوڑ دی تھی اور ننگے سر رہتا تھا۔ یہ کب ہوا اور کیوں ہوا اس کا حال آگے چل کر معلوم ہوگا۔

آٹھواں باب

پریٹوریا کا سفر

مجھے تھوڑے دن میں عیسائی ہندوستانیوں سے جو ڈربن میں رہتے تھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ عدالت کے مترجم مسٹر پال رومن کیتھولک تھے۔ مجھ سے ان سے ملاقات ہو گئی اور مسٹر سبحان گاڈفرے آنجہانی سے بھی جو اس زمانے میں پروٹسٹنٹ مشن میں مدرس تھے۔ انکے بیٹے مسٹر جیمس گاڈفرے پارسال جنوبی افریقہ کے وفد کے رکن ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ اسی زمانے میں میں پارسی رستم جی آنجہانی اور آدم جی میاں خاں آنجہانی سے بھی ملا۔ ان سب دوستوں میں جو اس وقت تک ایک دوسرے سے صرف کاروبار کے سلسلے میں ملتے تھے۔ بعد میں بہت گہرے تعلقات ہو گئے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔

ادھر میں اپنے حلقۂ ملاقات کو وسیع کر رہا تھا اور اُدھر ہماری دوکان کے نام وکیل کا خط آیا جس سے یہ اطلاع ملی کہ اب مقدمے کی تیاری شروع کرنے کا وقت آ گیا اور عبداللہ سیٹھ کو چاہیئے کہ یا تو خود پریٹوریا جائیں یا اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں۔ عبداللہ سیٹھ نے مجھے یہ خط پڑھنے کو دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم پریٹوریا جاؤ گے میں نے کہا " یہ میں اس وقت کہہ سکتا ہوں جب آپ سے مقدمہ سمجھ لوں۔ ابھی تو میں حیران ہوں کہ میرا وہاں کیا کام ہے۔" اس پر انہوں نے اپنے محرروں کو حکم دیا کہ مجھے مقدمہ سمجھائیں۔

جب میں مقدمے کا مطالعہ کرنے لگا تو یہ معلوم ہوا کہ مجھے ان معاملات میں الف۔ بے سے شروع کرنا چاہیے۔ جب میں زنجبار میں چند روز ٹھہرا تھا

تو میں نے عدالت میں جاکر وہاں کی کارروائی دیکھی تھی۔ ایک پارسی وکیل گواہ سے جرح کے سلسلے میں بہی کھاتے کے متعلق سوال کر رہا تھا۔ میں ایک حرف نہیں سمجھا۔ یا فن میں نے نہ تو اسکول میں سیکھا تھا اور نہ انگلستان کے قیام کے زمانے میں۔

اس مقدمے کا جس کے لئے میں جنوبی افریقہ آیا تھا دارومدار حساب کتاب پر تھا۔ محرر لیکھے جوکھے کی باتیں کرتا چلا گیا اور میری الجھن بڑھتی گئی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پی نوٹ کسے کہتے ہیں۔ لغت میں بھی یہ لفظ نہیں ملا۔ میں نے محرر کے سامنے اپنی جہالت کا اظہار کیا اور اس سے معلوم ہوا کہ پی۔ نوٹ سے پرامیسری نوٹ مراد ہے۔ میں نے سیاق پر ایک کتاب خریدی اور اس کا مطالعہ کیا۔ اس سے مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ مقدمہ میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے دیکھا کہ عبداللہ سیٹھ جنہیں حساب لکھنا نہیں آتا تھا اتنی سوجھ بوجھ رکھتے تھے کہ سیاق کی پیچیدگیوں کو دم بھر میں سلجھا کے رکھ دیتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پریٹوریا جانے کے لئے تیار ہوں۔

انہوں نے پوچھا "آپ ٹھہریں گے کہاں؟" میں نے کہا "جہاں آپ فرمائیں"

"اچھا تو میں وکیل صاحب کو لکھ دوں گا وہ آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیں گے میں اپنے میمن دوستوں کو بھی اطلاع دے دوں گا لیکن میری رائے میں انکے یہاں آپ کا ٹھہرنا مناسب نہیں۔ فریق ثانی کا پریٹوریا میں بڑا اثر ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ہمارے خط پڑھ لے تو ہمیں بہت نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے آپ ان لوگوں سے ربط ضبط بڑھانے سے جتنا پرہیز کریں اتنا ہی ہمارے لئے اچھا ہے"

"مجھے جہاں آپ کے وکیل ٹھہرائیں گے وہیں ٹھہروں گا یا اپنے طور کہیں علیحدہ مکان ڈھونڈھ لوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہماری پوشیدہ باتوں کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ مگر یہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ فریق ثانی سے ملاقات بلکہ دوستی پیدا کر دوں۔ اگر

ہوسکا تو میں یہ کوشش کروں گا کہ عدالت کے باہر آپس میں سمجھوتا ہوجائے۔ آخر طیب سیٹھ آپ کے عزیز ہی تو ہیں۔"

سیٹھ طیب حاجی خاں محمد عبداللہ سیٹھ کے قریبی رشتہ دار تھے۔

سیٹھ کے چہرے سے ظاہر ہوگیا کہ وہ سمجھوتے کا نام سن کر کھٹک گئے۔ لیکن مجھے ڈربن آئے چھ سات دن ہوچکے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف ہوگئے تھے۔ اب میں سفید ہاتھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے رک رک کر کہا:۔

"ہاں ... ہے ... تو ... اچھا۔ عدالت کے باہر سمجھوتا ہوجائے تو کیا بات ہے لیکن ہم سب عزیز ہیں اور ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں طیب سیٹھ پر آسانی سے راضی ہونے والے آسامی نہیں۔ اگر ہم نے ذرا سی غفلت کی تو وہ ہم سے نہ جانے کیا کچھ اینٹھ لینگے اور آخر میں ایسا چرکا دیں گے کہ ہم بھی یاد کرینگے۔ اس لئے آپ ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھائیے گا۔"

میں نے کہا "آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے مجھے طیب سیٹھ سے یا کسی شخص سے مقدمہ کا حال بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو انہیں صرف یہ صلاح دوں گا کہ آپس میں سمجھوتا کرلیں۔ ورنہ مدتوں بیکار مقدمہ بازی ہوتی رہے گی۔

ڈربن آنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔ میرے لئے اول درجے کا ٹکٹ لیا گیا۔ وہاں قاعدہ تھا کہ اگر بستر کی ضرورت ہو تو پانچ شلنگ اور دینا پڑتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ کا اصرار تھا کہ میں ایک بستر کرائے پر لے لوں مگر میں نے کچھ تو ضد اور غرور میں اور کچھ پانچ شلنگ بچانے کے خیال سے انکار کر دیا۔ عبداللہ سیٹھ نے کہا "دیکھو یہ ہندوستان نہیں ہے۔ ہمیں خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف لے لو۔"

میں نے انکا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیے۔

و بجے رات کو گاڑی نٹال کے دارالحکومت میرٹیزبرگ پہنچی۔ بستر وغیرہ اسی اسٹیشن پر د
یا تے تھے۔ ایک ریل کا آدمی آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کو بستر تو نہیں چاہئے۔ میں
نے کہا "نہیں میرے پاس موجود ہے" اس کے بعد ایک (سفید چمڑے کا) مسافر آیا
ور اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ یہ "کالا" آدمی ہے۔ اس کی
طبیعت منغض ہو گئی۔ وہ فوراً چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو ایک ریل کے ملازموں
کو ساتھ لے آیا، انہوں نے تو کچھ نہیں کہا مگر ایک اور افسر میرے پاس آ کر کہنے لگا۔
"ادھر آؤ تمہیں گارڈ کے ڈبے میں بیٹھنا پڑے گا"

میں نے کہا "مگر میرے پاس تو اول درجے کا ٹکٹ ہے"

اس نے جواب دیا "اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں جو تم سے کہتا ہوں کہ تمہیں
گارڈ کے ڈبے میں چلنا پڑے گا"

"اور میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے ڈربن میں اس ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت
دی گئی تھی اور میں اسی میں جاؤں گا"

"ہرگز نہیں۔ تمہیں یہ ڈبہ خالی کرنا پڑے گا ورنہ میں پولیس کے سپاہی کو بلا کر
تمہیں نکلوا دوں گا"

"تمہیں اختیار ہے۔ میں اپنی مرضی سے تو جانے کا نہیں"

سپاہی آیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لیا۔ میرا اسباب بھی اٹھا لیا گیا۔
میں نے دوسرے ڈبے میں جانے سے انکار کیا اور گاڑی چل دی۔ میں جا کر مسافر
خانے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ لے لیا اور باقی سامان جہاں تھا وہیں پڑا
رہنے دیا۔ ریل کے ملازموں نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

جاڑے کے دن تھے اور جنوبی افریقہ کے بلند خطوں میں کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے
میرٹیزبرگ بہت اونچی جگہ ہے۔ یہاں بڑی سخت سردی تھی۔ میرا اوور کوٹ میرے

اسباب میں تھا لیکن مجھے مانگنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ کہیں پھر ذلیل نہ ہونا پڑے۔
اس لئے میں بیٹھا کانپتا رہا۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ آدھی رات کے قریب ایک
مسافر آیا اور اس نے چاہا کہ مجھ سے باتیں کرے۔ مگر میں ایسی حالت میں کیا خاک
باتیں کرتا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ میں اپنے حقوق کے لئے لڑوں،
یا اسی وقت ہندوستان لوٹ جاؤں یا چپ چاپ ذلت برداشت کرکے پریٹوریا پہنچوں اور
مقدمہ ختم ہونیکے بعد ہندوستان کی واپسی کا قصد کروں جس کام کا میں نے ذمہ لیا ہے
اسے پورا کئے بغیر ہندوستان واپس جانا بزدلی ہے۔ مجھے جو تکلیف اٹھانا پڑی یہ سطحی چیز ہے
یہ محض ایک علامت ہے رنگ کے تعصب کی جو ایک مہلک مرض کی صورت میں سطح کے
نیچے موجود ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اس مرض کا پورا ازالہ
ہو جائے اور اس میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں سب جھیلنا چاہئے۔ میرے ساتھ بدسلوکی
کی گئی ہے اس کی تلافی کی کوشش صرف اس حد تک جائز ہے جہاں تک نسلی تعصب
کو دور کرنے میں مدد ملے۔

غرض میں نے یہ طے کیا کہ جو پہلی گاڑی ملے گی اس سے پریٹوریا چلا جاؤنگا۔
دوسرے دن صبح کو میں نے ریلوے کے جنرل منیجر کے نام بڑا لمبا تار دیا اور
عبداللہ سیٹھ کو بھی اطلاع دے دی۔ وہ فوراً جاکر جنرل منیجر سے ملے۔ اس نے ریل
کے کارکنوں کے طرز عمل کو جائز قرار دیا لیکن سیٹھ صاحب کو اطمینان دلایا کہ اسٹیشن ماسٹر
کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ میرے حفاظت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچنے کا
انتظام کردے۔ عبداللہ سیٹھ نے میرتزبرگ کے ہندوستانی تاجروں کو اور اپنے
دوستوں کو جو دوسرے مقامات پر تھے تار دیدیئے کہ وہ مجھ سے ملیں اور میری

مدد کریں۔ تاجر مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے مجھے تسکین دینے کے بعد ان دقتوں کا ذکر کیا۔ جو انہیں پیش آچکی تھیں اور کہا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ جو ہندوستانی اول درجے میں یا دوسرے درجے میں سفر کرتے ہیں انہیں ریلوے کے ملازموں اور فرنگی مسافروں کی بدسلوکی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ سارا دن انہیں المناک داستانوں کے سننے میں گذر گیا۔ شام کی گاڑی آئی۔ میرے لئے ایک جگہ محفوظ کر لی گئی تھی۔ میرتیزبرگ میں میں نے بستر کا ٹکٹ جس کے لینے سے ڈربن میں انکار کیا تھا، خرید لیا اس گاڑی نے مجھے چارلس ٹاون تک پہنچایا۔

نواں باب

مزید تکلیفیں

چارلس ٹاؤن میں گاڑی صبح کو پہنچی۔ اس زمانے میں چارلس ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے درمیان ریل نہ تھی۔ بلکہ شکرم چلتی تھی جو رستے میں اسٹینڈرٹن کے مقام پر رات بھر ٹھہرتی تھی۔ میرے پاس شکرم کا ٹکٹ تھا جس کی میعاد میرے میرتزبرگ میں ایک دن ٹھہر جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ سیٹھ نے چارلس ٹاؤن کے ایجنٹ کو تار دے دیا تھا۔

مگر ایجنٹ مجھے ٹالنے کے لیے بہانا ڈھونڈھتا تھا اس لیے جب اس نے دیکھا کہ میں اجنبی ہوں تو مجھ سے کہا "تمہارا ٹکٹ تو بیکار ہو گیا ہے"۔ میں نے اسے وہی جواب دیا جو دینا چاہیے تھا۔ مگر جس خیال سے وہ ٹالنا چاہتا تھا وہ جگہ کی کمی نہ تھی بلکہ کچھ اور ہی بات تھی۔ مسافر شکرم کے اندر بٹھائے جاتے تھے۔ شکرم کا محافظ جو لیڈر کہلاتا تھا ایک گورا تھا۔ اس نے دیکھا کہ میں "قلی" ہوں اور اجنبی معلوم ہوتا ہوں اسلئے اس نے مجھے فرنگی مسافروں کے ساتھ بٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ کوچ بکس کے دونوں طرف بھی بیٹھنے کی جگہیں تھیں۔ لیڈر عموماً ان میں سے کسی جگہ پر بیٹھا کرتا تھا مگر آج وہ خود اندر بیٹھا اور مجھے اپنی جگہ پر بٹھایا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صریحی ناانصافی ہے اور اس میں میری توہین ہے مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے چپ چاپ برداشت کر لوں۔ زبردستی اندر گھس جانا میرے امکان میں نہ تھا اور اگر میں صدائے احتجاج بلند کرتا تو شکرم مجھے چھوڑ کر چلی جاتی، میرا ایک دن اور ضائع ہوتا اور دوسرے

دن خدا جانے کیا واقعہ پیش آتا۔ اس لئے اگرچہ میں اپنے دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر مصلحت اندیشی سے کام لیکر کوچبان کے پاس بیٹھ گیا۔

تین بجے کے قریب شکرم پارڈیکوپ پہنچی۔ اب لیڈر کو یہ سوجھی کہ میری جگہ پر بیٹھے کیونکہ اسے تمباکو پینے اور شاید تازہ ہوا کی خواہش تھی۔ اس لئے اس نے کوچبان سے ایک میلا سا ٹاٹ لیکر پیر رکھنے کے تختے پر بچھا دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "سامی تم اس پر بیٹھو۔ میں کوچبان کے پاس بیٹھوں گا۔" یہ اتنی بڑی ذلت تھی جسے میں کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اس سے کہا "تمہیں نے مجھے یہاں بٹھایا تھا حالانکہ میری جگہ اندر ہونا چاہئے تھی۔ میں نے یہ ذلت برداشت کرلی اب تمہارا جی باہر بیٹھ کر تمباکو پینے کو چاہتا ہے اس لئے تم مجھے اپنے پیروں کے پاس بٹھاتے ہو یہ تو میں نہیں کروں گا۔ البتہ اندر بیٹھنے کو تیار ہوں" جتنی دیر میں میں نے اٹک اٹک کر یہ الفاظ کہے وہ شخص میری طرف بڑھا اور اس نے میرے کانوں پر تان تان کر گھونسے لگانا شروع کئے۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچ کر نیچے اتارنا چاہا۔ میں نے پیتل کا کٹہرا جو کوچ بکس پر لگا تھا مضبوط پکڑ لیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ چاہے میری کہنی ٹوٹ جائے مگر اسے نہ چھوڑوں گا۔ مسافر یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ وہ شخص مجھے گالیاں دے رہا ہے، مجھے کھینچ رہا ہے، مار رہا ہے۔ اور میں خاموش ہوں۔ وہ طاقتور تھا اور میں کمزور تھا بعض مسافروں کو رحم آگیا اور انہوں نے چلا کر کہا "بھلے آدمی اس بیچارے کو چھوڑ دے اسے کیوں مار رہا ہے۔ یہ سچ تو کہتا ہے۔ اگر یہ وہاں نہیں بیٹھنا چاہتا تو اسے ہمارے پاس بیٹھ جانے دے"۔ اس نے گرج کر جواب دیا "ہرگز نہیں" مگر وہ کچھ سٹپٹایا اور اس نے مجھے مارنے سے ہاتھ روک لیا۔ پھر اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور مجھے دو چار گالیاں دے کر ہاٹینٹاٹ نوکر کو جو کوچ بکس کے دوسرے سرے پر بیٹھا تھا نیچے بٹھایا اور خود اس کی جگہ لے لی۔

سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، سیٹی بجی اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں دل میں کہتا تھا کہ دیکھئے منزل مقصود تک زندہ پہنچتا ہوں یا نہیں۔ وہ شخص مجھے کبھی کبھی قہر آلود نظر سے دیکھتا تھا اور انگلی سے میری طرف اشارہ کرکے کہتا تھا "خبردار سبھے اسٹینڈرٹن پہنچنے دو پھر میں تمہیں دکھادوں گا کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔"

جب ہم اسٹینڈرٹن پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ یہاں مجھے کچھ ہندوستانی صورتیں نظر آئیں اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میرے اترتے ہی یہ دوست میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا "ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ آپ کا استقبال کریں اور آپ کو عیسیٰ سیٹھ کے یہاں لے جائیں۔ ہمارے پاس دادا عبداللہ کا تار آیا تھا۔" میں بہت خوش ہوا اور ہم سب سیٹھ عیسیٰ حاجی سمرد کے یہاں پہنچے۔ سیٹھ اور انکے محرر میرے اردگرد جمع ہوگئے۔ میں نے انہیں اپنی ساری بپتا سنائی۔ انہیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اپنے تلخ تجربے مجھ سے بیان کئے۔

میں چاہتا تھا شکرم کمپنی کے ایجنٹ کو سارے واقعے کی اطلاع دوں۔ اس لئے میں نے انکے نام خط لکھا اور جو کچھ گذرا تفصیل سے بیان کرکے اسے محافظ کی دھمکی کی طرف توجہ دلائی۔ میں نے اس سے اس بات کا بھی اطمینان چاہا کہ جب شکرم دوسرے دن صبح کو روانہ ہوگی تو مجھے اندر دوسرے مسافروں کے ساتھ جگہ دیجائے گی۔ ایجنٹ کا یہ جواب آیا۔ "اسٹینڈرٹن سے بہت بڑی شکرم چلتی ہے جس کے محافظ دوسرے ہیں اور آپ کو اور مسافروں کے ساتھ ہی جگہ ملے گی۔" اس سے مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ ظاہر ہے کہ میرا ارادہ اس شخص پر جس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، دعوے کرنے کا نہ تھا اس لئے یہ واقعہ یہیں ختم ہوگیا۔

صبح کو عیسیٰ سیٹھ کے آدمی مجھے شکرم تک پہنچانے گئے۔ مجھے اچھی جگہ مل گئی۔

اور میں اسی روز رات کو خیریت سے جوہانسبرگ پہنچ گیا۔

اسٹینڈرٹن ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور جوہانسبرگ بڑا شہر ہے۔ عبداللہ سیٹھ نے جوہانسبرگ بھی تار دیدیا تھا اور مجھے محمد قاسم قمرالدین کی دوکان کا پتہ بتا دیا تھا۔ انکا آدمی مجھے لینے شکرم کے اڈے پر آیا تھا نہ میں نے اسے دیکھا اور نہ اس نے مجھے پہچانا۔ اس لئے میں نے کسی ہوٹل میں جانے کا قصد کیا۔ مجھے کئی ہوٹلوں کے نام معلوم تھے میں نے ایک کرایہ کی گاڑی لی اور کہا کہ گرانڈ نیشنل ہوٹل لے چلو۔ میں نے مینیجر سے مل کر کمرا مانگا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور تہذیب کے ساتھ یہ الفاظ کہہ کر "افسوس ہے ہمارے یہاں بالکل جگہ نہیں" رخصت کر دیا۔ اس لئے میں نے گاڑی والے سے محمد قاسم قمرالدین کی دوکان پر چلنے کو کہا۔ وہاں عبدالغنی سیٹھ میرا انتظار کر رہے تھے اور انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا۔ ہوٹل کا واقعہ سن کر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے "بھلا آپ کو ہوٹل میں جگہ کیسے مل سکتی تھی؟"

میں نے پوچھا "آخر کیوں نہیں؟"

انہوں نے کہا "جب چند روز یہاں رہیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا یہاں تو ہمیں لوگ رہ سکتے ہیں جو روپیہ کمانے کے لالچ میں ذلتیں سہتے ہیں پھر ہماری جو حالت ہے وہ آپ دیکھتے ہی ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے مجھ سے ان سختیوں کے واقعات بیان کئے جو ہندوستانیوں پر جنوبی افریقہ میں ہوتی تھیں۔ ان سیٹھ صاحب کا آگے چل کر مفصل ذکر آئے گا۔

انہوں نے کہا "یہ ملک آپ جیسے لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ دیکھئے اب آپ کو پریٹوریا جانا ہے۔ آپ کو تیسرے درجے میں سفر کرنا پڑے گا۔ ٹرانسوال کی حالت نٹال سے بھی بدتر ہے۔ پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ ہندوستانیوں کو کبھی نہیں دئے جاتے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں نے اس کے لئے جم کر کوشش نہیں کی"

"ہم نے عرضداشتیں بھیجیں لیکن سچ پوچھئے تو ہم لوگ خود عام طور پر پہلے اور دوسرے درجے میں سفر نہیں چاہتے"

میں نے ریلوے کے ضوابط منگوائے اور انہیں پڑھا۔ ایک جگہ کچھ گنجائش نظر آئی۔ ٹرانسوال کے پرانے قوانین کی زبان ابہام اور گنجلک سے خالی نہ تھی۔ اور ریلوے کے ضوابط کی زبان تو اور بھی ناقص تھی۔

میں نے سیٹھ صاحب سے کہا: میں تو اول درجے میں جانا چاہتا ہوں اور اگر یہ ممکن نہیں تو میں گھوڑے کی گاڑی میں جانا زیادہ پسند کرونگا۔ یہاں سے پریٹوریا کل ۳۷ ہی میل تو ہے۔"

سیٹھ عبدالغنی نے مجھے سمجھایا کہ اس میں بہت دیر لگے گی اور بڑا خرچ ہوگا۔ البتہ وہ اس پر راضی ہوگئے کہ میں اول درجے میں سفر کروں۔ چنانچہ میں نے اسٹیشن ماسٹر کے نام ایک رقعہ بھیجا۔ میں نے لکھا کہ میں بیرسٹر ہوں اور ہمیشہ اول درجے میں سفر کرتا ہوں مجھے جلد سے جلد پریٹوریا پہنچنا ہے اس لئے اتنا وقت نہیں کہ جواب کا انتظار کیا جائے میں خود اسٹیشن آکر جواب لوں گا اور امید ہے کہ مجھے اول درجے کا ٹکٹ مل جائیگا۔ ظاہر ہے کہ خود جاکر جواب لینے میں خاص مقصد مدنظر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اسٹیشن ماسٹر نے تحریری جواب بھیجا تو وہ یقیناً انکار کرے گا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس کے ذہن میں "قلی بیرسٹر" کا تصور کچھ اور ہی ہوگا اس لئے میں نے سوچا کہ میں مکمل انگریزی وضع میں جاکر اس سے باتیں کروں تو ممکن ہے وہ ٹکٹ دیدے۔ اس لئے میں فراک کوٹ پہن کر اور نکٹائی لگا کر اسٹیشن گیا اور ٹکٹ گھر کے تختے پر کرائے کی ایک گنی رکھ کر میں نے اول درجے کا ٹکٹ مانگا۔

اس نے پوچھا: "تمہیں نے مجھے رقعہ بھیجا تھا"

"جی ہاں آپ ٹکٹ دیدیں تو بڑی مہربانی ہو۔ مجھے آج پرٹیوریا پہنچنا ضروری ہے" وہ مسکرایا اور ہمدردی سے کہنے لگا "میں ٹرانسوال کا رہنے والا نہیں بلکہ ہالنڈنی[1] ہوں میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور آپ سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ میں آپ کو ٹکٹ ضرور دوں گا۔ مگر ایک شرط پر کہ اگر گارڈ آپ کو اتار کر تیسرے درجے میں بٹھائے تو آپ مجھے اس جھگڑے میں نہ کھینچیں یعنی ریلوے کمپنی پر دعوے نہ کریں اچھا خدا حافظ۔ آپ کی صورت سے ظاہر ہے کہ آپ شریف آدمی ہیں"

یہ کہہ کر اس نے ٹکٹ دے دیا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جو بات وہ چاہتا تھا اس کی طرف سے اطمینان دلایا۔

سیٹھ عبدالغنی مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ مجھے اول درجے کا ٹکٹ مل گیا بہت تعجب ہوا مگر انہوں نے مجھے متنبہ کرنے کے لئے کہا "خدا ہی ہے جو تم خیریت سے پرٹیوریا پہنچ جاؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ گارڈ تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دے گا اور اگر اس نے نہ بھی چھیڑا تو مسافر دق کریں گے"

میں اول درجے کے ڈبے میں بیٹھا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ جرمسٹن میں گارڈ ٹکٹ دیکھنے آیا۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر جھنجھلایا اور انگلی سے اشارہ کرنے لگا۔ کہ تیسرے درجے میں جا کر بیٹھو۔ میں نے اسے اپنا اول درجے کا ٹکٹ دکھایا۔ اس نے کہا "اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ جاؤ تیسرے درجے میں بیٹھو"

ڈبے میں صرف ایک انگریز مسافر تھا۔ اس نے گارڈ کی خبر لی "تم کیوں

---

(۱) ہالینڈ کا رہنے والا، ڈچ۔

ایک شریف آدمی کو دق کر رہے ہو دیکھتے نہیں کہ ان کے پاس اول درجے کا ٹکٹ ہے ۔ مجھے ان کے ساتھ سفر کرنے میں مطلق اعتراض نہیں“ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

” آپ اطمینان سے یہیں بیٹھئے “

گارڈ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ” اگر تم قلی کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ میرا کون سا ہرج ہے “

شام کو آٹھ بجے گاڑی پریتھوریا پہنچی ۔

دسواں باب

پریٹوریا میں پہلا دن

مجھے امید تھی کہ پریٹوریا کے اسٹیشن پر دادا عبداللہ کے وکیل کی طرف سے کوئی شخص لینے آئے گا۔ میں جانتا تھا کہ کوئی ہندوستانی میرے استقبال کے لئے موجود نہ ہوگا کیونکہ میں نے پکا وعدہ کر لیا تھا کہ کسی ہندوستانی کے یہاں نہیں ٹھہروں گا لیکن وکیل نے کسی کو نہیں بھیجا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اتوار کے سبب سے کسی شخص کے آنے میں بڑی زحمت ہوتی۔ میں بہت پریشان تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی ہوٹل مجھے نہیں لے گا۔

۱۸۹۳ء میں پریٹوریا کے اسٹیشن کی وہ حالت نہیں تھی جو ۱۹۱۴ء میں تھی ایک آدھ لیمپ ٹمٹما رہا تھا اور اکا دکا مسافر نظر آتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اور سب مسافر چلے جائیں اور ٹکٹ کلکٹر خالی ہو تو میں اپنا ٹکٹ دوں اور اس سے پوچھوں کہ اسے کوئی چھوٹا سا ہوٹل یا کوئی اور جگہ معلوم ہے جہاں میں رات کو ٹھہر سکوں۔ اگر وہ بتا دے تو اچھا ہے ورنہ پھر اسٹیشن ہی پر رات گذاروں۔ مگر سچ پوچھئے تو مجھے اس سے اتنی سی بات دریافت کرنے میں بھی جھجک تھی کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اسٹیشن مسافروں سے خالی ہو گیا۔ میں نے ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دیا اور اس سے جو سوالات کرنا تھے کئے۔ اس نے تہذیب سے جواب دیا مگر معلوم ہوا کہ اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ البتہ ایک امریکی حبشی جو پاس کھڑا تھا مجھ سے کہنے لگا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں بالکل اجنبی ہیں آپ کے کوئی ملاقاتی نہیں

آپ میرے ساتھ آیئے تو آپ کو ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے چلوں اُس کا مالک ایک امریکی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے خیال میں وہ آپ کو ٹھہرالے گا۔"
مجھے اس میں شبہ تھا لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اُس کی رائے مان لی وہ مجھے جانسٹن کے فیملی ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مسٹر جانسٹن کو الگ لیجاکر باتیں کیں۔ وہ مجھے اس شرط پر رات بھر ٹھہرانے کے لئے تیار ہوگئے کہ میں کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں۔

انہوں نے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل رنگ کے تعصب سے خالی ہے لیکن میرے گاہک سب فرنگی ہیں اور اگر میں آپکو کھانے کے کمرے میں بیٹھنے دوں تو ممکن ہے کہ وہ خفا ہوجائیں بلکہ اٹھ کر چلے جائیں۔"
میں نے کہا "میں تو آپ کی اسی عنایت کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے رات بھر ٹھہرالیا۔ اب مجھے یہاں کے حالات سے کم وبیش واقفیت ہوگئی ہے اور میں آپ کی مشکلوں کو سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے کمرے ہی پر کھانا بھیجدیجئے کیا مضائقہ ہے۔ امید ہے کہ کل میں کوئی اور انتظام کرلوں گا۔"
میں اپنے کمرے میں پہنچادیا گیا اور وہاں بیٹھکر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں بالکل تنہا تھا اور اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوٹل میں زیادہ مہمان نہیں تھے اور مجھے امید تھی کہ بیرا تھوڑی دیر میں کھانا لے آئے گا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اس کے بجائے خود مسٹر جانسٹن چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "مجھے شرم آئی کہ میں نے آپ سے یہاں کھانا کھانے کو کہا۔ اس لئے میں نے جاکر اور مہمانوں سے پوچھا کہ اگر ہندوستانی مہمان کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر کھائیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہماری طرف سے وہ شوق سے جب تک جی چاہے اس ہوٹل میں رہیں۔ اس لئے اگر آپ مناسب سمجھئے تو کھانے کے کمرے میں تشریف

لے چلئے اور جب تک مرضی ہو یہاں قیام کیجئے۔

میں نے پھر انکا شکریہ ادا کیا اور کھانے کے کمرے میں جاکر خوب اطمینان سے کھانا کھایا۔ دوسرے دن صبح کو میں عبداللہ سیٹھ کے وکیل اے۔ ڈبلیو۔ بیکر سے ملا۔ سیٹھ صاحب کی گفتگو سے مجھے انکی طبیعت کا تھوڑا بہت اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لئے انکے گرمجوشی سے ملنے پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دوستانہ مزاج پرسی کی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں کس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا "بیرسٹر کی حیثیت سے آپ کے لئے کوئی کام نہیں ہے کیونکہ ہم نے بہترین بیرسٹر کو کرلیا ہے۔ مگر مقدمہ عرصے سے چل رہا ہے اور اس میں بڑی پیچیدگیاں ہیں اس لئے بہت سے واقعات معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں میں آپ سے مدد لوں گا۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کے سبب سے مجھے اپنے موکل سے خط و کتابت کرنے میں آسانی ہوگی کیونکہ مجھے ان سے جو کچھ پوچھنا ہوگا آپ ہی کے توسط سے پوچھوں گا۔ آپ کے آنے سے یہ بڑا فائدہ ہوا۔ میں نے ابھی تک آپ کے لئے کمرے نہیں لئے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ پہلے آپ سے ملاقات ہوجائے۔ اس کے بعد اس کا انتظام کرلوں گا۔ یہاں رنگ کے تعصب کی بڑی شدت ہے۔ اس سبب سے آپ جیسے آدمی کے لئے مکان ملنا بہت مشکل ہے۔ مگر میری نظر میں ایک غریب عورت کا مکان ہے اس کا شوہر ڈبل روٹی بیچتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو اپنے یہاں ٹھہرالے گی۔ اس سے اس کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہوجائے گا۔ آئیے اس کے یہاں چلیں"

وہ مجھے لیکر اس عورت کے یہاں گئے۔ انہوں نے اس سے علیحدہ گفتگو کی اور وہ مجھے ساڑھے تین شلنگ ہفتہ وار پر اپنے یہاں رکھنے پر راضی ہوگئی۔

مسٹر بیکر اپنے پیشے کے کام کے علاوہ بڑے جوش اور انہماک سے وعظ بھی کہا کرتے تھے۔ وہ ابھی زندہ ہیں اور اب وکالت چھوڑ کر محض تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔

انکی مالی حالت اچھی ہے میرے اُنکے درمیان ابتک خط وکتابت جاری ہے - انکے خطوں کا ہمیشہ ایک ہی موضوع ہوتا ہے - وہ مختلف پہلوؤں سے مذہب عیسوی کی فضیلت ثابت کرتے ہیں اور انکا دعوٰی ہے کہ جب تک انسان مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا اور نوع انسانی کا نجات دہندہ نہ مانے اُسے ابدی تسکین نصیب ہونا ناممکن ہے -

پہلی ہی ملاقات میں مسٹر بیکر نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا مذہبی عقیدہ کیا ہے - میں نے کہا " میں ہندو دھرم پر پیدا ہوا لیکن مجھے اس مذہب سے بہت کم واقفیت ہے اور دوسرے مذہبوں سے اتنی بھی نہیں - سچ پوچھئے تو مجھے خود اپنے حال کی خبر نہیں - مجھے نہیں معلوم کہ میرا عقیدہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے - میرا ارادہ ہے کہ اپنے مذہب کا گہرا مطالعہ کروں اور جہانتک ہو سکے دوسرے مذہبوں کا بھی "

مسٹر بیکر یہ بات سنکر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے " میں جنوبی افریقہ کی جنرل مشن کے ڈائرکٹروں میں سے ہوں - میں نے اپنے خرچ سے ایک گرجا بنوایا ہے اور اس میں پابندی سے وعظ کہا کرتا ہوں - میرا دل رنگ کے تعصب سے پاک ہے - میرے چند رفیق ہیں اور ہم سب روز ایک بجے چند منٹ کے لئے جمع ہوتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں تسکین اور ہدایت نصیب ہو - اگر آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوا کریں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی - میں آپ کو اپنے رفیقوں سے ملواؤں گا - وہ آپ کو دیکھکر بہت خوش ہونگے اور امید کہ آپ کو بھی ان کی صحبت پسند آئے گی - اس کے علاوہ میں آپ کو چند مذہبی کتابیں پڑھنے کے لئے دوں گا اور سب کتابوں کی سرتاج تو مقدس بائبل ہے جس کی تلاوت کی میں آپ کو خاص طور پر تاکید کرتا ہوں -

میں نے مسٹر بیکر کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ ایک بجے کی عبادت میں جہاں تک ہو سکے گا پابندی سے شریک ہوا کروں گا -

مسٹر بیکر نے کہا " تو میں کل ایک بجے اسی جگہ آپ کا انتظار کروں گا اور ہم

رہ جائیں گے۔" اور ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

میرے پاس ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

میں مسٹر جانسٹن کے یہاں پہنچا، ان کا بل ادا کیا اور اپنے نئے مکان میں جا کر دیر جگہ لے لی/گھر بنا لیا۔ مالکہ مکان بڑی نیک عورت تھی۔ اس نے میرے لئے سبزی کھانا پکایا تھا۔ مجھے اس خاندان کے لوگوں سے بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگی۔

اس کے بعد میں اس دوست سے ملنے گیا جن کے نام دادا عبداللہ نے رقعہ دیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو کیا کیا سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میرے ساتھ ٹھہرو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں پہلے ہی انتظام کر چکا ہوں۔ انہوں نے بہت اصرار سے کہا کہ جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لینا۔

اب شام ہو گئی تھی۔ میں نے گھر آ کر کھانا کھایا اور خیالات میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ابھی کچھ میرے لئے کوئی کام نہ تھا۔ میں نے عبداللہ سیٹھ کو اس کی اطلاع دے دی۔ میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر بیکر کو مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ مجھے ان کے دیندار رفیقوں سے مل کر کیا فائدہ ہوگا؟ میرے لئے عیسائی مذہب کا مطالعہ کرنا کہاں تک اچھا ہے؟ ہندو دھرم کے متعلق کتابیں کہاں سے ملیں؟ اور جب تک میں خود اپنے مذہب سے اچھی طرح واقف نہ ہو جاؤں عیسائیت کا صحیح اندازہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے ہر چیز پر جو میرے سامنے آئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور مسٹر بیکر کے حلقے کے لوگ جو سوالات کریں ان کا جواب دینے کے لئے خدا کی ہدایت کا منتظر رہنا چاہئے۔ جب تک میں اپنے مذہب کو اچھی طرح نہ سمجھ لوں کسی دوسرے مذہب کے اختیار کرنے کا خیال دل میں لانا مناسب نہیں ہے۔

یہ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

گیارہواں باب

عیسائیوں کی صحبت

دوسرے دن ایک بجے میں مسٹر بیکر کی عبادت کی صحبت میں گیا۔ وہاں مجھے مس ہیرس، مس گیب اور مسٹر کوٹس وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ہر شخص دعا مانگنے کے لئے دوزانو ہوگیا۔ میں نے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی یہی کیا۔ دعا میں ہر شخص اپنی اپنی خواہش کے مطابق خدا سے مختلف چیزوں کی التجا کرتا تھا۔ مثلاً عام طور پر لوگ اس طرح کی دعا مانگتے تھے کہ دن امن وعافیت سے گذر جائے یا خدا ہمارے دل کے دروازے کھول دے۔ اب ایک نئی دعا میری فلاح کے لئے مانگی جانے لگی "اے مالک ہمارے نئے بھائی کو جو ہمارے درمیان آیا ہے اپنی راہ دکھادے۔ اسے بھی اے مالک وہ تسکین عطا کر جو تونے ہمیں بخشی ہے۔ یسوع مسیح جس نے ہمیں نجات دی ہے اسے بھی نجات دے۔ اے خدا تجھے واسطہ یسوع کا"۔ ان صحبتوں میں مناجاتیں نہیں گائی جاتی تھیں بلکہ کسی قسم کا گانا بجانا نہیں ہوتا تھا۔ روز کسی خاص چیز کی دعا مانگنے کے بعد ہم سب منتشر ہو جاتے تھے اور اپنے اپنے گھر جاکر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ دعا میں پانچ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے۔

مس ہیرس اور مس گیب دونوں مسن کنواری خاتونیں تھیں۔ مسٹر کوٹس کوئیکر(۱) تھے۔ یہ دونوں خاتونیں ساتھ رہتی تھیں اور انہوں نے مجھے مستقل دعوت دی کہ

---

(۱) عیسائیوں کا ایک فرقہ جو زیادہ تر امریکا میں پایا جاتا ہے۔

ہر اتوار کو انکے یہاں جائے پیا کروں۔

جب ہم سب لوگ اتوار کے دن جمع ہوتے تھے تو میں مسٹر کوٹس کو اپنا ہفتہ بھر کا مذہبی روزنامچہ دے دیتا تھا اور میں نے اس عرصے میں جو مذہبی کتابیں پڑھی تھیں اور انکے جو اثرات مجھ پر ہوئے تھے انکے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا۔ دونوں خاتونیں اپنے پاک تجربے بیان کیا کرتی تھیں اور جو تسکین قلب انہیں حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتی تھیں مسٹر کوٹس ایک صاف دل راسخ العقیدہ نوجوان تھے۔ ہم دونوں ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے اور وہ مجھے دوسرے عیسائی دوستوں کے یہاں بھی لے جاتے تھے

جب مجھ میں اور ان میں زیادہ گہری دوستی ہو گئی تو وہ مجھے اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لئے دینے لگے یہاں تک کہ میری الماری ان کتابوں سے بھر گئی۔ میں بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور جو کچھ میں پڑھتا تھا اس پر ہم دونوں میں بحث ہوا کرتی تھی۔

سنہ ۱۸۹۳ء میں میں نے اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ مجھے ان سب کے نام یاد نہیں مگر ان میں سٹی ٹمپل کے ڈاکٹر پارکر کی "تفسیر" پیرسن کی "بہت سے قطعی ثبوت"[1] اور بٹلر کی "قیاسات"[2] بھی تھیں۔ انکے بعض حصے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بعض باتیں مجھے پسند آئیں اور بعض ناپسند ہوئیں "بہت سے قطعی ثبوت" میں انجیل کی مذہب کی، حیثیت سے کہ مصنف نے اسے سمجھا ہے، حمایت کی گئی ہے۔ اس کتاب نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ پارکر کی "تفسیر" اخلاقی احساس کو ابھارنے والی کتاب ہے لیکن ایک ایسے شخص کو جو عیسائی مذہب کے رسمی عقائد کا قائل نہیں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ بٹلر کی "قیاسات" میں مجھے بہت دقتیں اور مشکل

---

(1) Many Infallible (2) Analogy

کتاب معلوم ہوئی جس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے چار پانچ بار پڑھنا ضروری ہے میرے خیال میں یہ دہریوں کو خدا پرست بنانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں خدا کے وجود کی دلیلیں جو دی گئی ہیں وہ میرے لئے غیر ضروری تھیں کیونکہ میں الحاد کی منزل سے گذر چکا تھا۔ لیکن جن دلیلوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خدا نے صرف عیسیٰ ہی کے جسم میں حلول کیا تھا اور وہ خدا کے دربار میں بندوں کے شفیع ہیں، انکا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

لیکن مسٹر کوٹس آسانی سے ہار ماننے والے آدمی نہ تھے۔ انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے میرے گلے میں تلسی کے دانوں کا کنٹھا دیکھا جو وشنو مذہب کی علامت ہے۔ وہ اسے ضعیف الاعتقادی سمجھے۔ جس سے انہیں بہت دکھ ہوا۔

"یہ ضعیف الاعتقادی تمہیں زیب نہیں دیتی ادھر آؤ میں اسے توڑ ڈالوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میری ماں کا دیا ہوا تبرک ہے۔"

"مگر کیا تم اس پر عقیدہ رکھتے ہو؟"

"میں اس کے بھید کو نہیں جانتا۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ اس کو نہ پہننے سے مجھ کوئی نقصان پہنچے گا۔ لیکن جو کنٹھا میری ماں نے مجھے بڑی محبت سے یہ سمجھ کر پہنایا ہے کہ میرے لئے باعث برکت ہو گا اسے میں بلا وجہ نہیں اتار سکتا۔ جب یہ دن گزرتے گھستے گھستے خود بخود ٹوٹ جائے گا تو میں دوسرا نہیں پہنوں گا مگر اسے تو ہر گز نہیں توڑوں گا۔"

مسٹر کوٹس میری دلیل کو نہیں سمجھے کیونکہ انکی نظر میں میرے مذہب کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ انہیں آرزو تھی کہ خدا وہ دن دکھائے کہ جب وہ مجھے جہالت کے گڑھے سے نکالیں۔ وہ مجھے یقین دلانا چاہتے تھے کہ چاہے دوسرے مذہبوں میں بھی حق کی جھلک ہو لیکن کامل حق صرف مذہب عیسوی میں ہے۔ اسے قبول

کے بغیر میری نجات ناممکن ہے۔ جب تک مسیح کی شفاعت نہ ہو میرے گناہ نہیں بخشے جائیں گے اور میرے نیک اعمال کسی کام نہ آئیں گے۔

جس طرح انہوں نے مجھے متعدد دینی کتابوں کی طرف توجہ دلائی اسی طرح متعدد دوستوں سے بھی جو انکے نزدیک پکے عیسائی تھے، ملوایا۔ ان میں سے ایک خاندان اُس عیسائی فرقے سے تعلق رکھتا تھا جسے پلیمتھ(۱) برادری کہتے ہیں۔

جن عیسائیوں سے میں مسٹر کوٹس کی معرفت ملا اُن میں سے بہت سے نیک لوگ تھے اکثر کو میں نے پرہیزگار پایا لیکن اس خاندان کے ایک پلیمتھ برادر نے ایک بار ایسی دلیل پیش کی جسے سن کر میں حیران رہ گیا:

"آپ ہمارے مذہب کی خوبی کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عمر بھر اپنی لغزشوں کی فکر میں الجھے رہتے ہیں، ہر وقت ان کی اصلاح اور تلافی کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بھلا عمل کے ابدی "دور" میں پڑ کر آپ کی نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس طرح تو آپ کو کبھی سکون قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اعتراف ہے کہ ہم سب گنہگار ہیں۔ اب دیکھئے ہمارا عقیدہ کتنا مکمل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اپنی برائیوں کی اصلاح اور تلافی کی سعی لاحاصل ہے۔ اور گناہوں کا کفارہ ضروری ہے۔ ہم میں یہ طاقت کہاں کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں؟ بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ ہم یہ بوجھ مسیح کے سر ڈال دیں۔ وہ خدا کا معصوم اکلوتا بیٹا ہے اس نے کہا ہے کہ جو مجھ پر عقیدہ رکھتا ہے اسے ابدی زندگی نصیب ہو گی۔ یہ خدا کا رحم و کرم ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسیح نے ہماری طرف سے کفارہ دیدیا

(۱) پلیمتھ انگلستان کے جنوب مغرب میں ایک بندرگاہ ہے یہ فرقہ اسی مقام سے منسوب ہے۔

اسلئے ہمارے گناہ ہماری نجات کو نہیں روک سکتے۔ گناہ تو ہماری سرشت میں ہے۔ کون ہے جو اس دنیا میں گناہ سے پاک رہ سکے؟ اسی لئے مسیح نے ایذائیں اٹھائیں اور سارے انسانوں کے گناہوں کی تلافی کر دی۔ صرف اسی شخص کو جو اس کفارہ عظیم پر ایمان لائے ابدی سکون نصیب ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچئے تو کہ آپ کی زندگی کیسی بے چینی کی ہے اور ہمیں کیسی امن و عافیت کی بشارت دی گئی ہے۔"

اس دلیل سے مجھے مطلق تشفی نہیں ہوئی اور میں نے عاجزی سے کہا:۔

"اگر یہی عیسائیت ہے جسے سب عیسائی مانتے ہیں تو میں اسے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ میں گناہ کے عذاب سے نجات نہیں چاہتا۔ مجھے تو خود گناہ سے بلکہ اس کے خیال سے نجات کی جستجو ہے۔ جبتک میں یہ مقصد حاصل کر لوں اسوقت بے چین رہنا مجھے قبول ہے۔"

پلیمتھ برادر نے جواب دیا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ میں نے جو کہا ہے اس پر غور کیجئے۔"

اور اس بزرگ نے جو کہا تھا وہ کر بھی دکھایا۔ وہ خاص کر کے برے کام کرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے دیکھو میرے سکون قلب میں خلل نہیں پڑا۔

مگر مجھے ان دوستوں سے ملنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ سب عیسائی کفارے کے نظریے کے قائل نہیں ہیں۔ خود مسٹر کوٹس کی زندگی متقیانہ تھی۔ انکا دل پاک تھا اور وہ تزکیہ نفس کے امکان کو مانتے تھے۔ دونوں خاتونیں بھی یہی عقیدہ رکھتی ہیں۔ عیسائی مذہب کی جو کتابیں میرے ہاتھ آئیں ان میں سے بعض محبت اور معرفت الٰہی سے مالا مال تھیں۔ اس لئے اگرچہ کوٹس کو میرے اس نئے تجربے سے بہت تشویش ہوئی ہوئی مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ کسی پلیمتھ برادر کے بگڑے ہوئے عقیدے کی وجہ سے میں عیسائیت سے بدظن نہیں ہو سکتا۔

میری مشکلیں اور تھیں۔ یہ بائبل سے اور اس کی مروجہ تفسیر سے متعلق تھیں۔

بارھواں باب

ہندوستانیوں سے ملاقات کی کوشش

قبل اس کے کہ میں عیسائیوں کی صحبت کے مزید حالات بیان کروں مجھے اس زمانے کے اور تجربے بھی بیان کردینا چاہئے۔

سیٹھ طیب حاجی خان محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی۔ کوئی عام تحریک بغیر انکے نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہفتے ان سے واقفیت پیدا کرلی اور ان سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا کہ پریٹوریا میں جتنے ہندوستانی ہیں میں ان سب سے ملوں گا۔ میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حالات تحقیق کروں اور ان سے اس بارے میں مدد چاہی۔ انہوں نے بڑی خوشی سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کرکے ایک تقریر کروں جس سے انہیں یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں انکا کیا حال ہے۔ یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد حاجی جوسب(۱) کے یہاں ہوا۔ جن کے نام میں تعارف کا خط لایا تھا۔ اس میں زیادہ تر میمن تاجر تھے مگر اکا دکا ہندو بھی نظر آتے تھے۔ اصل میں پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم تھی۔

میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ساری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جاسکتی

---

(۱) غالباً یوسف کی خرابی ہے۔

ہے۔ اس کا عنوان تھا "کاروبار میں سچائی سے کام لینا"۔ میں اچھی طرح تیار ہو کر گیا تھا۔ میں نے ہمیشہ تاجروں کو یہ کہتے سنا تھا کہ کاروبار میں سچائی سے کام نہیں چلتا۔ میں اس بات کو نہ اس زمانے میں مانتا تھا نہ اب مانتا ہوں۔ اب بھی بعض تاجر دوستوں کا خیال ہے کہ سچائی اور کاروبار یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کاروبار عملی چیز ہے اور سچائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور عملی امور کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ انکے نزدیک خالص حق کا تو کاروبار میں نام بھی نہ لینا چاہئے۔ البتہ ایک مناسب حد تک سچائی شاید برتی جا سکے۔ میں نے اپنی تقریر میں اس خیال کی سختی سے مخالفت کی اور تاجروں کے دل میں اُنکے دُہرے فرض کے احساس کو ابھارا۔ میں نے کہا غیر ملک میں رہ کر ہم پر سچائی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہاں کے لوگ ہم چند ہندوستانیوں کے طرز عمل کو دیکھکر ہمارے کروروں ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔

میں نے دیکھا تھا کہ ہماری قوم کے لوگ انگریزوں کے مقابلے میں جن کے درمیان وہ رہتے ہیں میلے اور حفظان صحت کے اصولوں سے بے پروا ہیں۔ میں نے انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے علاوہ اس بات پر زور دیا کہ ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، پنجابی، سندھی، کچھی، سورتی وغیرہ کا امتیاز مٹا دینا چاہئے۔

آخر میں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک انجمن قائم کیجائے جس کے ذریعے سے ہندوستانی باشندے اپنی تکلیفوں کی شکایت حکام تک پہنچا سکیں اور یہ وعدہ کیا کہ جہانتک ممکن ہو میں اپنا وقت اس انجمن کی خدمت میں صرف کیا کرونگا۔

مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میری تقریر کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔

اس تقریر کے بعد بحث شروع ہوئی۔ بعض لوگوں نے وعدہ کیا کہ مجھے معلومات بہم پہنچانے میں مدد دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ حاضرین میں سے بہت کم لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ چونکہ میرا خیال تھا کہ انگریزی جاننا اس ملک میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

اس ملنے میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ جسے فرصت ہو وہ انگریزی ضرور سیکھے ۔ میں نے ان سے کہا کہ بڑی عمر میں بھی آدمی نئی زبان سیکھ سکتا ہے ۔ اور اس کی بہت سی مثالیں پیش کیں اس کے علاوہ میں نے اس کا ذمہ لیا کہ اگر کوئی کلاس کھولا جائے تو میں اس میں پڑھاؤنگا یا جن لوگوں کو پڑھنے کا شوق ہے انہیں الگ الگ پڑھاؤں گا ۔

کلاس تو نہیں کھلا مگر تین نوجوان اس پر راضی ہوئے کہ فرصت کے وقت پڑھا کریں گے بہ شرطیکہ میں انکے گھر جاکر پڑھاؤں ۔ ان میں سے دو مسلمان تھے ۔ ایک حجام اور ایک محرر اور تیسرا ہندو تھا جس کی چھوٹی سی دوکان تھی میں نے منظور کر لیا کہ جو وقت انکے لئے مناسب ہوگا اس میں انہیں جاکر پڑھایا کروں گا ۔ مجھے اپنی پڑھانے کی قابلیت میں ذرا بھی شبہہ نہ تھا ۔ میرے شاگرد چاہے تھک جائیں مگر میں کبھی نہ تھکتا تھا بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ میں انکے گھر پہنچ کر انہیں کاروبار میں مصروف پاتا تھا ۔ مگر میں صبر کو ہاتھ سے نہ دیتا ۔ تینوں میں سے کسی کو انگریزی سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی مگر دو نے آٹھ مہینے میں اچھی خاصی ترقی کر لی ۔ ان دونوں نے حساب کتاب رکھنا اور معمولی کاروباری خط لکھنا سیکھ لیا ۔ حجام کا حوصلہ بس اس حد تک تھا کہ گاہکوں سے بات چیت کرنے کی انگریزی آجائے ۔ میرے شاگردوں میں سے دو کو پڑھنے سے یہ فائدہ ہوا کہ انکی آمدنی میں معقول اضافہ ہوگیا ۔

میں جلسے کے نتیجے سے مطمئن تھا ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے ہوا کہ اس قسم کے جلسے مہینے میں ایک بار ہوا کریں ۔ یہ جلسے کم و بیش پابندی سے ہوتے تھے اور ان میں آزادی سے تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پریٹوریا میں کوئی ہندوستانی ایسا نہ تھا جس سے مجھ سے ملاقات نہ ہوا اور جس کے حالات مجھے نہ معلوم ہوں ۔ اب میں نے مناسب سمجھا کہ مسٹر جیکوبس ڈی ویٹ سے جو پریٹوریا میں برطانوی ایجنٹ تھے ملوں ۔ انہیں ہندوستانیوں سے ہمدردی

تھی۔ مگر انکا اثر بہت کم تھا۔ بہر حال وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جہاں تک ہو سکے گا ہماری مدد کریں گے اور مجھے دعوت دی کہ جب ضرورت ہو مجھ سے آکر مل لیا کرو۔

اب میں نے ریلوے حکام سے خط و کتابت کی اور انہیں یہ بتایا کہ جو پابندیاں ہندوستانیوں پر عائد کیجاتی ہیں وہ خود انکے قواعد کی رو سے جائز قرار نہیں پا سکتیں۔ مجھے یہ جواب ملا کہ جو ہندوستانی معقول لباس پہنے ہوں انہیں پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ ملا کریں گے۔ اس سے ہماری دقت رفع نہیں ہوئی کیونکہ معقول لباس کا فیصلہ کرنا تو اسٹیشن ماسٹر کے اختیار میں تھا۔

برطانوی ایجنٹ نے مجھے ہندوستانیوں کے متعلق کچھ کاغذات دکھائے طیب سیٹھ نے بھی مجھے اسی قسم کے کاغذات دیے تھے۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی کس بیرحمی سے آرینج فری اسٹیٹ سے نکالے جا رہے ہیں۔

پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرانسوال اور آرینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ مطالعہ میرے لئے آگے چل کر اس قدر مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ میرا خیال تھا سال کے آخر تک بلکہ اگر مقدمہ جلد ختم ہو گیا تو اس سے بھی پہلے ہندوستان واپس جاؤنگا۔ مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی۔

تیرھواں باب

قلیوں کی دُرگت

یہاں ٹرانسوال اور آرینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی حالت تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں۔ جو لوگ اس سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں وہ میری کتاب ”جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ“ پڑھیں۔ البتہ اسکا کچھ مختصر سا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

آرینج فری اسٹیٹ میں ہندوستانی ایک خاص قانون کے ذریعے سے جو ۱۸۸۸ء میں بلکہ اس سے بھی پہلے پاس ہوا تھا، کل حقوق سے محروم کئے جا چکے تھے۔ اب انکے وہاں رہنے کی صرف یہی صورت تھی کہ ہوٹلوں میں بیرے بن کر رہیں یا اور اسی قسم کے ادنیٰ پیشے اختیار کریں۔ تاجر برائے نام ہرجانہ دے کر نکال دئے گئے تھے۔ انہوں نے عرضیاں دیں، وفد بھیجے مگر کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔

ٹرانسوال میں ۱۸۸۵ء میں ایک بڑا سخت قانون پاس ہوا۔ ۱۸۸۶ء میں اس میں کچھ خفیف سی ترمیم ہوئی جس کی رو سے ہندوستانیوں کو ٹرانسوال میں داخل ہونے کے لئے تین پونڈ محصول دینا پڑتا تھا۔ انہیں سوائے بعض علاقوں کے جو انکے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے، کہیں زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور ان علاقوں میں بھی اراضی عملاً انکی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ انہیں ووٹ دینے کا حق نہ تھا۔ وہ قانون جس میں یہ سب قیدیں لگائی گئی تھیں خاص ایشیا کے باشندوں کے لئے تھا، اس کے علاوہ ان لوگوں پر وہ قوانین بھی عائد ہوتے تھے جو غیر سفید اقوام کے خلاف وضع

کئے گئے تھے۔ انکی رو سے ہندوستانیوں کو سڑک کے کنارے کی پٹری پر چلنے کی ممانعت تھی اور رات کو نو بجے کے بعد بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکلنے پاتے تھے۔ اس ضابطے کی عملدرآمد میں ہندوستانیوں کے ساتھ نرمی اور سختی دونوں کی گنجایش تھی۔ جو لوگ "عرب" سمجھے جاتے تھے وہ رعایتاً اس سے مستثنیٰ تھے۔ اب یہ پولیس کی مرضی پر موقوف تھا کہ جسے چاہے مستثنیٰ کرے۔

مجھے خود ان دونوں ضابطوں سے سابقہ پڑا۔ میں رات کو اکثر مسٹر کوٹس کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتا تھا اور ہم دونوں عموماً دس بجے کے قریب واپس آتے تھے۔ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پولیس مجھے گرفتار نہ کرلے۔ مسٹر کوٹس کو اس معاملے میں مجھ سے زیادہ تشویش تھی۔ وہ اپنے حبشی نوکروں کو پاس دیا کرتے تھے لیکن مجھے کیسے دیتے؟ وہ تو صرف آقا اپنے نوکروں کو دے سکتا تھا۔ اگر میں ان سے پاس مانگتا اور وہ دینے پر تیار بھی ہوجاتے تب بھی اصولاً نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ دغا دہی میں داخل تھا۔

اس لئے مسٹر کوٹس یا انکے کوئی دوست مجھے ڈاکٹر کراؤز کے پاس لے گئے جو حکومت کے مشیر قانونی تھے۔ وہ اسی ان آف کورٹ کے بیرسٹر نکلے جہاں کا میں تھا۔ انہیں اس پر بہت غصہ آیا کہ میری حیثیت کا آدمی رات کو نو بجے کے بعد بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور بجائے پاس کے مجھے ایک خط لکھ کر دے دیا جس کی رو سے مجھے اختیار تھا کہ ہر وقت بے روک ٹوک باہر نکل سکوں۔ میں جب کبھی باہر جاتا تھا تو یہ خط اپنے پاس رکھتا تھا۔ محض اتفاق کی بات تھی کہ مجھے کبھی اس سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر کراؤز نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور ہم دونوں میں خاصی دوستی ہوگئی۔ میں کبھی کبھی انکے یہاں جایا کرتا تھا اور انہیں کے توسط سے میری ملاقات انکے

بھائی سے ہوئی جو ان سے زیادہ مشہور تھے۔ یہ جوہانسبرگ میں وکیل سرکار تھے جنگ بوئر کے زمانے میں انہیں فوجی عدالت سے ایک انگریز افسر کے قتل کے الزام میں سات برس کی سزا ہوئی۔ انس آف کورٹ کے منتظموں نے انکا نام بیرسٹروں کے زمرے سے خارج کر دیا۔ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد یہ رہا ہو کر اعزاز کے ساتھ ٹرانسوال کی مجلس وکلا میں دوبارہ داخل کئے گئے اور بدستور وکالت کرنے لگے۔

ان لوگوں کی ملاقات آگے چل کر قومی خدمت کی زندگی میں میرے لئے مفید ثابت ہوئی اور اس کی بدولت میرے کام میں بڑی آسانی ہوگئی۔

پٹری پر چلنے کے متعلق جو ضابطہ تھا اس سے مجھے زیادہ نقصان پہنچا۔ میں ہمیشہ ٹہلنے کے لئے پریسیڈنٹ اسٹریٹ سے ہوتا ہوا کھلے میدان میں نکل جایا کرتا تھا۔ پریڈنٹ کروگر کا مکان اسی سڑک پر تھا۔ یہ ایک معمولی سی عمارت تھی جس میں باغ تک نہ تھا اور اس میں اور آس پاس کے مکانوں میں مشکل سے تمیز کیجا سکتی تھی۔ پریٹوریا کے بہت سے لکھ پتیوں کے مکان کہیں زیادہ شاندار تھے جن کے احاطوں میں باغ لگے ہوئے تھے۔ پریسیڈنٹ کروگر کی سادگی ضرب المثل تھی۔ صرف مکان کے سامنے پولیس کا پہرہ دیکھکر پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کسی سرکاری عہدیدار کا مکان ہے۔ میں تقریباً ہمیشہ پٹری پر پہرے والوں کے قریب سے جایا کرتا تھا اور کبھی روک ٹوک نہیں ہوئی۔

مگر پہرے والے بدلتے رہتے تھے۔ ایک بار ان میں سے ایک شخص نے بغیر اس کے کہ مجھے پہلے سے آگاہ کرتا یا پٹری سے اترنے کے لئے کہتا مجھے دھکا دے کر اور لات مار کر سڑک پر دھکیل دیا۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس شخص سے اس برتاؤ کا سبب پوچھوں مسٹر کوٹس نے جو اتفاق سے اسی وقت گھوڑے پر سوار وہاں سے گذر رہے تھے مجھے آواز دی اور کہا "گاندھی میں نے سارا واقعہ دیکھا ہے۔ اگر تم اس شخص پر مقدمہ چلاؤ تو میں خوشی سے گواہی دوں گا۔ مجھے نہایت افسوس

ہے کہ تم پر اس بدتمیزی سے حملہ کیا گیا۔"

میں نے کہا "اس میں افسوس کی کیا بات ہے اس غریب کو کیا معلوم کہ یہ کون شخص ہے۔ اس کے نزدیک سب کالے آدمی برابر ہیں۔ غالباً وہ حبشیوں کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرتا ہے جو اُس نے میرے ساتھ کیا۔ میں نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ اپنے ذاتی معاملے میں کبھی عدالت سے چارہ جوئی نہیں کروں گا۔ اس لئے میرا ارادہ اس پر مقدمہ چلانے کا نہیں۔"

مسٹر کوٹس نے کہا، "تم سے یہی توقع تھی مگر پھر سے سوچ لو۔ ہمیں ان لوگوں کو سبق ضرور دینا چاہئے۔" پھر انہوں نے پولیس والے سے مخاطب ہو کر اسکو ملامت کی۔ میں ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا کیونکہ پولیس والا بوئر تھا اور یہ دونوں ہالستانی[1] زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ مگر آخر میں اس سپاہی نے مجھ سے معافی مانگی جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں پہلے ہی معاف کر چکا تھا۔

مگر میں پھر کبھی اس سڑک پر نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کی جگہ دوسرے لوگ آئیں گے۔ انہیں یہ واقعہ تو معلوم نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ بھی مجھ سے اسی قسم کا برتاؤ کریں گے۔ میں کیوں بے ضرورت ایسا کام کروں جس میں لاتیں کھانے کا اندیشہ ہو۔ اس لئے میں نے ٹہلنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس واقعے سے میرے دل میں نوآبادی ہندوستانیوں کا درد اور بڑھ گیا میں نے اُن سے مشورہ کیا کہ اگر ان ضابطوں کی منسوخی کے لئے برطانوی ایجنٹ سے ملنے کے بعد آزمائشی مقدمہ لڑنے کی ضرورت پڑے تو لڑنا چاہئے یا نہیں۔

---

(۱) ڈچ - ہالینڈ کی۔

اس طرح مجھے تو آباد ہندوستانیوں کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔ اور وہ بھی سن سنا کر یا کتابوں میں پڑھ کر نہیں بلکہ ذاتی تجربے کی بنا پر۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خود دار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ اس حالت میں اصلاح کرنے کی کیا صورت ہے۔

لیکن اس وقت تو میرا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ دادا عبداللہ کے مقدمے کی پیروی کروں۔
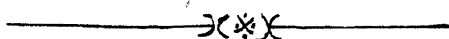
چودھواں باب

مقدمے کی تیاری

پریٹوریا میں ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا۔ یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا اور اسے انجام دینے کی تھوڑی بہت قابلیت پیدا ہوئی۔ یہیں وہ مذہبی روح جو میرے دل میں تھی قوت سے فعل میں آئی۔ یہیں مجھے وکالت کے متعلق صحیح واقفیت حاصل ہوئی۔ اور میں نے وہ چیزیں سیکھیں جو ایک نیا بیرسٹر ایک پرانے بیرسٹر کے دفتر میں سیکھتا ہے۔ یہیں مجھے یہ اعتماد پیدا ہوا کہ میں وکالت میں کچھ ایسا برا نہ رہوں گا اور یہیں کامیابی کی کنجی میرے ہاتھ لگی۔

دادا عبداللہ کا مقدمہ کوئی چھوٹا مقدمہ نہ تھا۔ چالیس ہزار پاؤنڈ[۱] کا دعویٰ تھا۔ اس کا تعلق تجارتی معاملات سے تھا۔ اس لئے اس میں سیاق کی بڑی بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ دعوے کا ایک جز پرامیسری نوٹوں پر مبنی تھا اور ایک پرامیسری نوٹ لکھنے کے صریحی وعدے پر۔ جوابدعوے یہ تھا کہ یہ نوٹ دھوکا دے کر حاصل کئے گئے اور انکے لکھنے کی کوئی معقول وجہ ثابت نہیں ہوتی۔ اس پیچیدہ مقدمے میں بہت سے نفس الامری ورقانونی نکتے تھے۔

فریقین کی طرف سے چوٹی کے وکیل اور بیرسٹر تھے۔ اس طرح مجھے ان کے م کے مطالعے کا بہت عمدہ موقع ملا۔ مدعی کی طرف سے مقدمے کے کاغذات ترتیب

---

(۱) چار لاکھ اور چھ لاکھ روپئے کے درمیان

دے کر وکیل کے حوالے کرنا اور واقعات کی چھان بین کر کے مدعی کے مفید مطلب باتیں نکالنا میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وکیل میرے ترتیب دئے ہوئے واقعات کا کتنا حصہ قبول کرتا ہے اور کتنا رد کرتا ہے اور بیرسٹر وکیل کی تیار کی ہوئی کیفیت مقدمہ کو کس حد تک کام میں لاتا ہے اور یہ میرے لئے ایک مفید تعلیم تھی۔ اس سے مجھے اچھا خاصا اندازہ ہو گیا کہ میں معاملے کو سمجھنے اور شہادت کو ترتیب دینے کی کس حد تک قابلیت رکھتا ہوں۔

میں اس کام میں بڑی سرگرمی سے مصروف تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دل و جان سے محو تھا۔ میں نے معاملات کے متعلق کل کاغذات پڑھے۔ میرے موکل قابل آدمی تھے اور مجھ پر پورا اعتبار کرتے تھے جس سے میرے کام میں بڑی آسانی ہو گئی۔ میں نے سیاق پر خاصا عبور حاصل کر لیا اور چونکہ خط و کتابت زیادہ تر گجراتی میں ہوتی تھی اور مجھے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنا پڑتا تھا اس لئے میری ترجمے کی مشق بھی بڑھ گئی۔

اگرچہ مجھے مذہبی مشاغل اور قومی خدمت سے بڑی دلچسپی تھی اور میں اپنے وقت کا کچھ حصہ ان میں صرف کرتا تھا لیکن یہ چیزیں میری توجہ کا مرکز نہ تھیں۔ سب سے زیادہ شغف مجھے مقدمہ کی تیاری میں تھا۔ قانونی کتابوں کا مطالعہ اور حسب ضرورت نظیریں تلاش کرنا میرے نزدیک سب سے مقدم کام تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے مقدمے کے واقعات پر اتنا عبور ہو گیا جتنا خود مدعی اور مدعا علیہ کو بھی نہ ہو گا کیونکہ میرے پاس دونوں کے کاغذات موجود تھے۔

مجھے مسٹر پنکٹ آنجہانی کی یہ نصیحت یاد تھی کہ مقدمے کے تین چوتھائی واقعات کو سمجھنا چاہیے۔ آگے چل کر جنوبی افریقہ کے مشہور بیرسٹر مسٹر لیونارڈ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ میں نے اپنے مقدمے میں یہ دیکھا کہ اگرچہ میرا موکل حق پر ہے لیکن قانون بظاہر اس کے خلاف ہے۔ میں نے مایوسی کی حالت میں مسٹر لیونارڈ سے مدد چاہی۔ انھیں بھی یہ محسوس ہوا کہ واقعات کی شہادت بہت قوی ہے۔ انہوں نے جوش میں آکر کہا گاندھی

میں نے اتنے دن میں ایک بات سیکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم مقدمے میں واقعات کا پہلو سنبھال لیں تو قانونی پہلو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں اس مقدمے کے واقعہ کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنا چاہئے"۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمے پر دوبارہ غور کرو اور پھر میرے پاس آؤ۔ میں نے واقعات پر دوبارہ نظر ڈالی تو مقدمے کی صورت کچھ اور ہی ہو گئی اور مجھے اس کے متعلق جنوبی افریقہ کی ایک نظیر بھی مل گئی۔ میں خوش خوش مسٹر لیونارڈ کے پاس گیا اور ان سے سب حالات بیان کئے۔ انہوں نے کہا "بس اب ہم جیت جائیں گے۔ البتہ اس کا خیال رکھنا ہو گا کہ مقدمہ کس جج کے سامنے پیش ہوتا ہے"۔

دادا عبداللہ کے مقدمے کی ترتیب کے زمانے میں مجھے واقعات کی اہمیت کا احساس تھا مگر اس حد تک نہیں تھا۔ اصل میں واقعات حق کا نام ہے اور اگر ہم حق کا دامن مضبوطی سے تھام لیں تو قانون خود بخود ہماری مدد کرتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ دادا عبداللہ کا مقدمہ واقعات کے اعتبار سے بہت زوردار ہے اور قانون یقیناً ان کی مدد کرے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال ہوا کہ اگر مقدمے بازی کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو مدعی اور مدعا علیہ جو ایک ہی شہر کے رہنے والے اور آپس میں رشتہ دار ہیں، تباہ ہو جائیں گے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ مقدمہ کب تک چلے گا۔ اندیشہ تھا کہ عدالت ہی کے ذریعے سے فیصلہ ہوا تو مدتوں میں ہو گا اور دونوں فریقوں میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس لئے دونوں کی خواہش تھی کہ اگر ممکن ہو تو فوراً تصفیہ ہو جائے۔

میں نے طیب سیٹھ سے مل کر انہیں مشورہ دیا اور اپنی طرف سے درخواست کی کہ پنچایت سے فیصلہ کر لیجئے۔ میں نے کہا آپ اپنے بیرسٹر سے گفتگو کیجئے۔ اگر کوئی ایسا شخص پنچ بنا دیا جائے جس پر فریقین کو اعتبار ہو تو بہت جلد تصفیہ ہو جائے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وکیلوں کی فیس میں روپیہ اتنی تیزی سے گھل رہا ہے کہ اگرچہ موکل دولتمند تاجر ہیں لیکن ان کا سارا سرمایہ اسی میں کھپ جائے گا۔ اور پھر انہیں مقدمے کی تتی فکر

رہتی ہے کہ کسی اور کام کی فرصت نہیں ملتی۔ اُدھر آپس میں مخالفت بڑھتی جاتی ہے۔ مجھے اس پیشے سے نفرت سی ہوگئی۔ دونوں طرف کے بیرسٹر اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے قانونی پہلو نکالیں جو انکے موکل کے حق میں مفید ہوں اس کے علاوہ مجھ پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ جو فریق جیتتا ہے اسے پورا خرچہ نہیں ملتا۔ کورٹ فیس کے ضابطے کی رو سے خرچے کی جو ایک فریق سے دوسرے کو دلایا جاتا تھا، ایک خاص رقم معین کردی گئی تھی لیکن اصل میں وکیل اپنے موکل سے اس سے کہیں زیادہ وصول کرتے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ دونوں فریقوں کا خیر خواہ رہوں۔ اور ان میں میل کرادوں۔ میں نے مصلحت کی انتہائی کوشش کی۔ خدا خدا کر کے طیب سیٹھ راضی ہو گئے۔ ایک پنچ مقرر کئے گئے۔ انکے سامنے مقدمے کی بحث ہوئی اور فیصلہ دادا عبداللہ کے موافق ہوا۔

لیکن مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے موکل نے فوراً اجرائے ڈگری کرایا تو طیب سیٹھ پورا روپیہ ادا نہیں کر پائیں گے۔ اور جنوبی افریقہ میں جو پوربندر کے میمن رہتے تھے ان میں مسلمہ قانون سا تھا کہ دیوالے پر موت کو ترجیح دینا چاہئے۔ طیب سیٹھ کے لئے سینتیس ہزار پاؤنڈ اور خرچہ یکمشت ادا کرنا ناممکن تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پیسہ پیسہ چکا دیں اور دیوالئے نہ قرار دئے جائیں۔ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دادا عبداللہ ان سے تھوڑا تھوڑا کر کے روپیہ لیں۔ انہوں نے وہ فراخدلی دکھائی جس کی اس موقع پر ضرورت تھی اور طیب سیٹھ کو بہت سی قسطوں میں رقم ادا کرنے کی اجازت دے دی۔ مجھے قسطوار ادائگی کی رعایت حاصل کرنے میں اتنی دقت ہوئی جتنی فریقین کو پنچایت پر راضی کرنے میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب تصفیہ ہوگیا تو دونوں کو خوشی ہوئی اور دونوں کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھ گئی۔ میری

مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں سمجھا کہ میں نے وہ بات سیکھ لی جو وکالت کا حقیقی مقصد ہے مجھے فطرت انسانی کے اعلیٰ عنصر کا ڈھونڈھ نکالنا اور لوگوں کے دل کی بات سمجھنا آگیا مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ وکیل کا اصل کام یہ ہے کہ جن دلوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہو انہیں ملا دے۔ یہ سبق میرے دل پر ایسا نقش ہو گیا کہ بیس سال کی وکالت کے زمانے میں میرا وقت زیادہ تر سیکڑوں مقدموں میں آپس میں راضی نامہ کرانے میں صرف ہوا۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہوا یہاں تک کہ میری آمدنی میں بھی کمی نہیں ہوئی اور میری روح تو بے شبہ ہلاکت سے محفوظ رہی۔

پندرھواں باب

مذہبی جوش

اب میں پھر ان معاملات کی طرف رجوع کرتا ہوں جو عیسائی دوستوں کے سابقے میں پیش آئے۔

مسٹر بیکر کو میری آئندہ زندگی کی بڑی فکر تھی۔ وہ مجھے ولنگٹن کانفرنس میں لے گئے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی چند سال کے وقفے سے اس طرح کے جلسے "روحانی روشنی" یعنی تزکیہ نفس کی خاطر کیا کرتے تھے۔ اسے ہم مذہبی تجدید یا ایمان تازہ کرنا کہہ سکتے ہیں۔ ولنگٹن کانفرنس اسی قسم کی چیز تھی۔ اس کے صدر وہاں کے مشہور پادری اینڈریو مرے صاحب تھے مسٹر بیکر صاحب کو امید تھی کہ کانفرنس کی مذہبی ذوق و شوق کی فضا اور حاضرین کے جوش اور خلوص کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میں عیسائیت قبول کرلوں گا۔

مگر انکا آخری سہارا دعا کی تاثیر تھی۔ دعا کے وہ بہت قائل تھے۔ انہیں یقین کامل تھا کہ اگر دل سے دعا مانگی جائے تو خدا ضرور سنتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کی مثال دیا کرتے تھے جیسے برسٹل کا جارج مُلر جو دنیاوی امور میں بھی ہمیشہ دعا ہی سے کام لیتا تھا۔ میں دعا کی تاثیر کے متعلق ان کی تقریر بغیر کسی تعصب کے توجہ سے سنا کرتا تھا اور میں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اگر عیسائیت کے اصول میرے دل میں اتر گئے تو کوئی چیز مجھے عیسائی ہونے سے نہیں روک سکتی۔ مجھے اُن سے یہ عدہ کرنے میں کوئی تامل نہ تھا۔ اس لئے کہ میں نے مدت سے اپنے نفس کو ضمیر کی پیروی کا عادی بنا لیا تھا۔ مجھے اُس کی اطاعت میں لطف آتا تھا۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا میرے

لئے مشکل اور تکلیف دہ ہوتا تھا۔

غرض ہم ویلنگٹن گئے۔ مسٹر بیکر میرے جیسے کالے آدمی کو ساتھ لیجانے سے بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ انہیں بار ہا محض میرے سبب سے تکلیفیں جھیلنا پڑیں۔ ہمیں ایک روز رستے میں ٹھہرنا پڑا کیونکہ اتوار کا دن آگیا اور مسٹر بیکر اور انکے ساتھی یوم السبت کو سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اسٹیشن کے ہوٹل میں منیجر بڑی تکرار کے بعد مجھے ٹھہرانے پر تو راضی ہو گیا مگر کھانے کے کمرے میں جانے کی کسی طرح اجازت نہیں دی۔ مسٹر بیکر آسانی سے ملنے والے آدمی نہ تھے۔ وہ اس پر اڑ گئے تھے کہ ہوٹل کے مسافروں کے جو حقوق ہیں وہ مجھے بھی دیے جائیں۔ مگر مجھ کو اُس شخص کی مشکلوں کا اندازہ تھا۔ ویلنگٹن میں بھی میں مسٹر بیکر کے ساتھ ٹھہرا۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں ناگوار صورتیں پیش آتی تھیں وہ انہیں مجھ سے چھپانا چاہتے تھے مگر مجھے سب معلوم تھا۔

یہ کانفرنس دیندار عیسائیوں کی مجلس تھی۔ مجھے انکی خوش اعتقادی دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ میں پادری مرے صاحب سے ملا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ میرے لئے دعا کر رہے ہیں۔ مجھے ان کی بعض مناجاتیں پسند آئیں۔ ان میں بڑی شیرینی تھی۔

کانفرنس تین دن رہی جو لوگ اس میں شریک تھے ان کی دینداری کی میرے دل میں بڑی قدر تھی۔ مگر مجھے اپنا عقیدہ بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی یہ یقین کرنا میرے لئے ناممکن تھا کہ جبتک عیسائی نہ ہو جاؤں گا۔ میری نجات نہ ہوگی۔ میں نے یہ بات اپنے چند نیک عیسائی دوستوں سے کہی تو ان کے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ مگر میں کیا کرتا مجبور تھا۔

میری مشکلات بہت گہری تھیں۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کہ مسیح خدا کے اکلوتے مجسم بیٹے ہیں اور صرف وہی شخص جو انہیں مانتا ہے ابدی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ اگر کوئی خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے تو

سب اس کے بیٹے ہیں۔ اگر مسیح خدا سے مشابہ ہیں یا خدا ہیں تو سبھی انسان خدا سے
یہ ہیں اور خدا ہو سکتے ہیں۔ میری عقل قبول نہیں کرتی تھی کہ مسیح کی شہادت اور ان
خون سے دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہونا حقیقی معنی میں صحیح ہے۔ استعارے کے
طور پر ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت ہو۔ پھر مذہب عیسوی کہتا تھا کہ جانوروں میں روح
یں ہوتی۔ ان کے لئے موت کامل فنا ہے اور میرا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔ میں
ح کو شہید، ایثار مجسم، خدا رسیدہ گرو مان سکتا تھا مگر سب سے مکمل انسان تسلیم
نے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کا صلیب پانا دنیا کے لئے ایک شاندار مثال تھی مگر یہ بات
ے دل کو نہیں لگتی تھی کہ اس میں کوئی پُراسرار یا معجزنما تاثیر ہے۔ فلسفیانہ حیثیت سے عیسائیت کے
لوں میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ایثار کے نقطہ نظر سے میرے خیال میں ہندو عیسائیوں سے
ت آگے تھے۔ میرے لئے عیسائیت کو مکمل یا اور سب مذہبوں سے بڑھ کر سمجھنا ناممکن تھا۔
جب موقع ملتا تھا میں اپنے خدشوں کا ذکر اپنے عیسائی دوستوں سے کرتا
۔ مگر انکے جوابوں سے مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں جس طرح میں
ائیت کو مکمل یا بہترین مذہب تسلیم نہیں کرتا تھا اسی طرح ہندو دھرم کو بھی نہیں
تھا۔ ہندوؤں کے عیب میری نظروں میں کھٹکتے تھے میں جانتا تھا کہ چھوت
ت ہندو دھرم کا جزو ہے تو اسی طرح ہے جیسے بدگوشت جسم کا جزو ہوتا ہے
سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے فرقوں اور ذاتوں کے ہونے میں کیا مصلحت ہے۔
کے کیا معنی ہیں کہ وید خدا کا منزل کلام ہے۔ اگر اسے منزل مانا جائے تو بائبل
رآن کو بھی ماننا چاہئے۔

جس طرح عیسائی دوست مجھے اپنے مذہب میں لانے کی کوشش
ہے تھے اسی طرح مسلمان دوست بھی کر رہے تھے۔ عبداللہ سیٹھ برابر
اسلام کے مطالعے کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور ہمیشہ اس کی کوئی نہ کوئی

خوبی بیان کرتے تھے۔

میں نے رائے چند بھائی کو ایک خط لکھا جس میں اپنے شبہے ظاہر کئے۔ ہندوستان کے اور دھرم شاستریوں سے بھی میں نے خط وکتابت کی۔ رائے چندر بھائی کے خط سے مجھے کسی قدر تسکین ہوئی۔ انہوں نے لکھا کہ تم صبر سے کام لو اور ہندو مذہب کا اور گہرا مطالعہ کرو۔ انکا ایک جملہ یہ تھا "اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہندو دھرم میں جتنی دقت نظر، نزاکت خیال روحانی بلند پروازی اور احسان وکرم ہے کسی مذہب میں نہیں۔"

میں نے سیل کا ترجمہ قرآن خرید کر اسکا مطالعہ شروع کیا اور اسلام کے متعلق اور کتابیں بھی مہیا کیں۔ میں نے انگلستان کے عیسائی دوستوں کو خطوط لکھے ان میں سے ایک نے میرا تعارف ایڈورڈ میٹلینڈ سے کرایا جن سے میری خط وکتابت ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے "طریق احسن" بھیجی جو انہوں نے اور اینا کنگسفورڈ نے مل کر لکھی تھی۔ اس کتاب میں عیسائیوں کے مروجہ عقائد کی تردید تھی۔ انہوں نے مجھے ایک اور کتاب "بائبل کی تفسیر جدید" بھی بھیجی۔ مجھے یہ دونوں پسند آئیں۔ ان سے بظاہر ہندو دھرم کی تائید ہوتی تھی۔ ٹالسٹائے کی "خدا کی سلطنت تمہارے سینے میں ہے" نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اسکا اثر میرے دل پر ہمیشہ باقی رہا اس میں آتنی آزادی خیال اخلاقی گہرائی اور سچائی تھی کہ وہ سب کتابیں جو مسٹر کوٹس نے مجھے دی تھیں اسکے آگے ماند پڑ گئیں۔

غرض مجھے کتابوں کے مطالعے نے ایسے رستے پر ڈال دیا جس کا میرے عیسائی دوستوں کو خیال تک نہ آیا تھا۔ ایڈورڈ میٹلینڈ سے میری خط وکتابت بہت دن ہوتی رہی اور رائچند بھائی سے تو جبتک وہ زندہ رہے نامہ وپیام جاری رہا۔ انہوں نے جو کتابیں مجھے بھیجی تھیں ان میں سے بعض میں نے پڑھیں۔ مثلاً

پنچ کرن، منی رت نملا، یوگ وسشٹا کی موکشا پراکرن اور ہری بھدر سوری
کی سدرشن سمچیا وغیرہ۔

اگرچہ میں اس رستے پر چلنے لگا جس پر میرے عیسائی دوست مجھے نہیں
چلانا چاہتے تاہم میں اُن کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا کہ انھوں نے میرے دل
میں مذہبی تحقیق کے شوق کو اُبھارا۔ مجھے ان کی صحبت کی یاد ہمیشہ عزیز رہے
گی۔ اس کے بعد آنے والے زمانے میں ایسی اور بہت سی صحبتیں میرے نصیب
میں تھیں۔
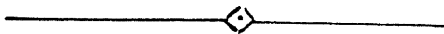
سولھواں باب

آدمی کیا سوچتا ہے اور خدا کیا کرتا ہے

مقدمہ طے ہو چکا تھا اور اب مجھے پرٹیوریا میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے میں ڈربن واپس آیا اور وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ مگر بھلا عبد اللہ سیٹھ مجھے بغیر رخصتی جلسے کے کب جانے دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے رخصت کرنے کے لئے سڈنہم میں جلسہ منعقد کیا۔

ہم لوگ وہاں دن بھر رہنے کے ارادے سے گئے۔ میں بیٹھا کچھ اخباروں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اتفاق سے اخبار کے ایک کونے میں میری نظر ایک پیرا گراف پر پڑی جس کا عنوان تھا "ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق"۔ یہ اُس مسودہ قانون کے متعلق تھا جو ان دنوں مجلس وضع قوانین میں پیش تھا اور جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستانی نٹال کی مجلس وضع قوانین کے رکن منتخب کرنے کے حق سے محروم کر دیے جائیں۔ مجھے اور دوسرے مہمانوں کو جو وہاں جمع تھے اب تک مسودے کا علم نہ تھا۔

میں نے عبد اللہ سیٹھ سے اس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے کہا "بھلا ہم لوگ ان معاملات کو کیا جانیں۔ ہم تو صرف ان باتوں کو سمجھتے ہیں جن کا اثر ہماری تجارت پر پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آرینج فری اسٹیٹ میں ہماری جتنی تجارت تھی سب برباد کر دی گئی۔ ہم نے بہت فریاد کی مگر کچھ نتیجہ نہ ہوا۔ ان پڑھ ہونے کے سبب سے ہم بالکل بیدست و پا ہیں۔ ہم اخبار عموماً محض اس لئے پڑھتے ہیں کہ بازار کے روزانہ نرخ وغیرہ معلوم کرتے رہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ وضع قوانین کسے کہتے ہیں۔ ہمارے آنکھ کان

تو یہاں کے یورپی وکیل ہیں"

میں نے کہا" یہاں بہت سے نوجوان ہندوستانی ہیں جن کی پیدائش اور تعلیم یہیں کی ہے وہ آپ کی مدد نہیں کرتے ؟"

عبداللہ سیٹھ نے جھلا کر کہا" جی ہاں! وہی تو مدد کریں گے۔ وہ تو ہمارے پاس تک نہیں پھٹکتے اور سچ پوچھئے تو ہم بھی انہیں اپنا نہیں سمجھتے۔ عیسائی ہونے کے سبب سے وہ لوگ یورپی پادریوں کی مٹھی میں ہیں اور پادری بڑے گورمنٹ کے نیاز مند"

یہ سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ ان لوگوں کو اپنا بنانا چاہئے۔ کیا عیسائیت کے یہی معنی ہیں؟ کیا عیسائی ہوجانے سے آدمی ہندوستانی نہیں رہتا؟۔

لیکن میں وطن کی واپسی کے لئے پابرکاب تھا اس لئے اس مسئلے کے متعلق جو خیالات میرے دل میں تھے انہیں ظاہر کرتے ہچکچاتا تھا۔ میں نے عبداللہ سیٹھ سے صرف اتنی بات کہی" اگر یہ مسودہ پاس ہو کر قانون بن گیا تو ہماری زندگی دشوار ہوجائیگی۔ یہ ہمارے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہ ہماری خودداری کو مٹا کر چھوڑیگا"

سیٹھ عبداللہ نے کہا" بہت ممکن ہے۔ مگر یہ تو سنئے کہ ووٹ کا مسئلہ کیونکر شروع ہوا۔ ہمیں اسکی کچھ خبر نہ تھی۔ مسٹر اسکومب نے جو یہاں چوٹی کے وکیل ہیں جنہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بات سمجھائی۔ اس کا قصہ یہ ہے۔ مسٹر اسکومب بڑے زبردست لڑنے والے ہیں۔ ان میں اور بندرگاہ کے انجنیر میں ان بن تھی ان کا خیال تھا انجنیر انکے ووٹ چھین لے گا اور انہیں انتخاب میں شکست دیدے گا۔ اس لئے انہوں نے ہمیں ہمارے حقوق سمجھائے اور انکے کہنے سے ہم لوگوں نے اپنے نام ووٹ دینے والوں کے رجسٹر میں لکھوا لئے اور انکے حق میں ووٹ دیا۔ اب آپ

ہی دیکھئے کہ ووٹ کے حق کی جو اہمیت آپ کی نظر میں ہے ہماری نظر میں کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر ہم آپ کا مطلب سمجھتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

اور وہاں اس گفتگو کو غور سے سن رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا:

"مجھ سے پوچھئے کہ کیا کرنا چاہئے۔ آپ اپنا جہاز کا ٹکٹ منسوخ کرا لیجئے اور یہاں ایک مہینہ اور ٹھہرئے۔ ہم آپ کی ہدایت کے مطابق لڑینگے۔"

سب کے سب بول اُٹھے "بالکل ٹھیک ہے! بالکل ٹھیک ہے! عبداللہ سیٹھ آپ گاندھی بھائی کو ہرگز نہ جانے دیجئے۔"

سیٹھ بڑے سیانے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا "مجھے اب کیا حق ہے کہ انہیں روکوں؟ بلکہ یوں کہنا چاہئے جتنا حق مجھے ہے اتنا ہی آپ کو بھی ہے۔ مگر آپ کہتے ٹھیک ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر انہیں روکیں۔ البتہ یہ یاد رکھئے کہ یہ بیرسٹر ہیں۔ ان کی فیس کا کیا بندوبست ہوگا؟"

فیس کے ذکر سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے انکا قطع کلام کر کے کہا:

"سیٹھ صاحب فیس کا نام بھی نہ لیجئے۔ قومی خدمت کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ میں یہاں ٹھہرا بھی تو خادم کی حیثیت سے ٹھہروں گا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ میں ان سب دوستوں سے واقف نہیں ہوں۔ اگر آپ کو یقین ہو کہ یہ میرا ساتھ دیں گے تو میں ایک مہینہ ٹھہرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ایک بات ہے۔ مجھے تو کوئی معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں جس قسم کا کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ابتدا میں تھوڑا بہت روپیہ ضرور چاہئے مثلاً ممکن ہے ہمیں تار بھیجنا پڑیں، کاغذات چھپوانا پڑیں، دورہ کرنا ہو، مقامی وکیلوں سے مشورہ لینا ہو اور چونکہ میں آپکے یہاں کے قوانین سے ناواقف ہوں اس لئے شاید مجھے معلومات حاصل کرنے کے لئے کچھ قانونی کتابوں کی ضرورت پیش آئے۔ یہ سب

کام بغیر روپے کے نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ بہت سے لوگوں کو میرا ہاتھ بٹانا چاہئے"

سب نے یک زبان ہو کر کہا "انشاء اللہ تعالیٰ۔ روپے کی کوئی کمی نہیں۔ آدمی جتنے آپ چاہیں موجود ہیں۔ آپ مہربانی کر کے ٹھہرنے کی ہامی تو بھریں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس طرح رخصتی پارٹی مجلس انتظامی بن گئی۔ میں نے یہ رائے دی کہ کھانا وغیرہ جلدی ختم کر کے گھر واپس چلنا چاہئے۔ میں نے اپنے دل میں اس مہم کا نقشہ سوچ لیا۔ میں نے ان لوگوں کے نام معلوم کئے۔ جن کا نام ووٹ دینے والوں کی فہرست میں تھا اور ایک مہینہ ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس طرح خدا نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور اس لڑائی کا بیج بویا جو قومی خودداری کی حفاظت کے لئے لڑی گئی۔

سترھواں باب
نٹال میں مستقل سکونت

سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا ۱۸۹۴ء میں نٹال کے ہندوستانیوں کے ممتاز ترین رہنما سمجھے جاتے تھے۔ دولت کے اعتبار سیٹھ عبداللہ حاجی آدم سب سے بڑھے ہوئے تھے لیکن پبلک معاملات میں وہ اور دوسرے لوگ سیٹھ حاجی محمد ہی کو اپنا سردار مانتے تھے اس لئے ان کی صدارت میں ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے گھر پر ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسودہ قانون حق رائے دہندگی کی مخالفت کیجائے۔

رضا کار بھرتی کئے گئے۔ جلسے میں وہ ہندوستانی بھی بلائے گئے جو نٹال میں پیدا ہوئے تھے، جن میں سے اکثر عیسائی نوجوان تھے۔ ڈربن کے مترجم عدالت مسٹر پال اور مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر سجان گاڈفرے بھی موجود تھے اور انہیں کی کوشش سے عیسائی نوجوان اچھی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ رضا کاروں میں بھرتی ہو گئے۔

بہت سے مقامی تاجر بھی رضا کار بنے جن میں سے سیٹھ داؤد محمد، محمد قاسم قمرالدین، آدمجی میاں خاں، اے کولاندا ویلو پلے، سی بچھی رام، رنگا سامی پڈیاچی اور آمود جیوا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پارسی رستم جی بھی موجود تھے۔ محرروں میں سے مانک جی جوشی، نرسنگھ رام، اور دادا عبداللہ کمپنی اور دوسری بڑی دوکانوں کے ملازم تھے۔ ان سب نے اپنے آپ کو قومی کام میں شرکت کرتے دیکھا تو انہیں تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ ان کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ انہیں اس

کام میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔ قومی مصیبت کے وقت اونچے نیچے، چھوٹے بڑے نوکر آقا، ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، سندھی وغیرہ کا فرق بھلا دیا گیا۔ سب کے سب یکساں مادر وطن کے خادم تھے۔

مسودے کی دوسری خواندگی منظور ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں ان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کا اس سخت تجویز کی مخالفت نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ووٹ کا حق پانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

میں نے حاضرین جلسہ کو صورت حال سمجھائی۔ سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ مجلس وضع قوانین کے صدر کے نام تار بھیجا کہ مہربانی کر کے اس مسودے پر مزید بحث ملتوی کر دیجئے۔ اسی مضمون کا تار وزیر اعظم سر جان رابنسن کو دیا گیا اور مسٹر ایسکومب کو بھی جو دادا عبداللہ کے دوست تھے۔ صدر نے فوراً جواب دیا کہ بحث دو دن کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ اس سے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔

ایک عرضداشت مجلس وضع قوانین میں پیش کرنے کی غرض سے تیار کی گئی۔ اسکی تین نقلیں مجلس کے لئے کرنا تھیں اور ایک زائد نقل اخباروں کے لئے۔ یہ بھی تجویز تھی کہ اس پر حتی الامکان بہت سے دستخط حاصل کئے جائیں۔ اور یہ سب کام ایک رات میں ختم کرنا تھا۔ انگریزی داں رضا کار اور بعض اور لوگ رات بھر جاگتے رہے۔ ایک ضعیف العمر بزرگ مسٹر آرتھر نے جن کی خوشنویسی مشہور تھی پہلا مبیّضہ لکھا اور نقلیں دوسرے لوگوں نے اس طرح کیں کہ ایک شخص بولتا جاتا تھا اور کئی آدمی لکھتے جاتے تھے۔ یوں ایک وقت میں پانچ نقلیں تیار ہو گئیں۔ تاجروں میں سے جو لوگ رضا کار تھے انہوں نے اپنی گاڑیوں میں اور کرائے کی گاڑیوں میں گشت لگا کر لوگوں سے عرضداشت پر دستخط کرائے۔ یہ کام بہت جلد ہو گیا اور عرضداشت بھیجدی گئی۔ اخباروں نے اسے شائع کیا اور موافق رائیں لکھیں۔ مجلس وضع قوانین میں بھی لوگ اس سے

متاثر ہوئے اور اس پر بحث کی گئی۔ مسودے قانون کے حامیوں نے ان دلیلوں کا جو اس میں پیش کی گئی تھیں جواب دیا، جو مسلمہ طور پر کمزور تھا۔ مگر قانون پاس ہی ہو گیا۔ سب جانتے تھے کہ یہی ہونا ہے لیکن اس تحریک کے جوش و خروش نے نٹال کے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلا دیا کہ ان کی جماعت ایک متحدہ جماعت ہے جس میں کوئی تفریق نہیں اور انکا فرض ہے کہ جس طرح اس کے تجارتی حقوق کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح اس کے سیاسی حقوق کی بھی کریں۔

اس زمانے میں لارڈ رپن برطانیہ کے وزیر نو آبادیات تھے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ انکے پاس ایک عرضداشت بھیجی جائے جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوں۔ یہ کوئی چھوٹا کام نہیں تھا جو ایک دن میں ہو جاتا۔ رضا کار بھرتی کئے گئے اور ان سب نے اپنا اپنا کام مستعدی سے انجام دیا۔

میں نے اس عرضداشت کے تیار کرنے میں بڑی محنت کی۔ اس موضوع پر جتنا مواد مل سکتا تھا سب کا مطالعہ کیا۔ میرے استدلال کی بنیاد دو چیزیں تھیں ایک اصولی بات اور ایک مصلحت کا پہلو۔ میں نے لکھا کہ چونکہ ہمیں ہندوستان میں ایک حد تک ووٹ کا حق حاصل ہے اس لئے اصولاً نٹال میں بھی ہونا چاہئے اور مصلحت یہی ہے کہ یہ حق باقی رہنے دیا جائے کیونکہ ہندوستانیوں کی تعداد جو اسے استعمال کر سکتے ہیں بہت کم ہے۔

دو ہفتے کے اندر دس ہزار دستخط حاصل کئے گئے۔ سارے صوبے سے اس تعداد میں دستخط حاصل کرنا کوئی سہل کام نہ تھا خصوصاً اس لحاظ سے کہ کام کرنے والے بالکل ناتجربہ کار تھے۔ اس کے لئے خاص طور پر قابل رضاروں کا انتخاب کرنا پڑا کیونکہ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کسی شخص سے اس وقت تک دستخط نہ کرائے جائیں گے جب تک اسے عرضداشت کا مطلب پوری طرح نہ سمجھا دیا جائے۔ گاؤں دور دور پھیلے ہوئے

تھے۔ کام جلدی ہونا بھی ممکن تھا کہ کچھ رضاکار دل وجان سے اس میں لگ جائیں۔ سب نے اپنے اپنے حصے کا کام سرگرمی اور جوش سے انجام دیا۔ لیکن ان سطروں کو لکھتے وقت سیٹھ داؤد محمد، رستم جی، آدجی میاں خاں، اور راموجیبو کی شکلیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ دستخط جمع کرکے لائے۔ داؤد سیٹھ دن بھر اپنی گاڑی میں پھرتے رہے۔ اور یہ سارا کام بلا معاوضہ کیا گیا۔ بلکہ لوگوں نے جو اپنے پاس سے خرچ کیا تھا وہ بھی نہیں لیا۔ دادا عبداللہ کا گھر سرائے اور عام دفتر بن گیا۔ متعدد تعلیم یافتہ دوست جو میرا ہاتھ بٹاتے تھے اور بہت سے لوگ وہیں کھانا کھاتے تھے۔ اسی طرح ہر شخص کو جو ہماری مدد کرتا تھا زیر بار ہونا پڑا۔

خدا خدا کرکے درخواست بھیجی گئی۔ گشت کرانے اور تقسیم کرانے کے لئے اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ اس کے ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کو پہلی بار نٹال کے حالات معلوم ہوئے۔ میں نے اس کی کاپیاں ہندوستان کے سب اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو، جن سے میں واقف نہ تھا بھیجیں۔

"ٹائمز آف انڈیا" نے اس عرضداشت پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبات کی زوردار تائید کی۔ ہم نے انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو بھی اس کی کاپیاں بھیجیں۔ "لندن ٹائمز" نے بھی ہماری تائید کی اور ہمارے دل میں یہ امید بندھنے لگی کہ یہ قانون منسوخ کردیا جائے گا۔

اب میرے لئے نٹال سے جانا ممکن نہ تھا۔ ہندوستانی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہاں مستقل طور پر قیام کرلوں۔ میں نے اپنی مشکلوں کا ذکر کیا۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ یہاں رہوں گا تو اس شرط پر کہ اپنا خرچ پبلک

پر نہ ڈالوں۔ اب یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ میں الگ گھر لے کر رہوں۔ میں سوچتا تھا کہ مکان معقول ہو اور موقع بھی اچھا ہو۔ یہ بھی خیال تھا اگر میں اس شان سے نہ رہوں جیسے بیرسٹر عموماً رہتے ہیں تو اس میں میری جماعت کی بدنامی ہے۔ اور اس طرح رہنے میں بظاہر تین سو پاؤنڈ سالانہ سے کم خرچ نہ تھا۔ اسلئے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرکے لوگوں سے کہدیا میں صرف ایک شرط پر ٹھہر سکتا ہوں اور وہ یہ ہو کہ جماعت کے لوگ میرے لئے کم سے کم تین سو پاؤنڈ سالانہ کا قانونی کام فراہم کرنے کا ذمہ لے لیں۔

انہوں نے کہا "مگر ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اتنی رقم آپ کو پبلک خدمات کے معاوضے میں دیجائے اور ہم اسے آسانی سے جمع کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس فیس کے علاوہ کے علاوہ ہو جو آپ کو لوگوں کے ذاتی مقدموں میں ملے گی۔"

میں نے کہا "نہیں، میں پبلک خدمت کا معاوضہ آپ سے نہیں لے سکتا۔ اس میں مجھے بیرسٹری کی قابلیت صرف کرنے کی بہت کم ضرورت پڑے گی۔ میرا کام زیادہ ہوگا کہ آپ سب لوگوں سے کام لوں۔ بھلا اس کا معاوضہ میں آپ سے کیسے لے سکتا ہوں؟ اس کے علاوہ مجھے اس کام کے سلسلے میں اکثر لوگوں سے چندہ مانگنے کی ضرورت ہوگی اور اگر میں آپ سے تنخواہ لوں تو پھر بڑی رقموں کا مطالبہ کرنے میں دقت ہوگی اور آگے چل کر کام رک جائے گا۔"

"مگر ہم آپ کو اتنے دن سے جانتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ روپیہ ہرگز نہ لیں گے۔ جب ہم آپ کو یہاں ٹھہرا رہے ہیں تو آپ کا خرچ بھی ہمارے ہی ذمے ہونا چاہئے۔"

"آپ محبت کے سبب سے اور موجودہ جوش کے اثر میں یہ باتیں کہہ رہے ہیں کیسے یقین ہو کہ یہ محبت اور یہ جوش ہمیشہ رہے گا؟ آپ کے اور خادم کی حیثیت سے مجھے کبھی آپ سے سخت باتیں کہنا پڑیں گی۔ خدا جانے اس وقت آپ کو مجھ سے محبت

رہے یا نہ رہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں پبلک کام کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتا۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ لوگ اپنے قانونی معاملات میرے سپرد کر دیا کریں ممکن ہے کہ اس میں بھی آپ کو دقت ہو۔ کیونکہ اول تو میں گورا بیرسٹر نہیں ہوں معلوم نہیں عدالت پر میرا اثر کیسا پڑے۔ دوسرے میں یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وکیل کی حیثیت سے کیسا رہوں گا۔ اس لئے مجھے پہلے سے وکیل کرنا بھی آپ کے لئے جوکھم سے خالی نہیں۔ اگر میرے ساتھ اتنا احسان کریں گے تو میں اسی کو اپنے پبلک کام کا کافی معاوضہ سمجھوں گا۔

اس بحث کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً بیس تاجروں نے مجھے ایک سال کے لئے اپنے تمام قانونی معاملات میں وکیل کر لیا۔ اس کے علاوہ دادا عبداللہ نے بجائے اس رقم کے جو وہ مجھے رخصت کرتے وقت دینا چاہتے تھے مجھے فرنیچر خرید دیا۔

یوں میں نے نٹال میں سکونت اختیار کر لی۔

اٹھارھواں باب
رنگ کی قید

عدالت کی تمثیل ایک ترازو قرار دی گئی ہے جسے ایک اندھی، منصف مزاج، نیز فہم عورت ہاتھ میں اس طرح لئے بیٹھی ہے کہ اس کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ تقدیر نے اسے خاص کر کے اندھا کر دیا ہے تاکہ وہ کسی شخص کے متعلق اس کی ظاہری صورت کی بنا پر رائے قائم نہ کر سکے بلکہ اس کے باطنی جوہر کو تولے۔ مگر نٹال کی انجمن وکلا نے عدالت العالیہ کو ترغیب دی کہ وہ اس اصول کے خلاف عمل کرے اور اپنی تمثیل کو غلط کر دے۔

میں نے عدالت العالیہ میں بیرسٹر کی حیثیت سے داخلے کی اجازت چاہی۔ میرے پاس بمبئی ہائی کورٹ کے داخلے کی سند تھی۔ انگلستان کی سند میں نے بمبئی ہائی کورٹ کے حوالے کر دی تھی۔ داخلے کی درخواست کے ساتھ چال چلن کے دو تصدیق نامے داخل کرنا ضروری تھا۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ یورپیوں کی تصدیق کی زیادہ وقعت ہو گی۔ دو یورپی تاجروں سے جنہیں میں دادا عبداللہ کی معرفت جانتا تھا یہ تصدیق نامے لکھوائے۔ عرضی کے لئے یہ شرط تھی کہ کسی وکیل کی معرفت داخل کیجائے۔ اور عموماً صدر مشیر قانونی ایسی درخواستیں بغیر کسی فیس کے داخل کر دیتا تھا۔ صدر مشیر قانونی مسٹر ایسکومب تھے جن کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دادا عبداللہ کمپنی ان سے اپنے معاملات میں قانونی مشورہ لیا کرتی تھی۔ میں انکے پاس گیا اور وہ میری درخواست داخل کرنے پر خوشی سے راضی ہو گئے۔

مگر انجمن وکلا نے مجھے اچانک یہ نوٹس دیا کہ وہ میرے داخلے کی مخالفت کرے گی۔

اُس کا ایک اعتراض بھی یہ تھا کہ میری درخواست کے ساتھ انگلستان کی اصل سند نہیں ہے لیکن جس بات پر اس نے سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ جب بیرسٹروں کے داخلے کے قواعد بنائے گئے تو یہ امکان ہرگز بنانے والوں کے ذہن میں نہ ہوگا کہ کوئی کالا آدمی بھی داخلے کی درخواست کریگا اگر کالے آدمی داخل کئے گئے تو انکی تعداد یورپیوں سے بڑھ جائے گی اور یورپیوں کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔

انجمن وکلا کی طرف سے ایک نامی وکیل پیروکار تھے۔ چونکہ انکا تعلق بھی دادا عبداللہ کمپنی سے تھا اس لئے انہوں نے سیٹھ عبداللہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم آکر مجھ سے مل جاؤ۔ انہوں نے مجھ سے کھل کر گفتگو کی اور میرے پہلے کے حالات پوچھے جو میں نے بیان کر دیے۔ اس پر انہوں نے کہا "مجھے آپ کے داخلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے تو صرف یہ خوف تھا کہ کہیں آپ ان لوگوں میں تو نہیں جن کی پیدائش یہیں کی ہے اور جو گھس بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اور آپ کی درخواست کے ساتھ اصل سند نہ ہونے سے میرے شبہے کی تائید ہوئی۔ ایسے واقعات ہوچکے ہیں کہ لوگوں نے دوسروں کی اسناد اپنے نام سے پیش کر دیں۔ آپ نے چالچلن کے جو تصدیق نامے یوروپی تاجروں کی طرف سے پیش کئے ہیں وہ میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ آپ کے حالات کیا جانیں؟ انہیں آپ سے واقفیت ہوگی بھی تو برائے نام ہوگی؟"

میں نے کہا "یوں تو پھر یہاں ہر شخص مجھ سے ناواقف ہے۔ عبداللہ سیٹھ کی بھی مجھ سے یہیں کی ملاقات ہے"

"مگر آپ یہ تو کہتے ہیں نہ کہ وہ آپ کے ہموطن ہیں؟ اگر آپ کے والد وہاں وزیر تھے تو عبداللہ سیٹھ آپ کے خاندان کو ضرور جانتے ہوں گے۔ آپ ان کی حلفی تصدیق پیش کر دیں تو مجھے آپ کے معاملے میں مطلق اعتراض نہ ہوگا۔ تب میں انجمن وکلا سے کہدوں گا کہ میں آپ کی درخواست کی مخالفت نہیں کر سکتا"

یہ گفتگو سن کر مجھے غصہ آگیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا ”اگر میں دادا عبد اللہ کا تصدیق نامہ بھیجتا تو یہ لوگ اسے رد کر دیتے اور یورپیوں کے تصدیق نامے مانگتے۔ بھلا بیرسٹری کے داخلے سے میرے حسب نسب کو کیا تعلق؟ اگر میں غریب یا بُرے خاندان کا بھی ہوتا تو میرے داخلے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔“ مگر میں نے ان سے صرف اتنا کہا ”اگرچہ میں تسلیم نہیں کرتا کہ انجمن وکلا کو ان تفصیلات کا مطالبہ کرنے کا حق ہے پھر بھی میں وہ تصدیق نامہ جو آپ مانگتے ہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

سیٹھ عبد اللہ کی طرف سے حلفی تصدیق نامہ لکھ کر باضابطہ انجمن وکلا کے پیروکار کو بھیجد یا گیا۔ انہوں نے اپنا اطمینان ظاہر کیا مگر انجمن وکلا مطمئن نہیں ہوئی۔ اس نے عدالت العالیہ میں میرے داخلے کی مخالفت کی۔ مگر عدالت نے اس کی عذرداری کو خارج کر دیا۔ ہمارے وکیل مسٹر ایسکومب کو جواب تک دینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ چیف جسٹس کے الفاظ قریب قریب یہ تھے ”یہ اعتراض کہ عرضی گذارنے میں اصل سند منسلک نہیں کی، بے بنیاد ہے۔ اگر وہ دروغ حلفی کا مرتکب ہوا ہے تو اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اور اگر وہ مجرم ثابت ہو تو اس کا نام وکلا کی فہرست سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ قانون کالے گورے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس لئے عدالت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ مسٹر گاندھی کو بیرسٹروں کے زمرے میں داخل ہونے سے روکے ہم درخواست منظور کرتے ہیں۔ مسٹر گاندھی آپ داخلہ کا حلف اٹھائیے۔“

میں نے کھڑے ہو کر رجسٹرار کے سامنے حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ہی چیف جسٹس نے مجھ سے کہا ”مسٹر گاندھی اب آپ کو اپنی پگڑی اتارنا پڑے گی۔ عدالت نے اپنے بیرسٹروں کے لباس کے متعلق جو قاعدے مقرر کئے ہیں ان کی پابندی آپ پر لازم ہے۔“

اب مجھے محسوس ہوا کہ میری آزادی محدود ہو گئی ہے۔ وہی پگڑی جس کے اتارنے سے میں نے مجسٹریٹ ضلع کی عدالت میں انکار کر دیا تھا اب مجھے عدالت العالیہ کے حکم سے اتارنا پڑی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتا تو یہ انکار جائز نہ ہوتا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ اپنی قوت کو بڑے معرکوں کے لئے محفوظ رکھوں۔ مجھے لڑنے میں جو سلیقہ حاصل تھا اسے پگڑی باندھنے کی حمایت میں صرف کرنا مجھے منظور نہ تھا یہ چیز اس قابل تھی کہ اس سے بہتر مقصد کے لئے استعمال کی جائے۔

سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کو میری یہ اطاعت شعاری (یا کمزوری؟) پسند نہیں آئی۔ انکا خیال تھا کہ مجھے اپنے اس حق پر اصرار کرنا چاہئے تھا کہ عدالت میں پگڑی باندھ کر جایا کروں۔ میں نے انہیں سمجھایا بجھایا اور یہ مثل یاد دلائی "جیسا دیس ویسا بھیس" میں نے کہا "اگر ہندوستان میں کوئی انگریز افسر پگڑی اتارنے کا حکم دیتا تو انکار کرنا جائز تھا لیکن نٹال کی عدالت میں جو دستور ہے اس کی پابندی سے انکار کرنا مجھے بہ حیثیت ایک رکن عدالت کے مناسب نہیں۔"

میں نے اس قسم کی دلیلوں سے اپنے دوستوں کو کسی قدر دھیما کیا لیکن انہیں اس معاملے میں اس اصول کا پوری طرح قائل نہ کر سکا کہ ایک ہی چیز مختلف صورتوں میں مختلف نقطۂ نظر سے دیکھی جا سکتی ہے حالانکہ مجھے زندگی بھر خود حق پرستی نے یہ سبق دیا ہے کہ صلح کی خاطر کسی قدر دب جانا بہت اچھی چیز ہے۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ روش ستیا گرہ کا لازمی جزو ہے۔ اس کے سبب سے مجھے اکثر اپنی جان خطرے میں ڈالنا اور دوستوں کی خفگی اٹھانا پڑی مگر حق ہیرے کی طرح سخت ہے اور شگوفے کی طرح نازک۔

انجمن وکلا کی مخالفت سے جنوبی افریقہ میں میری اور بھی شہرت ہو گئی۔ بہت سے اخباروں نے انجمن کو اس مخالفت پر ملامت کی اور اسے حاسد قرار دیا۔ اس شہرت سے ایک حد تک میرے کام میں آسانی پیدا ہو گئی۔

انیسواں باب

نٹال انڈین کانگریس

وکالت میرے لئے اول سے آخر تک ایک ضمنی مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی۔ نٹال کے قیام میں میرا جو مقصد تھا اسے پورا کرنے کے لئے یہ لازم تھا کہ میں پبلک کام پر پوری توجہ صرف کروں۔ ہندوستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف محض عرضداشت بھیج دینا کافی نہ تھا۔ وزیر نوآبادیات کو متاثر کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں میں جوش پھیلانے کی مسلسل کوشش کی جائے۔ یہ قرار پایا کہ اس مقصد کے لئے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہئے میں نے سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ نئی انجمن کا نام کیا رکھا جائے۔ ایسے نام کی ضرورت تھی جو اس کا تعلق کسی خاص پارٹی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں سے ظاہر کرتا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ "کانگریس" کا نام انگلستان کے قدامت پسندوں میں بہت بدنام ہے مگر ہندوستان کی جان کانگریس ہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اسے نٹال میں ہردلعزیز بناؤں۔ اس نام کے اختیار کرنے میں ہچکچانا بزدلی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے مفصل دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ اس انجمن کا نام نٹال انڈین کانگریس رکھا جائے۔ اس طرح ۲۲ مئی کو نٹال انڈین کانگریس معرض وجود میں آئی۔

اس روز دادا عبداللہ کا وسیع کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب حاضرین نے بڑے جوش کے ساتھ کانگریس کے قیام پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کا دستور اساسی

بالکل سیدھا سادہ تھا اور چندہ بہت تھا۔ اس کا ممبر وہی شخص ہو سکتا تھا جو پانچ شلنگ ماہوار دے۔ مرفہ الحال طبقے کے لوگ اس پر آمادہ کئے گئے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ چندہ دے سکیں دیا کریں۔ عبداللہ سیٹھ نے سب سے زیادہ یعنی دو پاؤنڈ ماہوار چندہ لکھوایا۔ دو اور دوستوں نے ان کی تقلید کی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنے چندے میں کمی نہیں کرنا چاہئے اس لئے ایک پونڈ ماہوار میں نے بھی لکھ دیا۔ یہ میرے لئے کوئی چھوٹی رقم نہ تھی۔ لیکن میں نے خیال کیا کہ اگر میرا کام ذرا بھی چل گیا تو اتنا دینا میری مقدرت سے باہر نہ ہوگا اور خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا۔ ممبروں کی ایک معقول تعداد نے ایک پونڈ چندہ لکھوایا۔ دس شلنگ دینے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں نے یکمشت عطیے دئے جو خوشی کے ساتھ قبول کئے گئے۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ ایک بار مانگنے سے کوئی شخص چندہ نہیں دیتا اور جو ممبر ڈربن کے باہر رہتے تھے انکے یہاں بار بار جانا ناممکن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارا جوش ہانڈی کا سا اُبال تھا جو چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ خود ڈربن کے ممبر بھی بغیر بار بار کے تقاضے کے چندہ نہیں دیتے تھے۔

چندہ جمع کرنے کا کام میرے متعلق تھا کیونکہ سکریٹری میں ہی تھا۔ کچھ دنوں میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ میرا محرر دن بھر چندہ مانگتا پھرتا تھا۔ وہ بیچارا اس کام سے عاجز آگیا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس صورت حال میں اصلاح کرنا ہے تو چندے کی وصولی ماہوار نہیں بلکہ سالانہ ہونا چاہئے اور وہ بھی پیشگی۔ اس لئے میں نے کانگریس کا جلسہ کیا۔ ہر شخص نے خوشی سے یہ تجویز منظور کی کہ چندہ بجائے ماہوار کے سالانہ کر دیا جائے اور کم سے کم تین پاؤنڈ رکھا جائے۔ اس سے وصولی کے کام میں بڑی آسانی ہوگئی۔ میں نے پہلے ہی یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ پبلک کام قرض کے روپئے سے کبھی نہیں

کرنا چاہئے۔ لوگوں کا اعتبار اور بہت سی باتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر روپے کے
معاملے میں نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے لوگوں کو کبھی موعودہ چندہ ادا کرنے میں مستعد نہیں
پایا اور نٹال کے ہندوستانی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اس لئے میں نے بغیر روپے
کے کبھی کوئی کام شروع نہیں کیا اور نٹال انڈین کانگریس کبھی مقروض نہیں رہی۔
میرے رفیقوں نے ممبر بنانے میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ یہ ایسا کام تھا
جس سے انہیں دلچسپی بھی تھی اور بہت قیمتی تجربہ حاصل ہوتا تھا۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں
نقد چندہ ادا کر کے ممبر بننے لگے۔ اندرون ملک کے دور افتادہ دیہات میں کام کرنا
دقت سے خالی نہ تھا۔ لوگ پبلک کام کی ماہیت سے واقف نہ تھے پھر بھی ہمیں
لوگ دور دراز مقامات سے بلاتے تھے اور ہر جگہ کے بڑے تاجر ہمیں اپنے یہاں
مہمان رکھتے تھے۔

ایک بار دورے میں ذرا مشکل پڑ گئی۔ ہمیں توقع تھی کہ ہمارے میزبان چھ پاؤنڈ
چندہ دیں گے لیکن انہوں نے تین پاؤنڈ سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا۔ اگر ہم
ان سے یہ رقم وصول کر لیتے تو دوسرے بھی انکی تقلید کرتے اور ہمارا مجموعی چندہ بہت
کم ہو جاتا۔ رات زیادہ آ گئی تھی اور ہم بہت بھوکے تھے۔ لیکن ہم جتنی رقم لینے پر اڑے
ہوئے تھے اسے وصول کئے بغیر کھانا کیونکر کھاتے؟ ہم نے لاکھ سر مارا مگر کوئی اثر
نہ ہوا۔ ہمارے میزبان کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ اس مقام کے دوسرے تاجر انہیں
سمجھاتے رہے اور ساری رات جاگتے گذر گئی مگر نہ وہ اپنی بات سے ذرہ برابر ہٹے اور
نہ ہم۔ میرے بہت سے رفیق غصے سے کھول رہے تھے مگر انہوں نے ضبط سے کام
لیا۔ خدا خدا کر کے صبح تڑکے ہمارے میزبان پسیجے۔ انہوں نے چھ پاؤنڈ دیئے اور ہم
نے خوب کھانا کھایا۔ یہ ٹونگاٹ کا واقعہ ہے مگر اسکا اثر اسٹینگر سے لے کر جو شمالی ساحل
پر واقع ہے اندرون ملک میں چارلس ٹاؤن تک پڑا اور اسکی بدولت وصولی کا کام جلدی ہونے لگا

مگر ہمارا کام صرف یہی نہ تھا کہ چندہ جمع کرتے رہتے بلکہ میں نے تو عرصے سے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ جتنے روپے کی ضرورت ہو اس سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھنا چاہئے۔

جلسہ مہینے میں ایک بار یا اگر ضرورت ہو تو ہفتے میں ایک بار ہوتا تھا پچھلے جلسے کی روداد پڑھی جاتی تھی اور ہر قسم کے سوالات پر بحث ہوتی تھی۔ لوگوں کو پبلک مباحثوں میں شرکت کا اور مختصر اور برمحل تقریر کرنے کا تجربہ نہ تھا۔ ہر شخص تقریر کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ میں نے انہیں پبلک جلسوں کے ضوابط سمجھائے اور یہ لوگ انکی پابندی کرنے لگے۔ انہیں محسوس ہو گیا کہ یہ انکے لئے ایک تعلیم ہے اور بہت سے لوگ جنہیں کبھی مجمع کے سامنے تقریر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس کے عادی ہو گئے کہ پبلک مسئلوں کے متعلق اپنے خیالات عام جلسے میں بیان کر سکیں۔

مجھے معلوم تھا کہ پبلک کام میں کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے اخراجات میں بہت روپیہ صرف ہو جاتا ہے اس لئے میں نے یہ طے کیا تھا کہ ابتدا میں رسید بہیاں تک نہیں چھپوانا چاہئیں۔ میرے دفتر میں ایک نقل کی مشین تھی۔ اسی پر میں رسیدوں اور رپورٹوں کی نقلیں لے لیا کرتا تھا۔ ان چیزوں کو چھپوانا میں نے اس وقت شروع کیا جب کانگریس کے پاس روپیے کی افراط ہو گئی اور ممبروں کی تعداد اور کام کی مقدار بہت بڑھ گئی۔ اس طرح کی کفایت شعاری ہر انجمن کے لئے ضروری ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت کم برتی جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک چھوٹی مگر ترقی پذیر انجمن کی ابتدائی حالت کا ذکر کرتے ہوئے یہ تفصیلات بیان کر دوں۔

لوگوں کو روپیہ دے کر رسید لینے کی پروا نہ تھی لیکن ہم ہمیشہ بڑے اصرار سے رسید دیا کرتے تھے۔ اس طرح پائی پائی کا حساب رہتا تھا اور میرے خیال میں ۱۸۹۴ء کے حسابات نٹال انڈین کانگریس کے دفتر میں ابتک محفوظ ہوں گے۔ حساب کے معاملے میں احتیاط ہر انجمن کے لئے ضروری ہے۔ بغیر اس کے وہ بدنام ہو جاتی ہے جبتک

حساب باقاعدہ نہ ہو حق کی اصل پاکیزگی قائم رہنا ناممکن ہو۔

کانگریس کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں وہ تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی شریک تھے جو افریقہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ کانگریس کے ماتحت افریقی ہندیوں کے لئے ایک تعلیمی انجمن قائم کی گئی جس کے ارکان زیادہ تر یہی تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ انہیں کچھ برائے نام چندہ بھی دینا پڑتا تھا۔ اس انجمن میں وہ اپنی ضرورتوں اور شکایتوں کو ظاہر کر سکتے تھے یہاں انکی غور و فکر کی قوت ابھرتی تھی، انہیں ہندوستانی تاجروں سے ملنے جلنے کا اور اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ ایک طرح کا دارالمباحثہ تھا۔ اس کے ارکان پابندی سے جمع ہوا کرتے تھے اور مختلف مضامین پر تقریریں کرتے تھے۔ یا مضامین پڑھتے تھے۔ انجمن کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا۔

کانگریس کا تیسرا کام تھا تبلیغ و اشاعت یعنی افریقہ اور انگلستان کے انگریزوں اور ہندوستان کے لوگوں کو نٹال کے صحیح حالات سے آگاہ کرنا، میں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو پمفلٹ لکھے پہلے کا نام تھا "جنوبی افریقہ کے ہر برطانوی سے ایک درخواست" اسمیں میں نے نٹال کے ہندوستانیوں کی عام حالت مع اعداد و شمار بیان کی اور ہر بات کا ثبوت دیا تھا دوسرے کا نام تھا "ہندوستانی اور ووٹ کا حق — ایک درخواست" اس میں نٹال کے ہندوستانیوں کے مسئلہ ووٹ کی ایک مختصر سی تاریخ مع اعداد و شمار لکھی تھی۔ میں نے یہ رسالے بڑی محنت اور بڑے مطالعے کے بعد لکھے تھے۔ میری محنت ٹھکانے لگی اور ان رسالوں کی خوب اشاعت ہوئی۔

اس ساری جد و جہد کا نتیجہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بہت سے دوست پیدا ہو گئے اور ہندوستان کی سب پارٹیوں کو اس مسئلے ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی۔ اس کے علاوہ خود افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک معینہ راہ عمل نظر آنے لگی

بیسواں باب

بالاسندرم

دل کی سچی اور پاک آرزو ہمیشہ پوری ہوتی ہے۔ میں نے خود اس اصول کی صحت کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنے کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس کی بدولت میں ان میں مل جل کر رہا اور انہیں کا ہو رہا۔

نٹال انڈین کانگرس میں افریقی ہندی اور محرر وغیرہ شامل تھے لیکن بے سیکھے مزدور اور پابند مزدور[1] ابھی شریک نہیں کئے گئے تھے۔ ابھی تک کانگرس انکی نہ تھی۔ ان لوگوں میں اتنی مقدرت نہ تھی کہ چندہ دے کر اس کے رکن بنیں۔ کانگرس انہیں صرف اسی طرح اپنا کر سکتی تھی کہ انکی خدمت کرے۔ اس کا ایک موقع آیا لیکن سچ پوچھئے تو ابھی تک نہ کانگریس اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار تھی اور نہ میں تھا۔ ابھی مجھے وکالت شروع کئے دو ہی تین مہینے ہوئے تھے اور کانگرس بالکل ابتدائی حالت میں تھی کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تامل چیتھڑے لگائے، اپنا پھیٹا ہاتھ میں لئے میرے سامنے کھڑا کانپ رہا ہے اور رو رہا ہے، اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ مجھے اس شخص کا سارا حال اپنے محرر سے معلوم ہوا جو خود تامل تھا۔ آنے والے کا نام بالاسندرم تھا اور یہ نٹال کے ایک مشہور یورپی کے یہاں پابند مزدور تھا۔ اس کے آقا نے غصے کے مارے آپے سے باہر ہو کر اسے اتنا مارا کہ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

---

(1)

میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ اُن دنوں وہاں صرف یورپی ڈاکٹر تھے۔ میں ایک تصدیق نامہ چاہتا تھا جس سے معلوم ہو بالاسندرم کو کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ مجھے یہ تصدیق نامہ مل گیا اور میں نے فوراً بالاسندرم کو مجسٹریٹ کے یہاں لے جاکر بیان حلفی داخل کرادیا۔ مجسٹریٹ اسے پڑھ کر آگ ہوگیا اور اس نے فوراً آقا کے نام سمن جاری کردیا۔

میری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ آقا کو سزا دلاؤں۔ میں تو صرف بالاسندرم کو اس کے پنجے سے چھڑانا چاہتا تھا۔ پابند مزدوروں کے متعلق جو قانون تھا وہ میں نے پڑھا اگر معمولی نوکر بغیر پہلے سے اطلاع دئے نوکری چھوڑ دے تو اس کا آقا اس پر دیوانی میں مقدمہ چلا سکتا تھا۔ مگر پابند مزدور کی حالت بالکل دوسری تھی۔ اس پر ایسی صورت میں فوجداری میں مقدمہ چلایا جاتا تھا اور اگر وہ مجرم قرار پائے تو اسے قید کی سزا ہوتی تھی۔ اسی لیے سر ولیم ہنٹر نے کہا تھا کہ پابند مزدوری غلامی سے کم نہیں۔ پابند مزدور بھی غلام ہی کی طرح اپنے آقا کی ملک ہوا کرتا تھا۔

بالاسندرم کو چھڑانے کی صرف دو تدبیریں تھیں یا تو پابند مزدوروں کے محافظ[1] سے درخواست کی جاتی کہ وہ اس کے معاہدے کو منسوخ کردے یا اسے کسی اور شخص کی ماتحتی میں دیدے یا خود بالاسندرم کے آقا سے کہا جاتا کہ وہ اسے سبکدوش کردے۔ میں نے اس کے آقا کے پاس جاکر کہا "میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ پر مقدمہ چلاؤں اور آپ کو سزا دلاؤں۔ میرے خیال میں آپ کو خود یہ احساس ہوگا کہ آپ نے اس شخص کو بہت بری طرح مارا ہے۔ میرے اطمینان کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ اس کی خدمات کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کردیں۔" اس پر وہ فوراً راضی ہوگیا۔ اس کے بعد میں محافظ

---

(۱) ایک سرکاری عہدہ دار جس کا کام یہ تھا کہ پابند مزدوروں کی نگرانی اور ان کے حقوق کی حفاظت کرے۔

سے ملا۔ اس نے بھی رضامندی ظاہر کی مگر اس شرط پر کہ میں خود بالاسندرم کے لیے کوئی نیا آقا ڈھونڈھوں۔

اس لئے میں نے تلاش شروع کر دی۔ یہ شرط تھی کہ کوئی فرنگی آقا ہو کیونکہ ہندوستانیوں کو پابند مزدور رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان دنوں مجھ سے بہت کم یورپیوں سے ملاقات تھی۔ ان میں سے ایک سے میں ملا وہ ازراہ مہربانی بالاسندرم کو لینے پر راضی ہو گیا میں نے اس مہربانی کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجسٹریٹ نے بالاسندرم کے پہلا آقا کو مجرم قرار دیا اور فیصلے میں لکھدیا کہ وہ (باہمی تصفیہ کی بنا پر) بالاسندرم کی خدمات کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔

بالاسندرم کے معاملے کی خبر ہر پابند مزدور کو ہو گئی اور میں ان مزدوروں کا دوست سمجھا جانے لگا۔ مجھے اس رابطے کے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔ میرے دفتر میں پابند مزدوروں کا تانتا لگ گیا اور مجھے انکے رنج و راحت سے واقف ہونے کا بہترین موقع ملا۔

اس معاملے کی صدائے بازگشت دور دراز مدراس تک میں سنی گئی۔ اس صوبے کے مختلف حصے کے مزدور جو معاہدہ کر کے نٹال جایا کرتے تھے اپنے ان بھائیوں کے ذریعے سے جو افریقہ میں مقیم تھے اس سے واقف ہو گئے۔

خود اس معاملے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن پابند مزدور کو یہ دیکھ کر کہ نٹال میں ایک شخص انکی حمایت کے لئے اور کھلم کھلا انکا ساتھ دینے کے لئے موجود ہے بڑی خوشی ہوئی اور انکا دل امید سے معمور ہو گیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جب بالاسندرم میری دفتر میں آیا تھا اپنا پھٹیا ہاتھ میں لئے تھا۔ اس بات کا ایک افسوس ناک پہلو تھا جس سے ہم لوگوں کی ذلت ظاہر ہوتی تھی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ مجھے عدالت نے پگڑی اتارنے کا حکم دیا تھا۔ ہر پابند مجبور اور ہر اجنبی ہندوستانی

کے لئے زبردستی یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ جب کسی یورپی کے سامنے جائے تو اپنی پگڑی، یا ٹوپی یا ہیٹیا اتار کر جائے۔ صرف سلام چاہے وہ دونوں ہاتھوں سے کیا جائے کافی نہ تھا۔ بیچارہ بالاسندرم یہ سمجھا کہ اسے میرے سامنے بھی اسی طرح آنا چاہئے۔ میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی میری اس طرح تعظیم کرے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے اس سے کہا کہ اپنا ہیٹیا باندھ لے۔ اس نے کچھ تامل کے بعد میری بات مانی مگر اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اسے بڑی خوشی ہوئی۔

یہ بات میرے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہی کہ لوگ اپنے ہم جنسوں کی ذلت میں اپنی عزت کیونکر سمجھتے ہیں۔

اکیسواں باب

تین پاؤنڈ کا محصول

بالاسندرم کے معاملے کی بدولت مجھے پابند مزدوروں سے تھوڑی بہت واقفیت ہوگئی۔ مگر ان کی حالت کا گہرا مطالعہ کرنے پر مجھے اس تحریک نے آمادہ کیا جو ان پر ایک بھاری محصول عائد کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

اسی سال یعنی ۱۸۹۴ء میں حکومت نٹال نے ارادہ کیا کہ پابند مزدوروں پر پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول لگائے۔ مجھے اس تجویز نے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس مسئلے کو کانگرس کے سامنے پیش کیا۔ اور یہ تجویز منظور کرائی کہ اس محصول کی مخالفت کے لئے ضروری انتظام کیا جائے۔

مجھے پہلے اختصار کے ساتھ یہ بتا دینا چاہیے کہ اس محصول کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی۔ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ نٹال کے یورپیوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہاں گنے کی کاشت بہت بڑے پیمانے پر ہو سکتی ہے اور انہیں مزدوروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بغیر باہر کے مزدوروں کے گنے کی کاشت اور شکر سازی ناممکن تھی کیونکہ نٹال کے زولو اس قسم کے کام کے لئے موزوں نہ تھے۔ اس لئے نٹال کی حکومت نے حکومت ہند سے خط و کتابت کی اور ہندوستان سے مزدور بلانے کی اجازت لے لی۔ یہ طے ہوا کہ ان مزدوروں سے پانچ سال نٹال میں کام کرنے کا معاہدہ لے لیا جائے اور اس کے بعد انہیں اختیار ہو کہ وہیں سکونت اختیار کرلیں اور زمین خرید لیں۔ اس طرح انہیں نٹال آنے کی ترغیب دلائی گئی کیونکہ اس وقت یورپیوں کا یہ خیال تھا کہ معاہدے کی میعاد کے اندر ہندوستانی

مزدوروں کی محنت سے انکی زراعت کافی ترقی کرے گی۔

لیکن ہندوستانیوں سے جتنی توقع تھی انہوں نے اس سے بھی زیادہ کام کیا۔ انہوں نے ترکاریوں کی کاشت کو بھی بہت ترقی دی۔ بہت سی نئی ترکاریاں ہندوستان سے لاکر بوئیں اور دیسی ترکاریوں کی کاشت اس طریقے سے کی کہ وہ پہلے سے سستی پڑیں انہیں نے پہلے پہل آم کے درخت بھی لگائے۔ انکا حوصلۂ عمل زراعت ہی تک محدود نہیں رہا۔ انہوں نے تجارت شروع کی، زمین خرید کر مکان بنائے اور مزدور کی حیثیت سے ترقی کرکے زمیندار اور مکاندار بن گئے۔ انکے بعد ہندوستان کے تاجر آئے۔ اور تجارت کے لئے یہیں بس گئے۔ ان میں سب سے پہلے سیٹھ ابوبکر اموود مرحوم آئے تھے۔ انہوں نے تھوڑے ہی دن میں اپنے کاروبار کو بہت ترقی دے لی۔

یورپی تاجروں کو بڑا خطرہ پیدا ہوگیا۔ جب وہ ہندوستانی مزدوروں کو خوشی خوشی لائے تھے تو انہیں خبر نہ تھی کہ یہ تجارت میں اتنے ہوشیار ہیں۔ یہاں تک تو غنیمت تھا کہ یہ ہندوستانی آزاد کاشتکار یا زمیندار بنیں لیکن یورپی تاجر اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ یہ لوگ تجارت میں بھی مقابلہ کرنے لگے۔

اس طرح انکے دل میں ہندوستانیوں سے عداوت کی بنیاد پڑی۔ بہت سی اور چیزیں تھیں جنہوں نے اسے ترقی دی۔ ہمارا طرز معاشرت جو انکی زندگی سے بالکل مختلف تھا، ہماری سادگی، ہمارا تھوڑے نفع پر قناعت کرنا، ہمارا حفظان صحت کے اصولوں سے بے پروا ہونا عام صفائی کا خیال نہ رکھنا، مکانوں کی مرمت میں کنجوسی کرنا۔ پھر سب سے بڑھ کر اختلاف مذہب ان سب چیزوں نے عداوت کی آگ کو خوب بھڑکایا۔ اس کا اظہار قانون سازی میں اس طرح ہوا کہ ہندوستانی ووٹ کے حق سے محروم کردئے گئے اور پابند مزدوروں پر محصول تجویز کیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی نیش زنی شروع کر دی گئی۔

پہلی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی مزدور زبردستی اپنے دیس کو بھیج دئے جائیں تاکہ انکے معاہدے کی میعاد ہندوستان میں ختم ہو۔ لیکن حکومت ہند سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اسے منظور کرے گی۔ اس لئے دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ

۱۔ جب ہندوستانی مزدور کے معاہدے کی میعاد ختم ہو تو وہ ہندوستان چلا جائے

یا

۲۔ ہر دو سال کے بعد اس سے کسی قدر زیادہ اجرت پر کام کرنے کا معاہدہ لے لیا جائے۔

اور اگر

۳۔ وہ ان دونوں باتوں پر راضی نہ ہو تو پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول دیا کرے۔

ایک وفد جو سر ہنری بنس اور مسٹر میس پر مشتمل تھا ہندوستان بھیجا گیا کہ یہ تجویز حکومت ہند سے منظور کرلے۔ وائسرائے اس زمانے میں لارڈ ایلگین تھے۔ انہوں نے پچیس پاؤنڈ کے محصول کو پسند نہیں کیا۔ مگر اس پر راضی ہو گئے کہ فی کس تین پاؤنڈ محصول لگایا جا سکے۔ میرا اس وقت یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ ویسرائے نے اس معاملے میں بڑی غلطی کی۔ اس محصول کو منظور کرتے وقت انہوں نے ہندوستان کے فائدے کا بالکل خیال نہیں کیا۔ نٹال کے فرنگیوں کی رضاجوئی ہرگز انکے فرائض میں داخل نہ تھی۔ اس تجویز کی روسے تین چار سال کے بعد ہر پابند مزدور کو، اس کی بیوی کو، اس کے لڑکے کو جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہو اور لڑکی کو جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ ہو یہ محصول دینا پڑتا۔ چار آدمیوں کے ایک خاندان سے جس میں میاں بیوی اور دو بچے ہوں بارہ پاؤنڈ محصول لینا ایسی حالت میں کہ خاندان کے افسر کی اوسط آمدنی چودہ شلنگ ماہوار سے زیادہ نہ ہو اتنا بڑا ظلم تھا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہ ملتی۔

ہم نے اس محصول کے خلاف بڑی سخت جدوجہد شروع کی ۔ اگر نٹال انڈین کانگرس
اس معاملے میں خاموش رہتی تو ممکن تھا کہ وائسرائے پچیس پاؤنڈ تک کے محصول پر راضی
ہو جاتے ۔ پچیس پاؤنڈ سے گھٹ کر تین پاؤنڈ محصول رہ جانا غالباً محض کانگرس کے
احتجاج کا نتیجہ تھا ۔ مگر ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو ۔ شاید حکومت ہند ابتدا ہی سے پچیس
پاؤنڈ محصول کی مخالف ہو اور اس نے بغیر کانگرس کے احتجاج کا خیال کئے خود اپنی
طرف سے تین پاؤنڈ محصول تجویز کیا ہو ۔ بہر حال حکومت ہند نے اپنے فرض کے ادا
کرنے میں غفلت کی ۔ وائسرائے ہند ہندوستان کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ہیں اس لئے
انہیں کبھی اس وحشیانہ محصول پر راضی نہیں ہونا چاہئے تھا ۔

کانگرس نے اگر محصول کو پچیس پاؤنڈ سے گھٹا کر تین پاؤنڈ کرا دیا تو کوئی بڑا
کام نہیں کیا ۔ اس کے کارکنوں کو اب بھی یہ قلق تھا کہ وہ پابند مزدوروں کے حقوق
کی پوری حفاظت نہیں کر سکے ۔ وہ ہمیشہ اس ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی کہ
محصول کو معاف کرائے مگر اس کا یہ ارادہ بیس سال کے بعد پورا ہوا اور اس وقت بھی
صرف نٹال کے ہندوستانیوں کی کوشش سے نہیں بلکہ سارے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں
کی متحدہ جدوجہد سے ۔ جب حکومت نے مسٹر گوکھلے سے بدعہدی کی تو آخری لڑائی
شروع ہوئی جس میں پابند ہندوستانی مزدوروں نے پورا حصہ لیا ۔ ان میں سے
بعض نے گولی کھا کر جان دی اور دس ہزار قید ہوگئے ۔

لیکن آخر میں حق کا بول بالا ہوا ۔ ہندوستانیوں نے جو تکلیفیں برداشت کیں
وہ گویا حق کی آواز تھی ۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ استوار عقیدہ، انتہائی صبر اور ان تھک کوشش
نہ ہوتی تو یہ آواز غالب نہ آتی ۔ اگر ہندوستانی ہمت ہار بیٹھتے ، اور کانگرس محصول کو اٹل سمجھ کر
لڑائی سے ہاتھ اٹھا لیتی تو یہ قابل نفرت محصول آج تک پابند مزدوروں پر مسلط ہوتا جس میں نہ صرف
جنوبی افریقہ کی بلکہ سارے ہندوستان کی انتہائی ذلت تھی ۔

بائیسواں باب

مختلف مذاہب کا مطالعہ

میرے قومی خدمت میں محو ہو جانے کا اصلی سبب معرفت نفس کی آرزو تھی۔ میں نے اپنا دین و مذہب خدمت کو بنا لیا تھا یہ سمجھ کر کہ معرفت الٰہی کا ذریعہ صرف خدمت ہی ہے۔ اور خدمت کے معنی میں ہندوستان کی خدمت سمجھتا تھا کیونکہ اس کا موقع مجھے خود بخود بے تلاش کئے مل گیا اور میں اسی کے لئے موزوں بھی تھا۔ میں جنوبی افریقہ سیاحت کا لطف اٹھانے، کاٹھیاوار کی سازشوں سے نجات پانے اور کسب معاش کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے میں یہاں آکر خدا کی تلاش میں اور معرفت نفس کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

عیسائی دوستوں نے میرے دل میں ذوق معرفت کو ابھارا تھا اور یہ ذوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ میرے دوستوں کو اس معاملے میں اتنا انہماک تھا کہ اگر میں بے پروائی بھی کرتا تو بھی وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ ڈربن میں جنوبی افریقہ کی مشن کے سردار مسٹر سپنسر والٹن کو میرے اس ذوق کا پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھ سے راہ و رسم پیدا کی یہاں تک کہ مجھے اپنے عزیزوں کی طرح سمجھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس ملاقات کی بنا میرے اور پریٹوریا کے عیسائیوں کے تعلقات تھے۔ مسٹر والٹن کی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے مجھ سے کبھی عیسائی مذہب اختیار کرنے کے لئے نہیں کہا۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی کتاب کی طرح کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور مجھے اپنے کردار کے مشاہدے کا پورا موقع دیا۔۔ ان

کی بیوی بڑی نیک اور قابل تھیں مجھے ان میاں بیوی کا طرز عمل دل سے پسند تھا۔
وہ بھی یہ بات جانتے تھے اور میں بھی جانتا تھا کہ ہم دونوں کے عقائد میں زمین آسمان
کا فرق ہے اور کتنا ہی بحث و مباحثہ کیا جائے یہ فرق مٹنے والا نہیں۔ لیکن اگر
جانبین رواداری، لطف و مدارات اور سچائی سے کام لیں تو اختلاف عقائد
سے بھی فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ مجھے مسٹر والٹن کا انکسار، استقلال اور ذوق عمل بہت
پسند آیا۔ اور ہم دونوں میں اکثر ملاقات ہونے لگی۔

یہ دوستی میرے دل میں مذہب کی چنگاری کو دہکاتی رہی۔ اب مجھے پڑھنے
کی ایسی فرصت نصیب نہ تھی کہ پورے انہماک سے مذہب کا مطالعہ کرتا۔ پھر بھی جو
تھوڑا بہت وقت ملتا تھا اس سے میں اچھی طرح کام لیتا تھا۔ مذہبی مسائل پر میری
خط و کتابت اب بھی جاری تھی۔ رائے چند بھائی برابر میری رہنمائی کر رہے تھے۔ ایک
دوست نے مجھے نرمد شنکر کی کتاب دھرم وچار بھیجی۔ اس کا دیباچہ میرے لئے بہت
مفید ثابت ہوا۔ میں اس شاعر کے لاابالی طرز زندگی کا حال سن چکا تھا۔ دیباچے
میں یہ پڑھ کر کہ مذہبی کتابوں کے مطالعے سے اس کی زندگی میں کایا پلٹ ہو گئی
میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کا ایک ایک
حرف نہایت غور سے پڑھا۔ میں نے میکس ملر کی کتاب "ہندوستان ہمیں کیا سکھاتا
ہے" اور اس کا "اپانشد" کا ترجمہ جو انجمن تھیاسوفی کی طرف سے شائع ہوا
تھا بڑے شوق سے پڑھا۔ ان سب چیزوں سے میرے دل میں ہندو دھرم کا
احترام بڑھ گیا اور اس میں مجھے بہت سی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ مگر اس کے سبب
سے میرے دل میں دوسرے مذہبوں کی طرف سے کسی قسم کا تعصب پیدا نہیں ہوا۔ میں نے
واشنگٹن ارونگ کی کتاب "حضرت محمدؐ اور ان کے خلفا کی سیرت" اور کارلائل کا
مقالہ پیغمبر اسلام کی مدح میں پڑھا۔ ان کتابوں کی بدولت میری نظر میں آنحضرت

کی عظمت اور زیادہ ہوگئی۔ ایک اور کتاب "اقوال زرتشت" بھی میری نظر سے گذری۔
اس طرح مختلف مذہبوں سے میری واقفیت بڑھ گئی۔ اس مطالعے سے مجھے
مشاہدۂ نفس کا شوق ہوگیا اور اس بات کی عادت پڑ گئی کہ جو بات میرے دل کو لگے اس
پر عمل کیا کروں۔ چنانچہ ہندو دھرم کی بعض کتابوں کو پڑھنے کے بعد میں یوگ کی کچھ
ریاضتیں جس طرح میری سمجھ میں آئیں، کرنے لگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں
چلتا اور یہ طے کیا کہ جب ہندوستان واپس جاؤں گا تو کسی واقف کار کی مدد سے یہ
ریاضتیں کروں گا۔

میں نے ٹالسٹائے کی تصانیف کا بھی غور سے مطالعہ کیا۔ اس کی کتاب "انجیل کا
خلاصہ، راہ عمل" کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ مجھے رفتہ رفتہ یہ یقین ہونے لگا کہ عالمگیر
محبت کا اصول نامحدود امکانات رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں مجھ سے ایک اور عیسائی خاندان سے راہ ورسم ہوگئی۔ میں ہر اتوار
کو ویسلی گرجے میں جایا کرتا تھا۔ اس خاندان کی طرف سے مجھے عام دعوت تھی کہ
اتوار کو رات کا کھانا انکے یہاں کھایا کروں۔ گرجے میں جانے سے میرے دل پر کچھ اچھا
اثر نہیں پڑا۔ وہاں کے وعظ مجھے تاثیر اور ذوق سے خالی معلوم ہوتے تھے۔ حاضرین
بھی کچھ ایسے دیندار نظر نہیں آتے تھے۔ انکے دلوں میں ذوق وشوق کا پتہ نہ تھا۔ دنیا
داروں کی ایک جماعت تھی جو تفریح طبع اور رسم کی پابندی کے لئے گرجے چلی جاتی تھی۔
میں یہاں کبھی کبھی بلا ارادہ اونگھنے لگتا تھا۔ مجھے شرم آتی تھی مگر اپنے ہمنشینوں کو اسی
حال میں دیکھ کر کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ میں اس حالت کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا
تھا۔ اس لئے میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔

اس گھرانے سے جہاں میں ہر اتوار کو مہمان ہوا کرتا تھا میرے تعلقات دفعتہً منقطع
ہو گئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مجھے وہاں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ:

ہے کہ میرے میزبان کی بیوی بڑی نیک اور بھولی بھالی تھیں مگر کسی قدر تنگ خیال تھیں مجھ سے ان سے اکثر مذہبی مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ میں ان دنوں میں آرنلڈ کی "نور ایشیا" کا دوبارہ مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک بار ہم دونوں حضرت عیسیٰ اور گوتم بدھ کی زندگی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں نے کہا "دیکھئے گوتم کے دل میں دوسروں کا کتنا درد تھا ان کی ہمدردی انسانوں تک محدود نہ تھی بلکہ ساری مخلوق خدا کو محیط تھی۔ آپ ہی بتلائیے جب ہم انہیں تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ ایک میمنے کو کندھے پر بٹھائے لئے جارہے ہیں تو ہمارے دل میں محبت کا دریا اُمڈ آتا ہے یا نہیں؟ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں سارے جانداروں سے یہ ہمدردی نظر نہیں آتی۔"

اس مقابلے سے اُن نیک خاتون کو دُکھ ہوا۔ مجھے اُن کے احساسات کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے گفتگو وہیں پر ختم کر دی اور ہم سب اٹھ کر کھانا کھانے چلے آئے۔ ان کا پانچ سال کا پیارا پیارا بچہ بھی ساتھ تھا۔ میں بچوں سے مل کر جتنا خوش ہوتا ہوں کسی چیز سے نہیں ہوتا اور اس بچے سے مجھ سے پرانی دوستی تھی۔ اس کی رکابی میں ایک گوشت کا ٹکڑا تھا اور میری رکابی میں سیب تھا۔ میں نے اس کے گوشت کی بڑی برائی کی اور اپنے سیب کی بہت تعریف کی۔ معصوم بچہ میری باتوں سے متاثر ہو کر پھل کی تعریف میں میرا ہمزبان ہو گیا۔

مگر میں نے ماں کو جو دیکھا تو عجب حالت پائی۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میں متنبہ ہو گیا اور میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ دوسرے ہفتے میں وہاں گیا تو مگر کچھ رکتا ہوا۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ میں آنا جانا بند کر دوں۔ مگر مجھے وہاں جانا کچھ اچھا بھی نہ معلوم ہوا۔ نیک خاتون نے میری یہ مشکل حل کر دی۔ انہوں نے کہا "مسٹر گاندھی آپ برا نہ مانیں میں اپنا فرض جان کر کہتی ہوں کہ میرے لڑکے کیلئے آپ کی صحبت اچھی نہیں۔ ہر روز اُسے گوشت کھانے میں تامل

ہوتا ہے۔ وہ مجھے آپ کی دلیلیں یاد دلاتا ہے اور پھل مانگتا ہے۔ بس اب حد ہو گئی۔ اگر اس نے گوشت چھوڑ دیا تو وہ بیمار پڑ جائے گا اور بیمار نہیں تو کمزور ضرور ہو جائیگا۔ بھلا مجھ سے یہ کیونکر دیکھا جا سکتا ہے؟ آپ اب جو کچھ بحث کریں بڑوں سے کیا کریں۔ بچوں کو اس سے یقیناً نقصان پہنچے گا۔

میں نے کہا "بیگم صاحبہ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں آپ کی مادری محبت کا اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ میرے بھی بچے ہیں۔ اس ناگوار صورت حال کو رفع کرنا بہت آسان ہے۔ اگر میں یہاں آتا رہا تو بچہ دیکھے گا کہ میں کونسی چیز کھاتا ہوں اور کون سی نہیں کھاتا۔ اس کا اس پر میری گفتگو سے بھی زیادہ اثر پڑے گا۔ اس لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ میں یہاں آنا چھوڑ دوں۔ اس کے یقیناً یہ معنی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی دوستی ترک کر دیں"

انہوں نے کہا "بہت بہت شکریہ" اور اُنکے چہرے سے معلوم ہوتا تھا اُنکے دل پر سے بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

تیئیسواں باب

خانہ داری

گھر بار کا انتظام کرنا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن نٹال کا گھر بمبئی اور لندن والے گھر کی طرح نہیں تھا۔ یہاں بعض مصارف محض شان کے خیال سے کرنا پڑتے تھے۔ میں اُسے ضروری سمجھتا تھا کہ اپنا ساز و سامان ایسا رکھوں جو نٹال میں ایک ہندوستانی بیرسٹر اور قومی نمائندے کے مرتبے کے شایاں ہو۔ اس لئے میں نے ڈربن کے اس حصے میں جہاں عمائد شہر رہا کرتے تھے۔ ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لیا اور اسے مناسب طریقے سے سجایا۔ میری غذا سادہ تھی مگر چونکہ میں اکثر انگریز دوستوں اور ہندوستانی رفیقوں کی دعوت کیا کرتا تھا اس لئے خانہ داری کے مصارف بہت ہو جاتے تھے۔

ہر گھر کے لئے ایک اچھا نوکر ضروری ہے۔ مگر مجھے کبھی نوکر کو نوکر کی طرح رکھنا نہ آیا۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست رفیق اور مددگار کی حیثیت سے رہتا تھا اور ایک باورچی تھا جو میرے خاندان کا ایک رکن بن گیا تھا۔ دفتر کے محرر بھی میرے یہاں رہتے تھے اور میرے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اس تجربے میں خاصی کامیابی رہی مگر اسی کے ساتھ زندگی کے کچھ تلخ تجربے بھی ہوئے۔

میرا رفیق بہت تیز آدمی تھا اور میں اسے اپنا سچا بہی خواہ سمجھتا تھا۔ مجھے اس معاملے میں دھوکا ہوا۔ میرے ساتھ ایک محرر رہتا تھا جس سے وہ جلنے لگا اور اس نے

ایسا جال پھیلایا کہ مجھے اس محرر کی طرف سے شبہہ سا ہو گیا۔ یہ بھلا آدمی بڑا نازک مزاج تھا
جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ مجھے اس پر شبہہ ہے وہ میرے گھر اور دفتر دونوں کو خیر باد کہہ کر
چل دیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ شاید میں نے اس کے ساتھ ناانصافی
کی اور یہ خلش میرے دل سے کبھی نہیں گئی۔

اس عرصے میں میرا باورچی کسی کام سے چلا گیا اور اسکی جگہ دوسرا شخص رکھنے
کی ضرورت پڑی۔ اس نئے شخص کے متعلق مجھے آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ بڑا شریر ہے
مگر میرے لئے تو یہ خدا داد نعمت ثابت ہوا۔ دو ہی تین دن میں اسے پتہ چل گیا کہ میرے
گھر کے اندر میری لاعلمی میں ناجائز کارروائیاں ہوتی ہیں اور اس نے دل میں ٹھان لی
کہ مجھے آگاہ کر کے رہے گا۔ میری نسبت مشہور تھا کہ میں دوسروں پر بے جا اعتماد کر لیتا
ہوں مگر خود کھرا آدمی ہوں۔ اس لئے اس نے جو کچھ دیکھا اس سے اسے اور بھی صدمہ
ہوا۔ میں ایک بجے کھانا کھانے کے لئے دفتر سے گھر جایا کرتا۔ ایک دن بارہ بجے یہ
باورچی ہانپتا ہوا دفتر پہنچا اور اس نے مجھ سے کہا " مہربانی سے ابھی میرے ساتھ گھر
چلے چلئے۔ وہاں آپ کو عجیب تماشا نظر آئے گا۔"

میں نے کہا " یہ کیا بک رہے ہو۔ آخر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے۔ میں اس وقت
دفتر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟ "

" اگر آپ نہ چلے تو پچھتائیے گا۔ اب اور میں کیا کہوں "

اس کے اصرار کا مجھ پر اثر ہوا۔ میں ایک محرر کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلا۔ باورچی
آگے آگے تھا۔ وہ مجھے سیدھا کوٹھے پر لے گیا اور میرے رفیق کے کمرے کی طرف اشارہ
کر کے کہنے لگا " یہ دروازہ کھولئے اور اپنی آنکھ سے دیکھ لیجئے "

میں سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے دروازے پر دستک دی، صدا لے نہ برخاست
اب کی میں نے دروازہ اتنے زور سے دھڑدھڑایا کہ دیواریں تک ہلنے لگیں۔ آخر کواڑ

کھلے۔ اندر دیکھا کہ ایک فاحشہ عورت بیٹھی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوراً چلی جاؤ اور اب کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔
اپنے رفیق سے میں نے کہا "بس اب تم سے مجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں نے بڑا دھوکا کھایا۔ خوب بیوقوف بنا۔ میں نے تم پر جو اعتماد کیا تھا اسکا یہی بدلہ ہے؟"
بجائے اس کے کہ وہ کچھ سٹپٹاتا الٹا مجھے دھمکانے لگا کہ میں تمہارا پردہ فاش کر دوں گا۔
میں نے کہا "مجھے کوئی بات چھپانا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہو ساری دنیا سے کہدو۔ مگر میرے گھر سے اسی دم چلے جاؤ"
اس پر وہ اور بھی بگڑا۔ اب میں مجبور ہو گیا۔ میں نے محرر سے، جو نیچے کھڑا تھا، کہا وہ مہربانی سے ذرا پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر میرا سلام کہو اور یہ اطلاع دو کہ ایک شخص جو میرے ساتھ رہتا تھا بری حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔ اب میں اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتا مگر وہ جانے سے انکار کرتا ہے۔ اگر آپ چند سپاہیوں کو میری مدد کے لئے بھیج دیں تو بڑا احسان ہو۔"
اب اسے معلوم ہوا کہ میں واقعی سختی پر آمادہ ہوں۔ احساس جرم سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس نے مجھ سے عاجزی سے درخواست کی کہ پولیس کو اطلاع نہ دو۔ میں ابھی ابھی جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اپنا بوریا بندھنا لے کر رخصت ہو گیا۔
اس واقعے نے مجھے بروقت آگاہ کر دیا۔ اب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ اس شیطان نے مجھے کس قدر بہکایا تھا۔ اسے اپنے گھر رکھ کر میں نے اچھے کام کے لئے برا ذریعہ اختیار کیا تھا۔ جو کے کھیت سے گیہوں کاٹنا چاہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آوارہ شخص ہے مگر پھر بھی مجھے یقین تھا کہ یہ میرے ساتھ وفا کرے گا۔ اس کی اصلاح کی کوشش میں میں خود تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا میرے مہربان مجھے متنبہ کرتے رہے مگر میں نہ چیتا۔

دوستی نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔

اگر یہ نیا باورچی نہ آتا تو مجھے کبھی سچے واقعات کا پتہ نہ چلتا اور اس دوست کے ساتھ میں رہ کر میں کبھی بے تعلقی کی زندگی کے قابل نہ ہوتا جو میں نے اس کے بعد سے بسر کرنا شروع کی۔ میں اس شخص کے پیچھے اپنا وقت ضائع کرتا رہتا۔ اس میں یہ قدرت تھی کہ مجھے ہمیشہ غفلت اور گمراہی میں رکھتا۔

لیکن خدا نے جیسے ہمیشہ مجھے بچایا تھا اس بار بھی بچا لیا۔ میری نیت پاک تھی اسلئے میں باوجود غلطیوں کے ہلاکت سے محفوظ رہا اور شروع ہی میں یہ تجربہ ہو جانے سے آئندہ کے لئے مجھے سبق مل گیا۔

یہ باورچی گویا ایک قاصد غیبی تھا۔ وہ پکانا بالکل نہیں جانتا تھا اور باورچی کی حیثیت سے میرے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر یہ اسی کا کام تھا کہ اس نے مجھے بیدار کر دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی میرے گھر میں عورتیں لائی جا چکی تھیں مگر کسی شخص میں یہ ہمت نہ تھی جو اس باورچی میں تھی۔ سب جانتے تھے کہ میں اپنے رفیق پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرتا ہوں۔ یہ باورچی گویا خاص اسی کام کے لئے آیا تھا کیونکہ اسی وقت اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ کہنے لگا، "میں آپ کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ آپ بڑی جلدی دوسروں کے بہکانے میں آجاتے ہیں میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے اسے رخصت کر دیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس رفیق نے مجھے خواہ مخواہ میرے محرر سے بدظن کر دیا تھا۔ میں نے اس محرر کے ساتھ جو بے التفاتی کی تھی اب اسکی تلافی کی انتہائی کوشش کی مگر مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہا کہ اسکا دل کسی طرح مجھ سے صاف نہیں ہوا۔ جو شیشہ ایک بار ٹوٹ گیا وہ کبھی نہیں جڑتا۔

چوبیسواں باب

وطن کا رُخ

اب مجھے جنوبی افریقہ میں آئے تین سال ہو چکے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور یہ بھی مجھے خوب جان گئے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں میں نے ان سے چھ مہینے کے لئے اجازت مانگی کیونکہ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے افریقہ میں بہت دن رہنا ہے۔ میری وکالت اچھی خاصی چلتی تھی اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ اس لئے میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ گھر جا کر بیوی بچوں کو لے آؤں اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو جائے گی۔ تین پاؤنڈ کا محصول ہمارے جسم میں ناسور کی طرح تھا۔ جب تک یہ دور نہ ہو جائے ہمیں چین نہیں آسکتا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ میرے پیچھے کانگریس اور تعلیمی انجمن کے کام کو کون سنبھالیگا۔ میری نظر میں دو شخص تھے۔ آدمجی میاں خاں اور پارسی رستم جی۔ یوں تو ہمیں اب تاجروں کے طبقے سے بہت سے کارکن مل سکتے تھے۔ لیکن ان لوگوں میں جو سکرٹری کے فرائض باقاعدہ انجام دے سکتے تھے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سب سے ممتاز یہی دونوں حضرات تھے۔ ظاہر ہے کہ سکرٹری کے لئے کام چلانے بھر کی انگریزی جاننا ضروری تھا۔ میں نے کانگریس میں آدمجی میاں خاں (جو اب انتقال کر چکے ہیں) کا نام پیش کیا اور وہ سکرٹری مقرر کر دئے گئے۔ تجربے سے معلوم

ہوا کہ یہ انتخاب بہت موزوں تھا۔ آدمجی میاں خاں کے استقلال، فیاضی، مروت اور
اخلاق سے سب لوگ خوش تھے اور ہر شخص پر یہ ثابت ہوگیا کہ سکرٹری کے کام کے
لئے ایسے شخص کی ضرورت نہیں جس نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ہو یا انگلستان
میں اعلیٰ تعلیم پائی ہو۔

میں ۱۸۹۶ء کے وسط میں پنگولا جہاز سے جو کلکتے جا رہا تھا وطن روانہ ہوا۔

جہاز پر بہت کم مسافر تھے۔ ان میں سے دو انگریز افسر تھے جن سے مجھ سے بہت
بے تکلفی ہوگئی۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میں روزانہ ایک گھنٹہ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ جہاز
کے ڈاکٹر نے مجھے ایک کتاب دی جس کا نام تھا "بے معلم کے تامل سکھانیوالی"
میں نے اس کتاب کو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے نٹال میں تجربے سے یہ معلوم
ہوا تھا کہ مجھے مسلمانوں سے خلا ملا پیدا کرنے کے لئے اُردو اور مدراسیوں سے میل جول
رکھنے کے لئے تامل سیکھنا چاہئے۔

میرا ایک انگریز دوست بھی میرے ساتھ اُردو پڑھتا تھا۔ اس کی فرمائش سے
میں نے تیسرے درجے کے مسافروں میں ایک اُردو کا "منشی" ڈھونڈھ نکالا اور ہم
دونوں کی پڑھائی خوب ہونے لگی۔ اس انگریز کا حافظہ مجھ سے اچھا تھا۔ وہ جو لفظ ایک
بار دیکھ لیتا تھا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ مجھے اکثر اُردو حروف کے پہچاننے میں دقت ہوتی
تھی۔ میں نے بہت زور لگایا مگر اس کے برابر کبھی نہ پہنچ سکا۔

تامل میں میں نے خاصی ترقی کی۔ کوئی پڑھانے والا نہیں ملا لیکن کتاب بہت
اچھی لکھی ہوئی تھی اور مجھے خارجی مدد کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوئی۔

مجھے امید تھی کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی یہ مطالعہ جاری رکھ سکوں گا مگر یہ
بالکل ناممکن تھا۔ ۱۸۹۳ء کے بعد سے اب تک میں نے جو کچھ پڑھا ہے۔ زیادہ تر جیلخانے
میں پڑھا ہے۔ جو تھوڑی بہت تامل اور اردو مجھے آتی ہے وہ میں نے جیل ہی میں

سیکھی ہے ۔ تامل جنوبی افریقہ کے جیل میں اور اُردو یراؔو دا جیل میں۔ مگر تامل بولنا مجھے کبھی نہ آیا۔ اور پڑھنے کی مشق بھی اب چھوٹتی جاتی ہے۔

مجھے ابتک یہ احساس ہے کہ تامل اور تیلیگو نہ جاننے سے میں بڑے گھاٹے میں رہا۔ جنوبی افریقہ کے دراویڈیوں نے میرے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا تھا اس کی یاد مجھے ابتک عزیز ہے۔ جب کبھی کوئی تامل یا تیلیگو دوست نظر آتا ہے تو مجھے بے اختیار اس کے ان ہموطنوں کی عقیدت، استقلال، ایثار اور بے نفسی کا خیال آجاتا ہے جن کا میرا جنوبی افریقہ میں ساتھ تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ، مرد ہوں یا عورت، اَن پڑھ تھے جنوبی افریقہ کی لڑائی انھی لوگوں کے لئے تھی اور یہی ان پڑھ سپاہی اس میں لڑتے تھے غریبوں ہی کے لئے یہ لڑائی تھی اور غریب ہی اس میں دل وجان سے شریک تھے۔ ان کی زبان نہ جاننے سے اور چاہے جو نقصان ہوا ہو مگر اپنے ان نیک اور بھولے ہموطنوں کا دل مٹھی میں لینے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ لوگ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی اور انگریزی بول لیتے تھے اور ہمارا کام بغیر کسی دقت کے چلتا تھا۔ لیکن میں تامل اور تیلیگو سیکھ کر ان کی محبت کا معاوضہ کرنا چاہتا تھا۔ تامل تو میں نے تھوڑی بہت سیکھ بھی لی مگر تیلیگو میں، جس کے سیکھنے کی میں نے ہندوستان میں کوشش کی الف بے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اب میں غالبًا یہ زبانیں کبھی نہ سیکھ سکونگا اس لئے میری ساری امید اس پر منحصر ہے کہ دراویڈی ہندوستانی سیکھ لیں گے۔ جنوبی افریقہ میں ان میں سے جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ ہندی یا ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی سہی مگر بول لیتے ہیں۔ البتہ انگریزی جاننے والے اسے نہیں سیکھنا چاہتے گویا انگریزی جاننا خود اپنی زبانوں کے سیکھنے میں سدِ راہ ہے!

مگر میں مطلب سے دور چلا گیا۔ پہلے مجھے اپنے سفر کا بیان ختم کرلینا چاہئے۔ میں ناظرین کا تعارف پنگولا جہاز کے کپتان سے کرانا چاہتا ہوں جس سے میری دوستی ہوگئی

تھی۔ یہ نیک کپتان پلیمتھ برادر تھا۔ ہم دونوں میں گفتگو جہاز رانی پر نہیں بلکہ مذہبی مسائل پر ہوتی تھی۔ اس کے نزدیک مذہب اور اخلاق دو جداگانہ چیزیں تھیں۔ انجیل کو وہ بچوں کا کھیل سمجھتا تھا جس کی ساری خوبی اس کی سادگی میں ہے۔ اس کا قول تھا کہ سب مرد عورتیں اور بچے مسیح اور انکی قربانی پر عقیدہ رکھیں تو انکی نجات یقینی ہے اس دوست کو دیکھ کر مجھے پریٹوریا کا پلیمتھ برادر یاد آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو مذہب اخلاقی قیود عائد کرے وہ کسی کام کا نہیں۔ یہ ساری بحث میری نباتاتی غذا پر سے شروع ہوتی تھی۔ اس نے کہا کوئی وجہ نہیں کہ تم گوشت نہ کھاؤ چاہے وہ گائے کا ہو یا کسی اور جانور کا؟ خدا نے جس طرح نباتات کو انسان کی راحت کے لئے پیدا کیا ہے اسی طرح ان حیوانات کو بھی کیا ہے کہ ان مسائل پر گفتگو کرتے کرتے مذہبی بحث چھڑ جانا لازمی تھا۔ ہم ایک دوسرے کی تسکین نہیں کر سکے۔ میرے دل میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ مذہب اور اخلاق ایک چیز ہے۔ کپتان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا جس کی صحت میں اسے ذرا بھی شبہہ نہ تھا۔

چوبیس دن کے بعد یہ خوشگوار سفر ختم ہوگیا اور میں دریائے ہوگلی کے حسن پر سر دھنتا ہوا کلکتے پہنچ گیا۔ اسی دن میں ریل میں بیٹھ کر بمبئی روانہ ہوگیا۔

پچیسواں باب
ہندوستان میں

بمبئی جاتے ہوئے میری ریل پینتالیس منٹ الہ آباد میں ٹھہری۔ میں نے کہا کہ اتنی دیر میں گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سیر ہی کراؤں مجھے انگریزی دواؤں کی دوکان سے کچھ دوائیں بھی خریدنا تھیں، دوکاندار اونگھ رہا تھا اور اس نے دواؤں کے ملانے میں اتنی دیر کر دی کہ جب میں اسٹیشن پہنچا تو میری گاڑی سامنے سے نکل گئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے ازراہ مہربانی ایک منٹ تک میری خاطر گاڑی روکی تھی مگر جب میں آتا ہوا نظر نہیں آیا تو میرا سامان بہت احتیاط سے اتروا دیا تھا۔

میں نے کیلنر کے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور یہ قصد کر لیا کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں گا۔ میں نے الہ آباد کے اخبار پانیر کا نام بہت سنا تھا اور مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اُس زمانے میں چھوٹے مسٹر چیسنی اڈیٹر تھے۔ میں ہر پارٹی کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے مسٹر چیسنی کو ایک رقعہ لکھا جس میں اپنی گاڑی چھوٹ جانے کا ذکر کیا اُن سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کے لئے کوئی ایسا وقت دیں کہ میں دوسرے دن روانہ ہو سکوں۔ وہ مجھ سے اسی وقت ملنے پر راضی ہو گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی خاص کر اس لئے کہ انہوں نے میری داستان صبر سے سنی، انہوں نے کہا کہ تم جو کچھ لکھو گے اس پر میں اپنے اخبار میں تبصرہ کروں گا مگر اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ ہندوستانیوں کے سارے مطالبات کی تائید ہی کروں گا کیونکہ میرا یہ بھی تو فرض ہے کہ فریق ثانی کے نقطہ نظر کو سمجھوں اور اسے

کافی اہمیت دوں۔

میں نے کہا "یہی بہت کافی ہے کہ آپ اس مسئلے پر غور کریں اور اپنے اخبار میں اس پر بحث کریں۔ میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ معمولی انصاف کیا جائے جو ہمارا حق ہے۔

دن کا بقیہ حصہ میں نے شہر کی سیر میں تین دریاؤں کے خوشنما سنگم تریبنی کے نظارے میں اور اپنے کام کے متعلق تدبیریں سوچنے میں گذارا۔

پانیر کے اڈیٹر سے یہ غیر متوقع ملاقات واقعات کے ایک سلسلے کا آغاز تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ ناٹال میں عوام نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

میں بغیر بمبئی میں ٹھہرے سیدھا راجکوٹ پہنچا۔ اور جنوبی افریقہ کی حالت پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے لکھنے اور شائع کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ اسکا سرورق سبز تھا۔ اس لئے آگے چل کر اس کا نام سبز پمفلٹ پڑ گیا۔ اس میں میں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی مشکلات خاص کرکے ہلکے رنگ میں دکھائیں اور طرز بیان بھی مجھے دو پمفلٹوں کے مقابلے میں جس کا میں ذکر کر چکا ہوں معتدل رکھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ دور کی چیزیں جتنی اصل میں ہوتی ہیں اس سے بڑی معلوم ہوا کرتی ہیں۔

میں نے اس پمفلٹ کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور ہندوستان کے سارے اخباروں کو اور سب پارٹیوں کے لیڈروں کو بھیجیں۔ سب سے پہلے اس پر پانیر کے اڈیٹر نے تبصرہ کیا۔ ریوٹر نے اس کے مضمون کا خلاصہ تار کے ذریعے سے لندن بھیجا اور وہاں کے ریوٹر کے صدر دفتر نے اس خلاصے کا خلاصہ ناٹال پہنچایا۔ یہ آخری تار تین سطر سے زیادہ نہ تھا۔ میں نے جو تصویر اس سلوک کی جو ناٹال میں ہندوستانیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کھینچی تھی اس کا اس تار میں چھوٹا سا عکس تھا مگر اس میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا تھا۔ اور جو الفاظ نقل کئے گئے تھے وہ میرے نہ تھے۔ اس

کا نتائج میں جو اثر ہوا اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ ہندوستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔

ان پمفلٹوں کو لفافوں میں رکھ کر ڈاک میں ڈالنا کوئی سہل کام نہ تھا اور اگر میں اجرت دے کر لفافے وغیرہ بنواتا تو بہت مصارف پڑتے۔ مگر مجھے اس کی بڑی آسان ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے اپنے محلے کے سب لڑکوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ صبح کو اسکول کے وقت سے پہلے دو تین گھنٹے رضاکار کی حیثیت سے کام کیا کریں۔ وہ اس پر خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تمہیں دعائیں دوں گا اور انعام میں استعمال شدہ ٹکٹ بانٹوں گا۔ انہوں نے بات کی بات میں سارا کام نپٹا دیا چھوٹے بچوں سے رضاکار کے طور پر کام لینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ان چھوٹے دوستوں میں سے دو اس کتاب کی تحریر کے وقت میرے رفیق کار ہیں۔

اسی زمانے میں بمبئی میں طاعون شروع ہوا اور چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ راجکوٹ میں بھی وبا پھیلنے کا خوف تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں حفظان صحت کے شعبے میں مفید کام کر سکوں گا۔ اس لئے میں نے ریاست کے حکام کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں۔ میری درخواست منظور ہوئی اور میں اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا جو اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں نے پاخانوں کی صفائی پر بہت زور دیا اور کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ سب گھروں کے پاخانے معائنہ کئے جائیں۔ غریبوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ انہیں جو اصلاحی تجاویز بتائی گئیں ان پر خوشی سے عمل کیا۔ مگر جب ہم عمائد ریاست کے گھروں کا معائنہ کرنے گئے تو ہمارے مشوروں پر عمل کرنا تو ایک طرف ان میں سے بعض نے ہمیں اپنے گھر میں دھنسنے تک نہیں دیا۔ ہمیں عام طور پر یہ تجربہ ہوا کہ امیروں کے پاخانے زیادہ گندے ہیں۔ پاخانے کیا تھے تاریک بدبودار کوٹھریاں تھیں جن میں غلاظت کے اور کیڑوں کے انبار لگے تھے۔ ہم نے جو اصلاحی تجاویز

بتائی تھیں وہ بالکل سیدھی سادی تھیں مثلاً کھڈی میں ناندیں رکھنا تاکہ میلا زمین پر نہ گرے پیشاب بھی ناندیں کرنا اور زمین میں جذب نہ ہونے دینا، پاخانوں اور بیرونی دیواروں کے بیچ میں جو آڑ ہو اُسے دور کر دینا تاکہ پاخانوں میں زیادہ روشنی اور ہوا آ سکے۔ اور مہتر کو پوری طرح صفائی کرنے میں دقت نہ ہو۔ اونچے طبقوں نے اس آخری تجویز کی بڑی مخالفت کی اور اکثر لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

کمیٹی کو اچھوتوں کے محلوں کا بھی معائنہ کرنا تھا۔ صرف ایک ممبر میرے ساتھ وہاں جانے پر راضی ہوا اور لوگوں کے نزدیک ان محلوں میں جانا ہی ایک لغو بات تھی چہ جائیکہ وہاں کے پاخانوں کا معائنہ کرنا۔ لیکن میں نے ان محلوں کو دیکھا تو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی۔ مجھے اپنی عمر میں ایسی جگہ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ وہاں کے عورت مرد ہم کو دیکھ کر متعجب ہوئے۔ میں نے ان سے پاخانوں کے معائنے کی اجازت مانگی۔

انہوں نے متحیر ہو کر کہا "پاخانوں کا ہمارے ہاں کیا کام؟ ہم تو کھلے میدان میں جھاڑے جایا کرتے ہیں۔ پاخانے تو حضور جیسے امیروں کے لئے ہیں"

میں نے کہا "اچھا تو ہمیں اپنے گھر تو دکھاؤ گے؟"

"شوق سے دیکھئے حضور۔ ایک ایک کونا دیکھ ڈالئے۔ ہمارے گھر ہی کیا ہیں چوہے کے سے بل ہیں"

میں اندر گیا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اندر بھی ویسی ہی صفائی ہے جیسی باہر ہے۔ دروازوں میں خوب جھاڑو دی ہوئی تھی۔ فرش سلیقے سے گوبر سے لپے ہوئے تھے۔ اور جو تھوڑے بہت باسن وغیرہ تھے وہ دھلے اور منجھے ہوئے رکھے تھے۔ ان محلوں میں وبا پھیلنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

امیروں کے محلوں میں ایک پاخانہ نظر آیا جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں۔

ہر کمرے میں ایک نالی تھی جس میں پانی بھی پھینکا جاتا تھا اور پیشاب بھی کیا جاتا تھا یعنی سارے گھر میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک مکان میں کوٹھے پر ایک سونے کا کمرہ تھا جس کے اندر کی نالی پیشاب اور پاخانے دونوں کے کام میں لائی جاتی تھی۔ اس نالی کے سرے پر ایک نل تھا جو نیچے کی منزل تک چلا گیا تھا۔ اس کمرے میں ایسی سڑی ہوئی بدبو تھی کہ دماغ پھٹا جاتا تھا۔ خدا جانے لوگ اس میں کیونکر سو سکتے تھے۔

کمیٹی نے ویشنو حویلی کا بھی معائنہ کیا۔ حویلی کے متولی سے میرے خاندان والوں کے بڑے مراسم تھے۔ اس لئے وہ اس پر راضی ہو گیا کہ ہم لوگ سارا مندر دیکھیں اور جو اصلاح چاہیں تجویز کریں۔ اس عمارت کا ایک حصہ ایسا تھا جو انہوں نے خود کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بچا کھچا کھانا اور پتے جن پر بھوجن کیا جاتا تھا دیوار کے پیچھے پھینک دئے جاتے تھے، یہاں کووں اور چیلوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پاخانے بھی بہت گندے تھے۔ میرا قیام راجکوٹ میں کم رہا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے جو تدبیریں بتائی تھیں ان پر متولی نے کس حد تک عمل کیا۔

مجھے ایک عبادت گاہ میں اس قدر گندگی دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ قاعدے سے تو ایسی جگہ جسے لوگ مقدس سمجھتے ہیں حفظانِ صحت کے اصولوں کا خاص اہتمام ہونا چاہئے۔ مجھے اس زمانے میں بھی یہ معلوم تھا کہ سمرتیوں کے مصنفوں نے بیرونی اور اندرونی صفائی پر بیحد زور دیا ہے۔

چھبیسواں باب

وفاداری کا جوش اور تیمارداری کا جذبہ

برطانوی آئین کا جتنا وفادار میں تھا اتنا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وفاداری کی تہ میں حق کی محبت تھی۔ مجھ سے وفاداری یا کسی اور نیکی کا جھوٹا اظہار کبھی نہیں ہو سکا۔ نٹال میں میں جن جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا وہاں نیشنل انیتھم[1] گایا جاتا تھا۔ میں اس زمانے میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس گیت میں شریک ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے برطانوی حکومت کی خرابیوں کا علم نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اسے مجموعی حیثیت سے قابل قبول سمجھتا تھا۔ اس زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ مجموعی حیثیت سے برطانوی حکومت محکوموں کے لئے مفید ہے۔

رنگ اور نسل کا جو تعصب مجھے جنوبی افریقہ میں نظر آیا اسے میں برطانوی روایات کے منافی سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض ایک مقامی اور عارضی چیز ہے اس لئے میں تاج برطانیہ کی وفاداری میں انگریزوں سے بازی لیجانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے نیشنل انیتھم کا راگ سیکھا اور جب کبھی یہ گیت گایا جاتا تھا میں بھی ساتھ دیتا تھا۔ بغیر تصنع اور نمائش کے وفاداری کے اظہار کا جو موقع ملتا تھا میں اس میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

میں نے ساری عمر میں کبھی اس وفاداری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، کبھی اس کی بدولت اپنی ذاتی اغراض پورے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ میرے ایک فرض سا

---

(۱) برطانیہ کا قومی گیت جس میں بادشاہ کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے۔

تھا اور میں بغیر کسی معاوضے کی امید کے اسے انجام دیتا تھا۔

جب میں ہندوستان پہنچا تو یہاں ملکہ وکٹوریا کی جوبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجکوٹ میں جو کمیٹی اس مقصد کے لئے بنائی گئی تھی مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی مگر مجھے یہ شبہہ تھا کہ اس جشن میں زیادہ تر نمائش سے کام لیا جائے گا۔ اس میں بہت ریاکاری نظر آئی جس سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ مجھے کمیٹی میں رہنا چاہئے یا نہیں۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دینے پر قناعت کرنا چاہئے۔

ایک تجویز یہ تھی کہ درخت لگائے جائیں۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ محض دکھاوے کی خاطر اور افسروں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ کوئی شخص درخت لگانے پر مجبور نہیں کیا گیا یہ محض ایک فرمائش ہے۔ اگر یہ پوری کی جائے تو اچھی طرح کرنا چاہئے ورنہ تماشے سے کیا فائدہ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لوگ میرے ان خیالات پر ہنستے تھے۔ میں نے اپنے حصے کا درخت اسی طرح لگایا جیسے لگانا چاہئے اور بڑی محنت سے اس میں پانی دیتا رہا اور اسکی نگرانی کرتا رہا۔

میں نے نیشنل انتھم اپنے گھر کے بچوں کو بھی یاد کرا دیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ گیت راجکوٹ ٹریننگ کالج کے طالب علموں کو بھی سکھایا تھا مگر یہ خیال نہیں کہ یہ جوبلی کا واقعہ ہے یا ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے زمانے کا۔ آگے چل کر اس کے الفاظ میرے کانوں کو ناگوار ہوتے گئے۔ جوں جوں میرا "اہمسا" کا تصور پختہ ہوتا گیا، میری احتیاط اپنے خیالات اور الفاظ کے بارے میں بڑھتی گئی۔ انتھم کے یہ شعر:-

خدا اس کے دشمنوں کو منتشر

اور ہلاک کر دے،

انکی سیاست الٹ پلٹ ہو جائے

اور انکی مفسدانہ سازشیں ناکام رہیں۔

خاص طور پر میرے جذبہ "اہمسا" کے منافی تھے۔ میں نے اپنا یہ خیال ڈاکٹر بوتھ سے بیان کیا۔ انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ جو شخص "اہمسا" کا قائل ہے اسے یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں کرنا چاہئیں۔ یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کے "دشمن" ہمیشہ "مفسد" ہوتے ہیں؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ بادشاہ ہمیشہ حق پر ہو اور اس کے دشمن ناحق پر ہوں؟ ہم خدا سے صرف یہ دعا کر سکتے ہیں کہ حقدار کا ساتھ دے۔ ڈاکٹر بوتھ نے میرے خیالات کی تصدیق کی اور اپنی جماعت کے لئے ایک نیا نغمہ تصنیف کیا۔ ان بزرگ کا ذکر آگے آئے گا۔

جس طرح وفاداری میری سرشت میں تھی اسی طرح تیمارداری کا بھی مجھے فطری ملکہ تھا۔ مجھے لوگوں کی تیمارداری کا شوق تھا خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن ہوں۔

جن دنوں میں راجکوٹ میں جنوبی افریقہ کے پمفلٹ لکھنے میں مشغول تھا مجھے ایک آدہ روز کے لئے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا یہ قصد تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور ابتدا میں نے بمبئی سے کی۔ سب سے پہلے میں جسٹس راناڈے سے ملا۔ انہوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سر فیروز شاہ مہتا سے ملنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد میں جسٹس بدرالدین طیب جی سے ملا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا "مجھ سے اور جسٹس راناڈے سے بہت کم مدد مل سکتی ہے۔ آپ کو ہماری حالت معلوم ہے۔ ہم قومی معاملات میں عملی حصہ نہیں لے سکتے لیکن ہمیں آپ سے ہمدردی ضرور ہے۔ آپ کی پوری رہنمائی صرف ایک شخص کر سکتا ہے اور وہ سر فیروز شاہ مہتا ہیں۔

میں خود سر فیروز شاہ مہتا سے ملنا چاہتا تھا لیکن جب ان بزرگوں نے مجھے انکے مشورے پر عمل کرنے کی رائے دی تب مجھے پورا اندازہ ہوا کہ سر فیروز شاہ مہتا کا

پبلک میں کتنا اثر ہے۔ کچھ دن کے بعد میں انکے پاس حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں انکے سامنے جاؤں گا تو مجھ پر رعب طاری ہو جائے گا۔ ان کو پبلک نے جو خطابات دیئے تھے وہ میں سن چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں "شیر بمبئی"، "احاطہ بمبئی کے بے تاج بادشاہ" کی ملاقات کے لئے جا رہا ہوں۔ مگر بادشاہ نے مجھے اپنے جاہ و جلال سے مرعوب نہیں کیا۔ وہ مجھسے اس طرح پیش آئے جیسے باپ بیٹے سے ملتا ہے۔ یہ ملاقات انکے دفتر میں ہوئی وہ اپنے دوستوں اور پیرووں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے مسٹر ڈی۔ ای۔ واچا اور مسٹر کاماتھی تھے جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ میں مسٹر واچا کا ذکر پہلے سن چکا تھا۔ یہ سر فیروز شاہ مہتا کے دست راست سمجھے جاتے تھے اور ویرچند جی گاندھی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ اعداد و شمار کے بڑے ماہر ہیں۔ مسٹر واچا نے کہا "گاندھی جی مجھ سے پھر ضرور ملنے گا۔"

اس تعارف میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا جسے سر فیروز شاہ غور سے سنتے رہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں جسٹس رانڈے اور جسٹس طیب جی سے مل چکا ہوں۔ آخر انہوں نے کہا "گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ضرور تمہاری مدد کرنا چاہئے۔ مجھے یہاں جلسہ کرنا پڑے گا۔" پھر اپنے سکرٹری مسٹر منشی کی طرف مخاطب ہو کر انہوں نے جلسے کی تاریخ مقرر کرنے کا حکم دیا۔ تاریخ طے ہو گئی اور انہوں نے مجھے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ جلسے سے ایک روز پہلے میرے پاس پھر آنا۔ میرے دل میں جو کھٹکا تھا وہ اس ملاقات سے جاتا رہا اور میں خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

بمبئی کے قیام کے زمانے میں میں اپنے بہنوئی سے ملنے گیا جو یہاں علاج کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ کوئی خوش حال آدمی نہیں تھے۔ انکی تیمارداری کرنا میری بہن کے بس کی بات نہیں تھی۔ انکی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لئے میں نے ان سے

کہا کہ آپ میرے ساتھ احلوت چلئے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئے اور میں واپسی میں انہیں اور بہن کو ساتھ لے آیا۔ انکی علالت نے توقع سے زیادہ طول کھینچا۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں ٹھہرایا اور دن رات انکے پاس رہتا تھا۔ مجھے رات کو دیر تک جاگنا پڑتا تھا اور اسی تیمارداری کے دوران میں جنوبی آفریقہ کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ آخر میں مریض کا انتقال ہو گیا مگر مجھے اس خیال سے بڑی تسکین ہوئی کہ مجھے آخری وقت میں انکی خدمت کرنے کا موقع مل گیا۔

مجھے تیمارداری سے جو مناسبت تھی اس نے رفتہ رفتہ انتہائی انہماک کی صورت اختیار کر لی یہانتک کہ اکثر میں اس کی وجہ سے اپنے کام میں غفلت کرنے لگا اور کبھی کبھی میں اپنی بیوی بلکہ سارے گھر کو اس خدمت میں اپنے ساتھ کھینچ لیتا تھا۔

ایسی خدمت اسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے کہ انسان کو اس میں لطف آئے۔ اگر محض دکھاوے کے لئے یا عام رائے کے ڈر سے کیجائے تو یہ انسان کی نشو و نما کو روکتی ہے اور اس کی روح کو کچل ڈالتی ہے وہ خدمت جس میں خوشی نہ ہو نہ خادم کے کام آتی ہے نہ مخدوم کے۔ لیکن دلی مسرت کے ساتھ جو خدمت کیجائے اس کے آگے دنیا کی ساری راحت و دولت ہیچ ہے۔

ستائیسواں باب

بمبئی کا سفر

جس دن میرے بہنوئی کا انتقال ہوا۔ اُسی دن مجھے جلسے میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ مجھے اپنی تقریر تیار کرنے کا بالکل موقع نہیں ملا تھا۔ فکر و تردد کی حالت میں رات دن جاگنے سے میں پست ہوگیا تھا اور میری آواز بھرّا گئی تھی۔ بہرحال میں خدا پر بھروسا کرکے بمبئی روانہ ہوگیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ اپنی تقریر لکھ ڈالوں۔

سرفیروزشاہ کی ہدایت کے مطابق میں جلسے سے ایک دن پہلے شام کو پانچ بجے انکے دفتر میں پہنچ گیا۔ انہوں نے پوچھا "کہو گاندھی تمہاری تقریر تو تیار ہے نہ؟"

میں نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا "جی نہیں، میرا ارادہ وقت کے وقت تقریر کرنیکا ہے"

"بمبئی میں اس طرح کام نہیں چلے گا۔ یہاں تقریروں کی رپورٹ بہت ناقص ہوتی ہے۔ اگر اس جلسے سے فائدہ اٹھانا ہے تو اپنی تقریر لکھ ڈالو اور وہ کل دن نکلنے سے پہلے چھپ کر تیار بھی ہوجائے۔ تم اسکا انتظام کرلوگے؟"

میں بہت سٹ پٹایا مگر میں نے کہا کہ میں کوشش کروں گا۔

"اچھا تو منشی تمہارے پاس مسودہ لینے کے لئے کس وقت آئیں؟"

میں نے کہا "آج رات کو گیارہ بجے"

دوسرے دن جلسے میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ سرفیروز کی ہدایت میں کیا مصلحت تھی۔ جلسہ سر کاؤس جی جہانگیر انسٹیٹیوٹ کے ہال میں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جب سر

سر فیروز شاہ مہتا کسی جلسے میں تقریر کرتے ہیں تو ہال کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ خصوصاً طالب علم انکی اسپیچ سننے کے شوق میں بڑی کثرت سے آتے ہیں۔ مجھے ایسے جلسے میں شریک ہونیکا پہلا اتفاق تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری آواز کسی کو نہیں سنائی دیتی جب میں نے اپنی تقریر پڑھنا شروع کی تو میں کانپ رہا تھا۔ سر فیروز شاہ میری ہمت بڑھانے کے لئے بار بار فرمائش کرتے تھے کہ آواز کو اور بلند کرو۔ مگر مجھ پر اسکا اثر الٹا ہوا اور میری آواز اور گرتی گئی۔

میرے پرانے دوست کیشو راؤجی دیسپانڈے میری مدد کے لئے اٹھے میں نے اپنی تقریر انکے حوالے کر دی۔ انکی آواز ایسے جلسے کے لئے بہت موزوں تھی۔ مگر حاضرین کو اس سے تسکین نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے "واچا" "واچا" کا شور اٹھا جس سے سارا ہال گونج گیا۔ اس لئے مسٹر واچا نے کھڑے ہو کر وہ تقریر پڑھی اور اسکا حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ بالکل خاموش ہو گئے اور آخر تک بڑے غور سے سنتے رہے بیچ بیچ میں وہ تحسین کے اور جہاں نفریں کا موقع تھا "شرم، شرم" کے نعرے بلند کرتے جاتے تھے مجھے اس سے دلی مسرت ہو رہی تھی۔

سر فیروز شاہ کو یہ تقریر پسند آئی میں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس جلسے کی بدولت دیشپانڈے جی اور ایک پارسی دوست (جن کا نام بتانے میں مجھے تامل ہے کیونکہ وہ آج کل سرکاری ملازمت میں بہت بڑے عہدے پر ممتاز ہیں) میرے عملی ہمدرد بن گئے۔ دونوں نے میرے ساتھ جنوبی افریقہ جانے پر آمادگی ظاہر کی مگر پارسی دوست کو مسٹر سی۔ ایم کرسیٹ جی نے جو اس زمانے میں عدالت خفیفہ کے جج تھے اس ارادے سے ہٹا لیا کیونکہ انہوں نے انکے لئے شادی کا لاسا لگا رکھا تھا۔ اب وہ یا تو شادی کرتے یا جنوبی افریقہ جاتے۔ انہوں نے شادی کو ترجیح دی۔ مگر انکی عہد شکنی کی تلافی پارسی رستم جی نے کر دی اور انکی بیوی کی اعانت جرم کی تلافی میں آج بہت سی

پارسی بہنیں کھدر کا کام کر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے ان میاں بیوی کا قصور سچے دل سے معاف کر دیا۔ ڈیشا نڈے جی کو شادی کا لالچ نہ تھا مگر وہ بھی نہ جا سکے۔ آج وہ خود اپنی عہد شکنی کی اچھی طرح تلافی کر رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ واپس جاتے ہوئے مجھے زنجبار میں طیب جی کے خاندان کے ایک رکن ملے تھے اور انہوں نے بھی میری مدد کے لئے آنے کا وعدہ کیا تھا مگر نہیں آئے۔ انکے جرم کا کفارہ عباس طیب جی حصہ ادا کر رہے ہیں۔ غرض میں نے تین بیرسٹروں کو جنوبی افریقہ لیجانے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اس سلسلے میں مجھے مسٹر پیستونجی پادشاہ یاد آگئے۔ مجھ سے ان سے قیام انگلستان کے زمانے سے دوستانہ مراسم تھے پہلی ملاقات ان سے لندن میں ایک نباتاتی ریستوران میں ہوئی تھی۔ میں نے انکے بھائی مسٹر برزوجی پادشاہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ خبطی ہیں میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا مگر لوگ انہیں مراقی کہتے تھے۔ وہ گھوڑوں کی ٹرام پر نہیں بیٹھتے تھے کیونکہ انہیں غریب جانوروں پر رحم آتا تھا۔ باوجود غیر معمولی حافظے کے انہوں نے ڈگریاں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں کسی کے پابند نہ تھے اور باوجود پارسی ہونے کے نباتاتی تھے۔ پیستونجی کو یہ شہرت تو نصیب نہ تھی مگر انکی علمیت کا لندن تک چرچا تھا۔ مجھ میں اور ان میں صرف نباتاتی مسلک کا رابطہ تھا ورنہ علم و فضل میں تو میں انکی گرد کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے انہیں بمبئی میں ڈھونڈھ نکالا۔ وہ ہائی کورٹ میں سر دفتر تھے ان دنوں وہ اعلیٰ گجراتی لغت کا ایک حصہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ جنوبی افریقہ کے کام میں مدد مانگنے کے سلسلے میں میں نے اپنے کسی دوست کو نہیں چھوڑا تھا۔ چنانچہ میں نے پیستونجی پادشاہ سے بھی اس کا ذکر کیا مگر انہوں نے نہ صرف میری مدد کرنے سے انکار کیا بلکہ مجھے بھی نصیحت کی کہ جنوبی افریقہ نہ جاؤں۔

اس نے کہا " میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا بلکہ سچ پوچھو تو میں خود تمہارے جنوبی افریقہ جانے کو بھی پسند نہیں کرتا کیا ہمارے ملک میں کام کی کمی ہے ۔ ذرا دیکھو تو ہمیں اپنی زبان ہی کی ترقی کے لئے ابھی کتنا کچھ کرنا ہے ۔ میرے سپرد علمی اصطلاحیں تلاش کرنے کا کام ہے ۔ یہ کل کام کی محض ایک ذرا سی شاخ ہے ۔ اپنے ملک کے افلاس پر تو غور کرو ۔ یہ سچ ہے کہ جنوبی افریقہ میں ہمارے ہم وطن مصیبت میں ہیں مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ تمہارے جیسا آدمی اس کام کے لئے قربان کیا جائے ۔ پہلے ہمیں یہاں آزادی حاصل کرنے دو اس سے وہاں ہمارے ہموطنوں کو خود بخود مدد پہنچے گی ۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری بات نہیں مانو گے مگر مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے جیسے کسی اور شخص کو تمہارا ساتھ دینے کی رائے دوں گا ۔"

مجھے یہ مشورہ پسند نہیں آیا ۔ مگر اسکی وجہ سے میرے دل میں مسٹر بستونجی بادشاہ کا احترام اور بڑھ گیا ۔ مجھ پر اس محبت کا بہت اثر ہوا جو انہیں اپنے ملک سے اور اپنی زبان سے تھی ۔ اس واقعے کے بعد میرا انکا دلی رابطہ اور بڑھ گیا ۔ میں انکے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھتا تھا ۔ مگر بجائے اس کے کہ میں اپنے جنوبی افریقہ کے ارادے کو ترک کرتا میرا ارادہ اور مضبوط ہو گیا ۔ ایک محب وطن کو مادر وطن کی کسی قسم کی خدمت سے منہ نہ موڑنا چاہئے ۔ اور میرے لئے گیتا کا صریحی اور تاکیدی حکم کافی تھا ۔

آخر میں، یہ بہتر ہے کہ آدمی جیسے بھی بن پڑے اپنا کام انجام دے، چاہے پھر اس میں ناکام ہی ہو ۔ بہ نسبت اس کے کہ پرائے کام اپنے ذمہ لے، چاہے وہ کیسے ہی اچھے معلوم ہوں ۔

اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مرجانا کوئی عیب نہیں لیکن جو دوسری راہیں تلاش کرتا ہے وہ ہمیشہ مارا مارا پھرے گا ۔

اٹھائیسواں باب

پونا اور مدراس

سرفیروزشاہ نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔ بمبئی سے میں پونا پہنچا۔ یہاں دو
رٹیاں تھیں۔ میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا۔ پہلے میں لوکمانیہ تلک سے
لا۔ انہوں نے کہا:۔

"آپ کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ ہر پارٹی سے مدد لینا چاہئے۔ جنوبی افریقہ
کے معاملے میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ بہت ضروری ہے کہ آپ
مدر ایسے شخص کو بنائیں جو کسی پارٹی میں نہ ہو۔ آپ پروفیسر بھنڈارکر سے ملئے۔
نہوں نے کچھ دن سے پبلک معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ اس
لے پر وہ اظہار خیال کریں۔ آپ ان سے ملئے اور وہ جو کچھ کہیں اس کی مجھے اطلاع
یجئے۔ میں آپ کی پوری پوری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا جب جی چاہے میرے
س آیئے مجھے کسی وقت آپ سے ملنے میں تامل نہ ہوگا۔"

مجھے لوکمانیہ سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میری سمجھ میں آگیا کہ ان کی غیر معمولی
دلعزیزی کا راز کیا ہے۔

اس کے بعد میں گوکھلے کے پاس گیا۔ فرگوسن کالج کے احاطہ میں ان سے
قات ہوئی انہوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور ان کے اخلاق نے
رے دل کو تسخیر کر لیا۔ ان سے بھی میں پہلی بار ملا تھا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے مدتوں کے
بچھڑے ہوئے دوست ملے ہوں۔ سرفیروزشاہ میری نظر میں ہمالیہ کی طرح

تھے اور لوکمانیہ سمندر کی طرح۔ مگر گوکھلے گنگا کے مانند تھے۔ اس پاک دریا میں آدمی جی کھول کر نہا سکتا تھا۔ ہمالیہ پر چڑھنا محال تھا اور سمندر میں کشتی لیجانا دشوار۔ مگر گنگا گودھیلائے اپنی طرف بلاتی تھی۔ اس میں کشتی چلانے سے روحانی مسرت ہوتی تھی۔ گوکھلے نے مجھ سے کھود کھود کر سوال کئے جیسے اسکول کے داخلے کے وقت استاد طالبعلم کا امتحان لیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے کن لوگوں کے پاس جانا چاہیے اور ان سے کیونکر ملنا چاہیے۔ انہوں نے بے تکلفی سے میری اسپیچ مانگ کر پڑھی اور مجھے کالج کی سیر کرائی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارا جب جی چاہے مجھ سے ملو۔ میں ہر وقت حاضر ہوں اور چلتے وقت تاکید کر دی کہ ڈاکٹر بھنڈارکر کی ملاقات کا جو نتیجہ ہو مجھے ضرور بتانا۔ میں انکے پاس سے اٹھا تو میرا دل خوشی سے معمور تھا، سیاسی لوگوں میں سے میرے دل کو جو تعلق گوکھلے سے انکی زندگی میں تھا اور اب تک ہے وہ اور کسی سے نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈارکر میرے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آئے۔ میں جب انکے پاس پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ اس عالم مرتاض پر اس بات کا بڑا اثر ہوا کہ میں ایسی دھوپ میں لوگوں سے ملتا پھرتا تھا۔ میری یہ تجویز کہ جلسے کا صدر ایسا شخص ہو جو کسی پارٹی میں نہ ہو انہیں بہت پسند آئی اور وہ بے اختیار چلا اٹھے "بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک"

جب میں اپنی داستان سنا چکا تو انہوں نے کہا "تم جس سے پوچھو گے" وہ کہدے گا کہ میں سیاست میں حصہ نہیں لیتا مگر تم سے میں عذر نہیں کر سکتا۔ تمہارا کام اتنا اہم ہے اور تمہاری محنت اس قدر قابل تعریف ہے کہ مجھے تمہارے جلسے میں شریک ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ تلک اور گوکھلے سے مشورہ کر لیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ان سے جا کر کہہ دینا کہ میں بہت خوشی سے دونوں انجمنوں کے متحدہ جلسے میں صدارت کروں گا۔ جلسہ کا وقت مجھ سے مقرر کرانے کی ضرورت نہیں۔ انکے لئے جو وقت

مناسب ہو وہ مجھے منظور ہے "۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے مبارکباد دی اور بزرگانہ دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

پونا کے ان بے نفس عالموں نے بغیر کسی تکلف اور نمائش کے ایک چھوٹا سا جلسہ کیا۔ جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے مشن کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔

اس کے بعد میں مدراس گیا۔ یہاں لوگوں میں بیحد جوش تھا۔ جلسے کے حاضرین پر بالاسندرم کے واقعے کا بڑا اثر ہوا۔ میری تقریر چھپی ہوئی تھی اور میرے اندازے میں خاصی طویل تھی۔ مگر حاضرین ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے رہے جب جلسہ ختم ہوا تو لوگ "سبز پمفلٹ" پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اس پر نظر ثانی کرنے کے بعد دوبارہ دس ہزار چھپوایا ۔۔ اس کی بکری خوب ہوئی مگر مجھے معلوم ہوا کہ اتنی تعداد میں چھپوانے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اپنے جوش میں مانگ کا اندازہ بہت زیادہ کیا تھا۔ میری تقریر کے مخاطب صرف انگریزی خواں تھے اور مدراس میں اس طبقے کے لوگوں میں دس ہزار نسخے نہیں کھپ سکتے تھے۔

یہاں سب سے زیادہ مدد مجھے آنجہانی جی پریشورن پلے اڈیٹر مدراس سٹینڈرڈ سے ملی۔ انہوں نے اس مسئلے پر بہت اچھی طرح غور کیا تھا اور اکثر مجھے اپنے دفتر میں بلا کر ہدایتیں دیا کرتے تھے۔ جی۔ سبرامنیم اڈیٹر ہندو اور ڈاکٹر سبرامنیم نے بھی مجھ سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن پریشورن پلے نے تو مدراس اسٹینڈرڈ کے کالم میرے لئے وقف کر دئے اور میں ان کی اس عنایت سے اکثر فائدہ اٹھاتا تھا۔ پاچیپا ہال کا جلسہ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر سبرامنیم کی صدارت میں ہوا تھا۔ اکثر دوستوں نے میرے ساتھ

اس قدر محبت کا برتاؤ کیا اور میرے کام میں اتنا جوش اور انہماک ظاہر کیا کہ ہر چند میری انکی بات چیت انگریزی میں ہوتی تھی مگر میں ان سے بالکل بے تکلف ہو گیا تھا۔ ایسا کون سا حجاب ہے جسے محبت دور نہ کر سکے۔

انتیسواں باب

"جلد واپس آؤ"

مدراس سے میں کلکتہ گیا۔ یہاں مجھے بڑی دقت کا سامنا ہوا کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ یہاں مسٹر ایلری تھورپ سے ملاقات ہوئی جو ڈیلی ٹیلیگراف کے نمائندے تھے۔ وہ بنگال کلب میں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے وہاں ملنے کے لئے بلایا۔ انہیں اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ کلب کے ڈرائنگ روم میں ہندوستانیوں کو لیجانے کی ممانعت ہے۔ جب انہیں اس کی اطلاع ہوئی تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ انہوں نے مقامی انگریزوں کے اس تعصب پر اظہار افسوس کیا اور مجھ سے معافی مانگی کہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جاکر نہ بٹھا سکے۔

ظاہر ہے کہ مجھے سب سے پہلے "بنگال کے دیوتا" سر سریندر ناتھ بنرجی سے ملنا تھا جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میری درخواست سن کر کہنے لگے :۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو آپ کے کام میں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ کیسی مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ مگر آپ اپنی طرف سے پوری کوشش کیجئے۔ آپ کو مہاراجاؤں کی ہمدردی حاصل کرنا ہوگی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نمائندوں سے ضرور ملئے۔ راجا سر پیارے موہن مکرجی اور مہاراجا ٹیگور کے پاس جائیے۔ یہ دونوں آزاد خیال ہیں اور پبلک کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔

یں ان حضرات سے ملا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ دونوں مجھ سے سرد مہری سے پیش آئے۔ انہوں نے کہا کلکتے میں پبلک جلسہ کرنا بہت مشکل ہے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو سر سریندر ناتھ بنرجی کی کوشش سے ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے کام میں نئی نئی دقتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ میں امرت بازار پتریکا کے دفتر میں گیا۔ جو حضرات وہاں ملے وہ مجھے یہ سمجھے کہ یہ کوئی آفاقی ہے، یوں ہی مارا مارا پھرا کرتا ہے۔ بنگباسی والے ان سے بھی بڑھ گئے اس کے اڈیٹر نے مجھے ایک گھنٹہ انتظار میں رکھا۔ یہ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ اُن سے ملنے کے لئے بہت سے لوگ کھڑے ہیں مگر ان سب کو نبٹانے کے بعد بھی انہوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا اس لئے میں نے جراءت کر کے خود گفتگو شروع کی۔ انہوں نے کہا "تم دیکھتے نہیں کہ میں مصروف ہوں۔ تمہارے جیسے لوگ صبح سے شام تک سیکڑوں آیا کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم یہاں سے چل دو۔ مجھے تمہاری باتیں سننے کی فرصت نہیں۔"

پہلے تو مجھے بڑا غصہ آیا مگر فوراً ہی یہ احساس ہوا کہ اڈیٹر کی دقتوں کو بھی تو دیکھنا چاہئے۔ میں نے بنگباسی کی شہرت سنی تھی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ہر وقت آنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ اور یہ لوگ سب وہ تھے جن سے اڈیٹر سے واقفیت تھی۔ انکے اخبار کے لئے مضامین کی کمی نہ تھی اور جنوبی آفریقہ کو اس زمانے میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ جو شخص اڈیٹر کے پاس کوئی شکایت لے کر جاتا ہے اسے اپنا معاملہ کتنا ہی اہم کیوں نہ معلوم ہو اڈیٹر کے نزدیک تو وہ ان بیشمار لوگوں میں سے ایک ہے جو اپنی اپنی شکایتیں لے کر اس کے دفتر پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ غریب اڈیٹر کس کس کی حاجت روائی کرے۔ اس کے علاوہ غرضمند یہ سمجھتے ہیں کہ اڈیٹر کا ملک میں بڑا اثر ہے۔ مگر یہ اسی کا دل جانتا ہے کہ اس کا اثر جو کچھ ہے اخبار کے دفتر کے اندر ہے باہر کچھ بھی نہیں۔ میں

اور اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملتا رہا۔ حسب معمول اینگلو انڈین اڈیٹروں کے یہاں بھی گیا۔ اسٹیٹسمین اور انگلشمین نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی۔ میں نے ان سے اس کے متعلق طویل گفتگو کی اور انہوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔

انگلشمین کے اڈیٹر مسٹر سانڈرس نے مجھے اپنی حمایت میں لے لیا انہوں نے اپنا اخبار اور اپنا دفتر میرے لئے وقف کر دیا بلکہ یہاں تک کیا کہ اس مسئلے پر جو مقالہ افتتاحیہ لکھا تھا اس کے پروف میرے پاس بھیج دیئے اور مجھے اجازت دیدی کہ اس میں حسب دلخواہ تغیر تبدل کر دوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان میں اور مجھ میں دوستی ہو گئی تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ انہوں نے مجھے حتی الامکان مدد دینے کا وعدہ کیا اور اس وعدے کو حرف بہ حرف پورا کیا۔ اس کے بعد بھی مجھ سے اُن سے بہت دن تک خط و کتابت ہوتی رہی مگر ان کی شدید علالت کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

میری زندگی میں خوش قسمتی سے یہ اکثر ہوا ہے کہ لوگوں سے خود بخود دوستی ہو گئی جس کی کوئی توقع نہ تھی۔ مسٹر سانڈرس کو میرا سچ بولنا اور مبالغے سے پرہیز کرنا بہت پسند آیا۔ میرے کام سے ہمدردی کرنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کھود کھود کے سوالات کئے اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ میں نے انکے سامنے جنوبی افریقہ کے حالات سچائی سے بیان کرنے میں یہاں تک کہ یورپیوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنے میں بھی اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ میں یورپیوں کے جائز مطالبات کی قدر کرتا ہوں۔

مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں سے انصاف چاہنے کا سب سے زود اثر طریقہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کے ساتھ انصاف کرے۔

• مسٹر سانڈرس کی غیر متوقع مدد سے مجھے یہ امید ہو چلی تھی کہ کوئی تعجب نہیں کلکتے میں بھی جلسہ کرنے کی کوئی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے یہ تار پہنچا:۔

"پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہے فوراً واپس آؤ"
اس لئے میں نے ایک خط کے ذریعے سے اخباروں کو اطلاع دی کہ ان ان وجوہ سے اس قدر جلد کلکتے سے چلے جانے پر مجبور ہوں۔ اور بمبئی روانہ ہوگیا۔ روانگی سے پہلے میں نے بمبئی میں دادا عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کو تار دیا کہ جو پہلا جہاز جنوبی افریقہ جاتا ہو اسکا ٹکٹ میرے لئے خرید لے۔ دادا عبداللہ نے اسی زمانے میں مسافر جہاز "کورلینڈ" نیا نیا خریدا تھا۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ اسی جہاز سے چلو میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو مفت میں پہنچا دوں گا۔ میں نے انکی دعوت شکریے کے ساتھ قبول کرلی اور شروع دسمبر میں اپنی بیوی دونوں لڑکوں اور اپنی بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے کو ساتھ لے کر دوبارہ جنوبی افریقہ روانہ ہوگیا۔ ہمارے جہاز کے ساتھ ایک اور جہاز نلدیری بھی ڈربن جا رہا تھا۔ اس کمپنی کی ایجنسی دادا عبداللہ کمپنی کے پاس تھی۔ ان دونوں جہازوں کے مسافر آٹھ سو کے قریب ہونگے۔ ان میں سے آدھے ٹرانسوال جا رہے تھے۔

تلاش حق

حصہ سوم

پہلا باب

طوفان کی گرج

میرا یہ پہلا سفر تھا جس میں بیوی بچے ساتھ تھے۔ میں اس کتاب میں کئی جگہ کہہ چکا ہوں کہ اوسط طبقے کے ہندوؤں میں صغرسنی کی شادی کی بدولت اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شوہر پڑھا لکھا ہے مگر اس کی بیوی قریب قریب ان پڑھ ہے۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں۔ اور شوہر کو بیوی کا معلم بننا پڑتا ہے چنانچہ مجھے جنوبی افریقہ جاتے وقت سب جزویات طے کرنا پڑیں کہ میری بیوی اور بچوں کو کیسے کپڑے پہننا چاہئیں، کیسا کھانا کھانا چاہیے۔ اور نئی جگہ پہنچ کر کس طرح کے آداب معاشرت اختیار کرنا چاہیے۔ اس زمانے کی بعض باتیں یاد کرکے ہنسی آتی ہے۔ ہندو بیوی آنکھ بند کرکے شوہر کی اطاعت کرنے کو اپنے دھرم کی معراج سمجھتی ہے۔ ہندو شوہر اپنے آپ کو بیوی کا مالک سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑی رہے۔

ان دنوں میرا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے لباس اور آداب معاشرت میں جہاں تک ہو سکے، یورپیوں کی تقلید کرنا چاہیے تاکہ ہم مہذب معلوم ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ صرف اسی طریقے سے ہم تھوڑا بہت اثر پیدا کر سکتے ہیں اور بغیر اثر کے قوم کی خدمت کرنا ناممکن ہے۔

اسے مدنظر رکھکر میں نے اپنی بیوی اور بچوں کے لباس کی ایک وضع معین کی۔ اس زمانے میں پارسی ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے

اس لئے جب بالکل یورپی وضع اختیار کرنا نامناسب معلوم ہوا تو ہم نے پارسیوں کی وضع اختیار کی۔ میری بیوی پارسیوں کی سی "ساڑی" باندھنے لگیں۔ اور میرے بچے پارسی کوٹ اور پتلون پہننے لگے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی جوتے اور موزے تو ہر شخص کے لئے لازمی تھے۔ میری بیوی اور بچوں کو ان چیزوں کا عادی ہونے میں بہت دیر لگی۔ انگریزی جوتے ان کے پیر کو دباتے تھے۔ اور موزوں میں پسینے سے بدبو آنے لگتی تھی۔ پیر کی انگلیاں اکثر سوج جاتی تھیں میرے پاس ان سب اعتراضوں کے جواب تیار رہتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جواب ان کے لئے اتنے تشفی بخش نہ تھے جتنا میرے حکم کا اثر تھا۔ وہ لباس کی وضع بدلنے پر اس لئے راضی ہوگئے کہ اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی بد دلی سے انھوں نے چھری کانٹے کا استعمال شروع کیا۔ بلکہ یہ انھیں اور بھی زیادہ ناگوار تھا جب میرا جوش ان تہذیب کی نشانیوں کے بارے میں ٹھنڈا پڑ گیا تو انھوں نے چھری کانٹے کو خیرباد کہی۔ غالباً نئی وضع کا عادی ہو جانے کے بعد انھیں اس کے چھوڑنے میں بھی اتنی ہی دقت ہوئی ہوگی۔ مگر اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ "تہذیب" کا زرق برق لبادا اتارنے سے ہماری طبیعت بہت ہلکی ہو جاتی ہے۔

جس جہاز میں ہم تھے اسی میں ہمارے بعض رشتے دار اور شناسا بھی تھے۔ میں اکثر ان سے اور تیسرے درجے کے اور مسافروں سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ کیونکہ جہاز دادا عبداللہ کے دوستوں کا تھا۔ اور میں بے تکلف جہاں جی چاہے جا سکتا تھا۔

چونکہ جہاز بغیر درمیانی بندرگاہوں پر ٹھہرے ہوئے سیدھا نٹال جا رہا تھا اس لئے ہمارا سفر صرف اٹھارہ دن کا تھا۔ مگر نٹال پہونچنے سے چار دن پہلے بڑی سخت آندھی آئی۔ یہ گویا اس اصلی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ جس سے ہمیں جنوبی افریقہ پہنچ کر

تھا۔ کرۂ ارض کے جنوبی حصے میں دسمبر برسات کا مہینہ ہے اسلئے
بحر جنوبی میں چھوٹی بڑی آندھیاں آیا کرتی ہیں جس آندھی کا میں ذکر
اتنے زور سے آئی اور اتنی دیر تک رہی کہ مسافر ڈر گئے۔ اسوقت
عجب پر اثر منظر تھا۔ عام خطرے کے مقابلے میں سب ایک ہو گئے تھے۔ ہندو مسلمان
عیسائی سب کے سب آپس کے اختلافات بھول گئے تھے اور اس خدائے واحد
کو جو سب کا معبود ہے یاد کر رہے تھے۔ بعض لوگوں نے طرح طرح کی نذریں مانیں
کپتان بھی مسافروں کے ساتھ دعا میں شریک ہو گیا۔ اس نے ہم سب کو یقین دلایا
کہ گو طوفان خطرے سے خالی نہیں ہے مگر کچھ ایسا خوفناک بھی نہیں ہے۔ اس نے
کہا کہ اچھا مضبوط جہاز قریب قریب ہر طرح کے موسم کو برداشت کر سکتا ہے۔ مگر
ان لوگوں کو کسیطرح تسکین نہیں ہوئی۔ ہر لمحے چرچراہٹ کی آواز آتی تھی جس سے
یہ ڈر ہوتا تھا کہ شاید جہاز کہیں سے ٹوٹ گیا ہے یا اس میں سوراخ ہو گیا ہے بچوں کا
یہ عالم کہ ہر لمحے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جہاز اب الٹنا ہی چاہتا ہے۔ ڈوبک پڑ جانا بالکل
ناممکن تھا۔ ہر شخص زبان حال سے رضا بقضائہ وتسلیماً لامرہ کہہ رہا تھا۔ جہاں
تک مجھے یاد ہے یہ کشمکش چند گھنٹے کے قریب رہی۔ آخر آسمان سے بادل ہٹ گئے
سورج نکل آیا۔ اور کپتان نے اطمینان دلایا کہ طوفان گذر گیا۔ لوگوں کے چہرے
خوشی سے دمکنے لگے اور خطرے کے ہٹتے ہی زبانوں پر خدا کا نام بھی نہیں رہا۔ پھر وہی
کھانا پینا، گانا بجانا، رنگ رلیاں منانا شروع ہو گیا۔ موت کے خوف سے نجات
ملتے ہی خشوع و خضوع کی عاشقی کیفیت رخصت ہو گئی۔ اور دلوں پر "مایا"[۱] کا تسلط ہو گیا۔
لوگ معمولی اوقات میں نمازیں پڑھتے تھے۔ دعائیں مانگتے تھے لیکن اب ان میں وہ

---

(۱) ہندو فلسفہ کی مشہور اصطلاح جس کا صحیح ترجمہ مشکل ہے عموماً اس کا ترجمہ "فریب خیال" "نیرنگ نظر" کیا جاتا ہے۔

حضور قلب نہ تھا جو اس ہولناک گھڑی میں پیدا ہو گیا تھا۔

مگر اس طوفان کے سبب سے مجھ میں اور دوسرے مسافروں میں بہت میل جول ہو گیا۔ مجھے طوفان کا ڈر نہیں تھا کیونکہ میں ایسے موقعے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میری طبیعت بحری سفر سے مناسبت رکھتی ہے اور مجھے کبھی متلی یا دوران سر کی شکایت نہیں ہوتی۔ اس لئے میں بیدھڑک سارے جہاز میں گشت لگاتا تھا، مسافروں کی تسکین اور دلدہی کرتا تھا اور انھیں ہر گھنٹے کپتان کا پیام پہونچاتا تھا۔ آگے چلکر معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کی دوستی میرے بڑے کام آئی۔

۱۸ یا ۱۹ دسمبر کو جہاز ڈربن میں لنگر انداز ہوا۔ "نادری" جہاز بھی اسی دن پہونچا۔

مگر اصل طوفان اب آنے والا تھا۔

دوسرا باب

طوفان

میں پہلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ ۱۸ دسمبر کو دونوں جہاز ڈربن کی بندرگاہ
میں لنگر انداز ہوئے۔ جنوبی افریقہ کی بندرگاہوں میں جہازوں کو بغیر طبی معائنے
کے ساحل پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی مسافر کو کوئی لگ جانے والی بیماری
ہو تو اسے قرنطینے میں رہنا پڑتا ہے۔ جب ہم بمبئی سے چلے تھے تو وہاں طاعون تھا۔
اس لئے ہمیں یہ ڈر تھا کہ کہیں ہم لوگ بھی کچھ دن قرنطینے میں نہ رکھے جائیں۔ معائنے
سے پہلے ہر جہاز پر ایک زرد جھنڈا نصب کیا جاتا ہے۔ اور اس وقت تک نہیں اتارا جا سکتا
جب تک ڈاکٹر مسافروں کی صحت کی تصدیق نہ کر دے۔ مسافروں کے عزیزوں اور دوستوں
کو زرد جھنڈے کے اتارے جانے کے بعد جہاز پر آنے کی اجازت ملتی ہے۔

چنانچہ ہمارے جہاز پر بھی زرد جھنڈا نصب کیا گیا۔ اور ڈاکٹر معائنے کے لئے
آیا۔ اس نے پانچ دن کے قرنطینے کا حکم دیا۔ کیونکہ اس کا یہ خیال تھا کہ طاعون کے
جراثیم کی نشوونما زیادہ سے زیادہ تیئیس دن میں ہوتی ہے۔ ہمارے جہاز کو یہ حکم سنایا
گیا کہ جس دن بمبئی سے چلا تھا اس کے تیئیسویں دن تک قرنطینے میں رہے لیکن اس حکم
میں حفظان صحت کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی تھیں۔

ڈربن کے یورپی باشندوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہ جدوجہد کر رہے تھے
کہ ہم سب اپنے ملک کو لوٹا دئے جائیں۔ اور قرنطینے کے حکم کی ایک وجہ یہ جدوجہد بھی تھی۔ دادا عبداللہ
کے آدمی مجھے برابر شہر کی خبریں پہنچاتے تھے۔ یورپی روز بڑے بڑے جلسے کرتے تھے۔ یہ لوگ

دادا عبداللہ کمپنی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اور کبھی کبھی لالچ بھی دلاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر دونوں جہاز واپس کر دیئے جائیں تو ہم ہرجانہ دینے کو تیار ہیں لیکن دادا عبداللہ کمپنی ان دھمکیوں میں آنے والی نہ تھی۔ اس زمانے میں سیٹھ عبدالکریم آدم کمپنی کے شریک منتظم تھے۔ وہ اسپر اڑے ہوئے تھے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو دونوں جہازوں کو گودی پر لائیں گے اور مسافروں کو اتاریں گے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں منسکھ لال جی ناظر بھی مجھ سے ملنے کے ارادے سے ڈربن آئے ہوئے تھے۔ یہ بڑے قابل اور جری آدمی تھے۔ اور ہندوستانیوں کی رہنمائی کر رہے تھے ان کے وکیل مسٹر لاٹن بھی جرأت میں کچھ کم نہ تھے۔ وہ یورپیوں کے طرز عمل کو برا سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کو صرف محنتانے کی خاطر نہیں بلکہ سچے دوست کی طرح مشورہ دیتے تھے۔

اس طرح ڈربن ایک زبردست اور ایک کمزور فریق کی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک طرف تو تھوڑے سے ہندوستانی اور ان کے معدودے چند انگریز دوست تھے۔ اور دوسری طرف یورپیوں کی صف تھی۔ جو تعداد میں قوت میں تعلیم میں اور دولت میں ان سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ پھر نٹال کی حکومت بھی کھلم کھلا ان کی مدد کر رہی تھی۔ مسٹر ہنری ایسکومب جو مجلس وزراء کے سب سے با اثر رکن تھے بے تکلف ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

غرض قرنطینے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کمپنی کے ایجنٹوں کو یا مسافروں کو دھمکا کر جہاز ہندوستان واپس کر دیئے جائیں۔ اب ہمارے پاس بھی تہدید آمیز پیام پہنچنے لگے۔ "اگر تم واپس نہ جاؤ گے تو ہم تمہیں سمندر میں ڈبو دیں گے۔ لیکن اگر تم جانے پر راضی ہو جاؤ تو ممکن ہے تمہارا کرایہ تک واپس مل جائے۔" میں برابر اپنے جہاز کے

Mr Laughton

مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ اور ان کی دلدہی کرتا تھا۔ ندیری کے مسافروں کو بھی تسلی آمیز پیام بھیجتا تھا۔ ان کے سکون اور ہمت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

ہمنے مسافروں کی تفریح کے لئے جہاز پر طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کیا۔ کرسمس کے دن کپتان نے اول درجے کے مسافروں کو ڈنر پر بلایا۔ علاوہ میرے اور میرے خاندان کے چند لوگ اور تھے۔ ڈنر کے بعد تقریریں ہوئیں۔ اور میں نے مغربی تہذیب پر تقریر کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ موقع سنجیدہ تقریر کا نہیں ہے لیکن اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔ میں خوشی منانے میں شریک تھا۔ لیکن میرا دل اس لڑائی میں لگا ہوا تھا جو ڈربن میں ہو رہی تھی کیونکہ یہ لڑائی اصل میں میرے ہی خلاف تھی۔ مجھ پر دو الزام تھے :۔

ایک یہ کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کو بیجا مطعون کیا۔ دوسرے یہ کہ میں خاص کرکے دو جہاز بھرکے ہندوستانی لایا ہوں کہ نٹال کو ہندوستانیوں سے بھر دوں۔

مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے دادا عبداللہ کمپنی بہت بڑے خطرے میں مبتلا ہے، مسافروں کی جان کے لالے پڑے ہیں۔ اور اپنے خاندان کو بھی میں نے لاکر مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔

مگر میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے کسیکو نٹال آنے کی ترغیب نہیں دی تھی۔ جب مسافر جہاز پر آتے تھے تو میں انہیں جانتا تک نہ تھا۔ اور اب بھی بجز اپنے دو رشتے داروں کے میں جہاز کے سیکڑوں مسافروں میں کسی کے نام و نشان سے واقف نہیں تھا۔

اس لیئے میں نے اپنی تقریر میں کہا افسوس ہے اس تہذیب پر جس کا نمونہ نٹال کے یورپی پیش کرتے ہیں۔ اور جس کی حمایت کا انہیں دعویٰ ہے کچھ عرصے سے

میرے دل میں یہی خیال بسا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے اس چھوٹے سے مجمع کے سامنے اپنی تقریر میں اسی مسئلے پر بحث کی۔ کپتان نے اور دوسرے دوستوں نے بڑی توجہ سے میری تقریر سنی۔ اور ان پر میرے خیالات کا اثر ہوا جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اس سے ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر اس کے بعد کئی بار کپتان اور جہاز کے دوسرے افسروں نے مجھ سے مغربی تہذیب کے متعلق طویل گفتگو کی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مغربی تہذیب زیادہ تر تشدد پر مبنی ہے مگر مشرقی تہذیب میں یہ بات نہیں ہے۔ سوال کرنے والوں نے میری یہ بات پکڑ لی اور ان میں سے ایک نے غالباً کپتان نے مجھ سے پوچھا:۔

"فرض کیجئے کہ یورپی اپنی دھمکیوں پر عمل کریں۔ پھر آپ اپنے عدم تشدد کے اصول پر کیونکر قائم رہیں گے؟"

"میں نے جواب دیا مجھے امید ہے خدا مجھے اتنی ہمت اور سمجھ دے گا کہ میں عفو سے کام لوں اور ان پر مقدمہ نہ چلاؤں۔ مجھے تو محض ان کی جہالت اور تنگدلی پر افسوس آتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اچھا اور مناسب سمجھ کر کر رہے ہیں۔ پھر مجھے ان پر غصہ آنے کی کیا وجہ ہے؟"

سوال کرنے والا مسکرایا۔ شاید اسے یہ بات یقین نہیں آئی۔

اسی طرح چوں توں دن گزرتے رہے۔ ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ قرنطینہ کب ختم ہوگا۔ قرنطینے کے افسر نے کہا کہ اب معاملہ میرے اختیار میں نہیں رہا۔ جب حکومت کی طرف سے احکام آئیں گے میں آپ کو جہاز سے اترنے کی اجازت دے دوں گا۔

آخر کار ایک دن میرے اور دوسرے مسافروں کے پاس یہ اعلان جنگ بھیجا کہ اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو جو ہم کہتے ہیں اسے چپ چاپ

مان لو۔ اس کے جواب میں میں نے اور دوسرے مسافروں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں نٹال کی بندرگاہ میں اترنے کا پورا حق ہے اور ہم نے جی میں ٹھان لی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نٹال میں ضرور داخل ہوں گے۔

تیئیس دن پورے ہونے پر جہازوں کو گودی میں آنے کی اور مسافروں کو اترنے کی اجازت مل گئی۔

تیسرا باب

آزمائش

جہاز گودی پر لائے گئے اور مسافر اترنے لگے۔ گر مسٹر ایسکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو یورپی تم سے سخت بیزار ہیں۔ تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ تم جھٹپٹے وقت جہاز سے اترو اور گودی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹیٹم کی حفاظت میں گھر جاؤ۔ کپتان نے یہ پیام مجھ سے کہا اور میں اس پر عملدر آمد کرنے پر تیار ہو گیا۔ مگر اسے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مسٹر لاٹن کپتان کے پاس آئے اور کہنے لگے "اگر مسٹر گاندھی راضی ہوں تو میں انہیں اپنے ساتھ لیجاؤں گا میں کمپنی کے مشیر قانونی کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ آپ پر مسٹر ایسکومب کے مشورے کی پابندی لازمی نہیں ہے" اس کے بعد انھوں نے مجھ سے بھی کہا "اگر آپ ڈرتے نہ ہوں تو میری رائے ہے کہ آپ کی بیوی اور بچے گاڑی میں رستم جی کے یہاں چلے جائیں۔ ہم آپ پیدل چلیں مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ چوروں کی طرح رات کو شہر میں داخل ہوں۔ میرے خیال میں اب آپ پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں شہر میں ہر طرف سکون ہے۔ یورپی منتشر ہو چکے ہیں۔ بہر حال میرے نزدیک آپ کو شہر میں چھپ کر ہر گز نہ جانا چاہیے" میں فوراً راضی ہو گیا۔ میری بیوی اور بچے گاڑی میں سوار ہو کر حفاظت کے ساتھ رستم جی کے یہاں پہونچ گئے۔ میں کپتان کی اجازت سے مسٹر لاٹن کے ساتھ روانہ ہوا۔ مسٹر رستم جی کا مکان گودی سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔

جیسے ہی ہم کنارے پر پہونچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا۔ اور "گاندھی"
"گاندھی" پکارنے لگے۔ پانچ چھ آدمی اور دوڑ آئے۔ اور انھوں نے لڑکوں کے
ساتھ ملکر جلانا شروع کیا مسٹر لاٹن ڈرے کہ کہیں مجمع زیادہ نہ ہو جائے۔ اور انھوں
نے ایک رکشا[1] والے کو پکارا مجھے رکشا پر بیٹھنا پسند نہ تھا۔ آج پہلی بار اس کا اتفاق ہوا
مگر لڑکوں نے مجھے بیٹھنے نہیں دیا۔ انھوں نے رکشا والے کو ایسا دھمکایا کہ وہ اپنی
جان لیکر بھاگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا۔ یہانتک کہ رستہ
بالکل رک گیا پہلے انھوں نے مسٹر لاٹن کو پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کر دیا اس کے بعد مجھپر اینٹ
پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھار کر دی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ
مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ مجھے غش آنے لگا اور میں ایک مکان کے جنگلے کے سہارے
کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں۔ مگر لوگوں نے اس کا موقع نہیں دیا انھوں نے پہنچکر گھونسے
اور مکے مارنا شروع کئے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف
تھیں ادھر سے گذر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لئے آئیں اور اپنی
چھتری کھولکر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اس سے لوگوں کا حملہ کچھ
کم ہوا۔ کیونکہ اگر مجھے مارتے تو مسز الیکزینڈر کے بھی چوٹ آتی۔

اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا دوڑ کر
کوتوالی پہنچ گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر الیکزینڈر نے سپاہیوں کا ایک دستہ
بھیجا کہ مجھے حلقے میں لیکر گھر پہونچا دے۔ یہ سپاہی عین وقت پر پہونچے۔ کوتوالی ہمارے
رستے میں تھی جب ہم وہاں پہونچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کوتوالی میں
پناہ لو مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا میں نے ان سے کہا "جب ان لوگوں
کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو آپ ہی خاموش ہو جائیں گے مجھے ان کی انصاف

(۱) ایک ہلکی سی گاڑی جسے آدمی کھینچتا ہے۔

پسندی پر اعتماد ہے"۔ پولیس کی حفاظت میں بغیر کسی مزید دقت کے رستم جی کے یہاں پہونچ گیا۔ میرا بدن جا بجا سے چھل گیا تھا مگر سوائے ایک جگہ کے کہیں زخم نہیں آیا تھا جہاز کے ڈاکٹر دادی بارجور صاحب وہیں موجود تھے۔ اور انھوں نے بہت توجہ سے میری مرہم پٹی کی۔

گھر کے اندر سکون تھا۔ مگر باہر پورے مکان گھیرے ہوئے تھے۔ رات ہونے والی تھی۔ اور مجمع گلا پھاڑ کر چلا رہا تھا "گاندھی کو ہمارے حوالہ کر دو"۔ بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ پولیس موقعے پر پہونچ گئے تھے اور مجمع کو دھمکا کر نہیں بلکہ پرچا کر قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دل میں وہ بھی پریشان تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہلا بھیجا "اگر آپ اپنے دوست کے گھر بار کو اور اپنے خاندان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے بچانا چاہتے ہیں تو جیسے میں کہوں بھیس بدل کر نکل جائیے"۔

اس طرح ایک ہی دن مجھے دو متضاد حالتوں سے سابقہ پڑا جب جان کا خطرہ محض خیالی تھا اسوقت سٹر لاٹن نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کھلے بندوں شہر میں جاؤں۔ اور میں نے اسے قبول کیا۔ جب خطرہ سچ مچ آ پہنچا تو ایک اور دوست نے مجھے اسکے خلاف رائے دی اور میں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ خدا جانے میں نے یہ اس لئے کیا کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آئی یا اس لئے کہ اپنے دوست کے گھر بار کو یا اپنے بیوی بچوں کو خطرے سے بچاؤں؟ کون شخص وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ میں اس وقت بھی حق بجانب تھا جب میں نے بقول دوسروں کے بہادری سے مجمع کا مقابلہ کیا۔ اور اسوقت بھی جب میں بھیس بدل کر ان کے مقابلے سے بھاگ نکلا؟

جو باتیں ہو چکیں۔ ان کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنا فضول ہے جو فائدہ ہے وہ اس میں ہے کہ انسان انہیں سمجھے۔ اور اگر ممکن ہو تو ان سے آئندہ کے لئے سبق حاصل کرے۔ پہلے سے یہ بتانا دشوار ہے کہ فلاں شخص فلاں موقعے پر کیا کرے گا۔ اور پھر کسی شخص

کے ظاہری افعال سے اس کی نیت پر حکم لگا نا بھی گویا ناکافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کرنا ہے۔

بہر حال بھاگنے کی تیاری میں میں اپنی چوٹوں کی تکلیف بھول گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے کے مطابق میں نے ایک ہندوستانی کانسٹبل کی وردی پہن لی اور سر پر دھات کی ایک طشتری رکھ کر اس پر مدراسی صافا لپیٹ لیا کہ خود کا کام دے سکے۔ میرے ساتھ دو سراغرساں تھے جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بھیس بدلا اور چہرے کو رنگ کر ہندوستانیوں کی سی شکل بنالی تھی۔ دوسرے کا بھیس مجھے یاد نہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی گلی سے ہو کر قریب کی دوکان پر پہونچے۔ اور بوروں کے ڈھیر میں سے جو گودام میں لگا ہوا تھا گذر کر دوکان کے دروازے نکل گئے۔ یہاں مجمع میں گھس پیٹھ کر گلی کے نکڑ پر اس گاڑی تک پہونچے جو میرے لئے کھڑی تھی۔ اس گاڑی نے ہمیں کوتوالی میں پہونچا دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے مسٹر الیکزنڈر نے مجھسے پناہ لینے کو کہا تھا۔ میں نے ان کا اور سراغرسانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اُدھر میں بھاگ رہا تھا اور ادھر مسٹر الیکزنڈر یہ بول گا کر مجمع کو بہلا رہے تھے:۔

پھانسی دیدو گاندھی کو
کھٹے سیب کے پیڑ پر

جب انھیں معلوم ہو گیا کہ میں حفاظت کے ساتھ کوتوالی پہونچا دیا گیا تو انھوں نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا "بھئی تمھارا شکار تو قریب کی دوکان سے ہو کر نکل گیا میری صلاح یہ ہے کہ اب تم بھی گھر کی راہ لو۔" بعض لوگ بگڑے، بعض ہنسنے لگے، اور بعض کو یہ بات یقین نہیں آئی۔

سپرنٹنڈنٹ نے کہا "اچھا اگر تمھیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو اپنی طرف سے

دو ایک نمایندے مقرر کردیں انہیں گھر کے اندر لیجانے پر تیار ہوں۔ اگر وہ گاندھی کو ڈھونڈھ نکالیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے تمہارے حوالے کردوں گا لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر تمکو منتشر ہونا پڑے گا۔ تم کوئی رستم جی کا مکان ڈھانے یا گاندھی کے بیوی بچوں کو ستانے تھوڑی آئے ہو۔"

مجمع نے اپنے نمائندے گھر کی تلاشی لینے کے لئے بھیجے۔ وہ تھوڑی دیر میں ناکام واپس آئے اور مجمع خدا خدا کرکے منتشر ہوا۔ اکثر لوگ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی تعریف کر رہے تھے کہ انھوں نے بڑی موقع شناسی سے کام لیا اور بعضے غصے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔

مسٹر چیمبرلین آنجہانی نے جو اس زمانے میں وزیر نوآبادیات تھے۔ نٹال کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا جنھوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مسٹر اسکومب نے مجھے بلایا اور کہا "مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ اذیتیں اٹھانا پڑیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کی خفیف سی تکلیف بھی گوارا نہیں۔ بیشک آپ کو یہ حق تھا کہ آپ مسٹر لاٹن کے مشورے کو مانیں اور بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کریں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے پر عمل کرتے تو حادثہ پیش نہ آتا۔ اگر آپ حملہ کرنیوالوں کو شناخت کرسکیں تو میں اس کے لئے تیار ہوں کہ انہیں گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلاؤں۔ مسٹر چیمبرلین نے بھی مجھ سے یہی خواہش کی ہے۔"

میں نے جواب دیا "میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے میں ان میں سے دو ایک کو پہچان لوں۔ مگر انہیں سزا دلانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور میرے نزدیک ان لوگوں کا کوئی قصور بھی نہیں۔ انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کیں۔ اور انہیں بدنام کر دیا۔ ان باتوں کو سنکر انہیں طیش آگیا تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ قصور جو کچھ ہے وہ ان کے لیڈروں کا یعنی دوسرے الفاظ میں خود آپ کا ہے۔ آپ انکی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے خود

ریوٹر ... بردے پر یہ فرض کر لیا کہ میں نے ضرور مبالغے سے کام لیا ہوگا میں کسی سے مواخذہ کرنا نہیں چاہتا مجھے یقین ہے کہ جب صحیح حالات معلوم ہوں گے تو لوگوں کو اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہوگی۔"

مسٹر ایسکومب نے کہا "اگر آپ کا کوئی ہرج نہ ہو تو یہ الفاظ مجھے لکھکر دیدیجئے کیونکہ مجھے مسٹر چیمبرلین کو اس مضمون کا تار دینا پڑیگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی تحریر دیں۔ آپ کا جی چاہے تو آخری فیصلہ کرنے سے پہلے مسٹر لاٹن اور دوسرے دوستوں سے مشورہ کر لیجئے۔ یہ میں ضرور مانتا ہوں کہ اگر آپ حملہ آوروں کو سزا دلانے کے حق سے دست بردار ہو جائیں تو مجھے امن قائم کرنے میں بڑی مدد ملیگی اور آپ کی بھی نیک نامی ہوگی۔"

میں نے کہا "میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جو کچھ فیصلہ کرنا تھا میں نے آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی کر لیا۔ یہ میرے عقیدے کے خلاف ہے کہ میں حملہ آوروں پر مقدمہ چلاؤں۔ اور میں اسی وقت اپنا فیصلہ لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں۔"

یہ کہکر میں نے اپنا بیان لکھا اور ان کے حوالے کیا۔

چوتھا باب

طوفان کے بعد سکون

جب میں مسٹر ایسکومب سے ملنے گیا تو مجھے کوتوالی میں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ میری حفاظت کے لئے دو کانسٹبل ساتھ کر دئے گئے تھے مگر یہ احتیاط بے ضرورت ثابت ہوئی۔

جس دن میں جہاز سے اترنے والا تھا اسی روز زرد جھنڈے کے اترتے ہی نٹال ایڈورٹائزر[1] کا نمایندہ مجھ سے سوال و جواب کرنے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں اور میں نے ان تمام الزامات کی جو مجھ پر لگائے گئے تھے کماحقہ تردید کر دی۔ سر فیروز شاہ مہتا کے مشورے کی بدولت میں نے ہندوستان میں جتنی تقریریں کی تھیں سب لکھ کر کی تھیں۔ اور میرے پاس ان کی اور اپنی دوسری تحریروں کی نقلیں موجود تھیں۔ میں نے یہ سب چیزیں اخبار کے نمایندے کو دیدیں اور اس پر ثابت کر دیا کہ میں نے ہندوستان میں جتنی باتیں کہیں وہ سب میں اس سے پہلے جنوبی افریقہ میں زیادہ سخت الفاظ میں کہہ چکا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی یقین دلا دیا کہ کورلینڈ اور نادیری کے مسافروں کو جنوبی افریقہ لانے میں مجھے مطلق کوئی دخل نہیں ہے۔ ان میں سے بعض تو یہاں کے پرانے باشندے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو نٹال میں بسنے کے لئے نہیں آتے ہیں بلکہ ٹرانسوال جا رہے ہیں۔ جو لوگ دولت کی تلاش میں جنوبی افریقہ آتے ہیں ان کے لئے نٹال سے بہتر موقع ٹرانسوال میں ہیں۔ اس لئے اکثر

---

[1] اخبار کا نام ہے۔

ہندوستانی وہیں جانا پسند کرتے ہیں۔

ادھر تو یہ بیان شائع ہوا اور اُدھر میں نے حملہ آوروں پر مقدمہ چلانے سے انکار کر دیا۔ ان باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ اور ڈربن کے یورپی اپنی حرکتوں پر سخت نادم ہوئے۔ اخباروں نے میرا بے قصور ہونا تسلیم کر لیا اور عوام کو لعنت ملامت کی۔ اس طرح یہ حملہ آگے چلکر میرے لئے یعنی قومی مقصد کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس سے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی وقعت بڑھ گئی۔ اور میرے کام میں آسانی پیدا ہو گئی۔

تین چار دن کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اطمینان سے اپنا کام کرنے لگا۔ اس واقعے کی بدولت میرے پاس مقدمے بھی زیادہ آنے لگے

مگر اس واقعے سے جہاں ہماری قوم کی وقعت بڑھی۔ وہاں مخالفوں کے دلوں میں تعصب کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستانی مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے۔ تو لوگ ہندوستانیوں کو خطرناک سمجھنے لگے۔ نٹال کی مجلس وضع قوانین میں دو قانونوں کے مسودے پیش ہوئے جن میں سے ایک کا مقصد ہندوستانی تاجروں کے مفاد کو پامال کرنا اور دوسرے کا مقصد ہندوستانیوں کے داخلے کو محدود کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس جدوجہد کی بدولت، جو ہم نے ووٹ کے حق کے لئے کی تھی، یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ آئندہ کوئی قانون خاص ہندوستانیوں کے خلاف پاس نہیں ہو سکے گا یعنی قانون میں رنگ اور نسل کی کوئی تمیز نہیں ہو گی۔ مذکورہ بالا مسودوں کے الفاظ ایسے رکھے گئے کہ ان کا اطلاق سب پر ہو سکے۔ مگر ان کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ نٹال کے ہندوستانی باشندوں پر مزید قیود حاصل کی جائیں۔

ان مسودات قانون کی بدولت میرا قومی کام بہت بڑھ گیا اور ہندوستانیوں

کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے فرائض کا احساس پیدا ہو گیا۔ ان مسودوں کے ہندوستانی زبان میں ترجمے ہوئے اور تشریحیں کی گئیں۔ تاکہ لوگ ان کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہم نے وزیر نوآبادیات کو اس مسئلے پر توجہ دلائی مگر انھوں نے مداخلت کرنے سے انکار کیا۔

اب میرا وقت زیادہ تر قومی کاموں میں صرف ہونے لگا۔ من سکھ لال جی جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ڈربن میں موجود تھے۔ وہ میرے ساتھ رہنے لگے اور چونکہ ان کا وقت قومی کاموں کے لیے وقف تھا، اس لئے ان کے سبب سے میرا بوجھ کسیقدر کم ہو گیا۔

میری عدم موجودگی میں سیٹھ آدم جی میاں خاں نے سیکریٹری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے تھے۔ انھوں نے ممبروں کی تعداد بہت بڑھالی تھی اور نٹال انڈین کانگریس کے پاس ایکہزار پونڈ سرمایہ جمع ہو گیا تھا ہندوستانی مسافروں کیخلاف مظاہرے نے اور مسودوں نے جو بیداری پیدا کر دی تھی اس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ بہت سے لوگ ممبر ہوگئے اور سرمائے کی تعداد ... ۵ پاؤنڈ تک پہنچ گئی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ کانگریس کے لئے مستقل سرمایہ جمع ہو جائے جس سے جائداد خرید لی جائے اور جائداد کی آمدنی خرچ کیجائے۔ مجھے کسی قومی ادارے کے انتظام کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ میں نے اپنی تجویز اپنے رفیقوں کے سامنے پیش کی اور انھوں نے اسے بہت پسند کیا۔ جو جائداد خریدی گئی تھی وہ کرائے پر اٹھا دی گئی اور اسکی آمدنی سے کانگریس کے معمولی اخراجات اچھی طرح چلنے لگے۔ جائداد کے لئے معقول ٹرسٹی مقرر کر دیئے گئے۔ یہ جائداد اب تک موجود ہے۔ مگر اسکی بدولت آپسمیں نزاع پیدا ہو گئی ہے چنانچہ اس کی آمدنی عدالت میں جمع ہوتی ہے۔

یہ افسوسناک صورت حال میرے جنوبی افریقہ سے چلے آنے کے بعد پیدا ہوئی

لیکن میرا خیال قومی اداروں کے لئے مستقل سرمایہ رکھنے کے بارے میں اس نزاع سے بہت پہلے بدل چکا تھا اور اب متعدد قومی اداروں کا وسیع تجربہ حاصل کرنے کے بعد میرا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ ان اداروں کو مستقل سرمائے کی مدد سے چلانا اچھا نہیں ہے۔ قومی ادارہ وہ ہے جو قوم کی مرضی سے اور اس کے روپئے سے چلایا جائے۔ جب یہ ادارہ قوم کی مدد سے محروم ہو جائے تو اسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جو ادارے مستقل سرمایات سے چلتے ہیں ان کے کارکن اکثر رائے عامہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اس کے خلاف عمل کرتے ہیں ہمیں اپنے ملک میں روزمرہ اسکا تجربہ ہوتا ہے۔ بعض نام نہاد مذہبی وقف ایسے ہیں جنھوں نے اپنے حسابات شائع کرنا موقوف کر دیا ہے۔ ٹرسٹی مالک بن بیٹھے ہیں اور وہ اپنے آپ کو کسیکا ماتحت نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک قومی اداروں کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان چیزوں کی طرح جو فطرت کی گود میں پلتی ہیں اپنی غذا روز کے روز حاصل کیا کریں۔

مگر میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا خطاب ان اداروں سے نہیں جن کے لئے مستقل عمارت ہونا لازمی ہے۔ میرے کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ معمولی خرچ ان چندوں سے چلنا چاہئے جو لوگ اپنی خوشی سے ہر سال دیا کریں۔

جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کے زمانے میں ان خیالات کی تصدیق ہوئی۔ یہ شاندار جنگ جس میں لاکھوں روپئے صرف ہوئے چھ سال تک بغیر مستقل سرمائے کے جاری رہی۔ مجھے بعض ایسے موقعے یاد ہیں جب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر کل چندہ نہ ملا تو کیا انجام ہو گا۔ لیکن یہ ذکر ابھی قبل از وقت ہے۔ آیندہ صفحوں کو پڑھکر ناظرین پر اس رائے کی صحت اچھی طرح ثابت ہو جائے گی۔

پانچواں باب

بچوں کی تعلیم

جنوری ۱۸۹۷ء میں جب میں ڈربن پہونچا تو میرے ساتھ تین بچے تھے۔ میرا بھانجا جس کی عمر دس برس کی تھی اور میرے دونوں لڑکے جن میں سے بڑے کی عمر نو سال کی اور چھوٹے کی پانچ سال کی تھی۔ میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ انہیں کہاں پڑھاؤں؟

میں انھیں یورپی بچوں کے اسکولوں میں بھیج سکتا تھا مگر اس صورت میں خاص رعایت اور استثناء کی درخواست کرنا پڑتی۔ ان اسکولوں میں ہندوستانی بچے داخل نہیں کئے جاتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لئے مشن اسکول تھے مگر میں وہاں اپنے بچوں کو پڑھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے وہاں کی تعلیم پسند نہیں تھی۔ ایک تو وہاں پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی یا شاید خاص صورتوں میں غلط سلط اردو یا تامل میں، اور اس کا اہتمام بھی وقت سے خالی نہ تھا۔ میں ان خرابیوں کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس عرصے میں میں انھیں اپنے طور پر تھوڑا بہت پڑھاتا تھا۔ مگر اس میں اور کچھ نہیں تو یہ دقت ضرور تھی کہ پابندی سے پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ اور کوئی گجراتی پڑھانے والا ملتا نہیں تھا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایسے انگریز معلم کے لئے اشتہار دیا جو ان بچوں کو میری نگرانی میں تعلیم دے سکے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ معلم انھیں تھوڑی دیر باقاعدہ تعلیم دیا کرے اور باقی وقت میں مجھے جب فرصت ملے میں پڑھا دیا کروں۔ چنانچہ میں نے ایک انگریز معلمہ ۷ پونڈ ماہوار پر رکھی۔ کچھ دن اس طرح کام چلتا رہا۔ مگر اس سے میرا اطمینان نہیں ہوا۔ میں بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ گجراتی میں گفتگو کرتا تھا جس کی بدولت

انھیں اپنی مادری زبان تھوڑی بہت آگئی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں ہندوستان بھیجوں کیونکہ میں چھوٹے بچوں کو والدین سے جدا کرنے کا مخالف تھا۔ اگر گھر سلیقے کا ہو تو جو تعلیم بچے خود بخود اس فضا میں حاصل کرتے ہیں وہ بورڈنگ ہاؤس میں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں نے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔ ہندوستان میں میں نے اپنے بڑے بیٹے اور بھتیجے کو چند مہینے کے لئے اقامتی مدرسوں[1] میں بھیجکر دیکھا تھا مگر انہیں واپس بلا لینا پڑا۔ آگے چلکر میرا بڑا لڑکا جسے بالغ ہوئے بہت دن ہو چکے تھے گھر سے بھاگ کر ہندوستان چلا گیا اور احمد آباد کے ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھتیجا اس تھوڑی بہت تعلیم سے جو اُسے میرے یہاں ملتی تھی مطمئن تھا۔ افسوس ہے کہ وہ تھوڑے دن بیمار رہ کر عین شباب میں مر گیا۔ میرے اور تینوں بیٹوں میں سے کوئی عام اسکولوں میں نہیں پڑھا۔ البتہ انھوں نے کچھ دن اس ہنگامی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم پائی ہے جو میں نے جنوبی افریقہ میں ستیاگرہیوں کے بچوں کے لئے کھولا تھا۔

ان میں سے کوئی تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ میں جتنا وقت ان بچوں پر صرف کرنا چاہتا تھا اتنا نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی طرف پوری توجہ نہ کر سکنے سے اور بعض اور ناگزیر اسباب سے میں انھیں حسب دلخواہ ادبی تعلیم نہ دے سکا اور انھیں اس بارے میں مجھ سے اکثر شکایت رہی ہے جب کبھی وہ کسی ایسے شخص سے ملتے ہیں جو بی۔ اے۔ یا ایم۔ اے۔ یا صرف انٹرنس ہی پاس ہو۔ تو انھیں اسکول میں تعلیم نہ پانے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

تاہم میرا یہ خیال ہے کہ اگر میں انھیں آنکھ بند کر کے عام اسکولوں میں بھیجدیتا تو یہ اس تربیت سے محروم رہتے جو صرف تجربے کے مکتب میں یا والدین کی صحبت ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ مجھے جیسا اطمینان ان کی طرف سے اب رہتا ہے ہرگز نہ رہتا۔ اور مجھ سے بچھڑ کر انگلستان یا جنوبی افریقہ میں ان کو جو تعلیم ملتی وہ انہیں وہ سادگی اور جوش خدمت کبھی نہ

---

[1] Residential schools

سکھائی جو آج ان کی زندگی میں نمایاں ہے پھر ان کے مصنوعی طرز معاشرت سے میرے قومی کام میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ اس لئے گو میں انہیں اتنی ادنیٰ تعلیم نہیں دینا کہ میرے یا ان کے لئے قابل اطمینان ہوتی۔ لیکن جب میں گذرے ہوئے زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید میں نے ان کے حقوق ادا کرنے میں اپنے امکان بھر کوتاہی نہیں کی۔ مجھے اس کا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے انہیں عام اسکولوں میں نہیں بھیجا۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ میرے بڑے بیٹے کی سیرت میں بے عنوانیاں نظر آتی ہیں۔ یہ خود میری ابتدائی زندگی کی خامکاریوں کی صدائے بازگشت ہے۔ میں اپنی اس عمر کو ناقص علم اور نفس پرستی کا زمانہ سمجھتا ہوں یہی دن میرے بڑے بیٹے کے بچپن کے تھے۔ جب اس کا دل خارجی اثرات کو آسانی سے قبول کرتا تھا۔ اسی سبب سے وہ اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ میرا نفس پرستی اور ناتجربہ کاری کا دور تھا۔ اسے یقین ہے کہ وہ زمانہ میری زندگی کی معراج کا تھا اور آگے چلکر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ فریب نفس کا نتیجہ ہیں جسے غلطی سے بصیرت کہتے ہیں۔ اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ یہ کیوں نہ سمجھے کہ میرا ابتدائی زمانہ بیداری کا دور تھا اور آگے چلکر جو انقلاب ہوا وہ محض خدع نفس اور خود پرستی ہے مجھ سے اکثر میرے دوستوں نے ایسے سوال کئے ہیں جن کا جواب دینا مشکل ہے؟ اگر تم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تو کیا ہرج تھا تمہیں کیا حق تھا کہ ان کی دماغی نشو ونما کو روک دو؟ تم نے انھیں یہ آزادی کیوں نہ دی کہ کالجوں سے سندیں لیں اور جو پیشہ انھیں پسند ہو وہ اختیار کریں۔

میرے خیال میں اس قسم کے سوال بالکل فضول ہیں مجھے بہت سے طالب علموں سے سابقہ رہا ہے۔ مجھے جن تعلیمی تجربوں کا خبط ہے وہ میں نے خود یا دوسروں کے توسط سے اور بچوں پر بھی کر کے دیکھے ہیں۔ آج میں بہت سے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو میرے لڑکوں کے ہم عمر ہیں اور میرے خیال میں میرے لڑکے ان سے ہرگز ہیٹے نہیں ہیں۔

لیکن میرے تجربوں کا آخری نتیجہ ابھی مستقبل کے پردے میں پنہاں ہے۔ میری غرض ان باتوں کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ عمرانیات کا مطالعہ کرنیوالوں کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ گھر کی باضابطہ تعلیم میں اور اسکول کی تعلیم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اور بچوں پر ان کے والدین کی زندگی کے تغیرات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ حق کے طالب کو تلاش حق میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور آزادی کے شیدا یہ دیکھ لیں گے کہ یہ پر جلال دیوی کتنی قربانیاں مانگتی ہے۔ اگر مجھ میں خودداری نہ ہوتی اگر میں اپنے بچوں کو وہ تعلیم دلا کر خوش ہوتا جو اور بچے نہیں پا سکتے تھے تو ان کی ادبی تعلیم تو ہو جاتی لیکن آزادی اور خودداری کی عملی تربیت سے وہ محروم رہتے جس کی خاطر میں نے اس ادبی تعلیم کو قربان کر دیا۔ ایسی صورت پیش آجائے کہ آزادی اور علم میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنا ہو تو کون ایسا شخص ہے جو آزادی کو علم سے ہزار درجے بڑھ کر نہ سمجھیگا؟

جن نوجوانوں کو میں نے ۱۹۲۰ء میں غلامی کے گھروں یعنی اسکولوں اور کالجوں کے چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا جن سے میں نے یہ کہا تھا کہ آزادی کی خاطر ان پڑھ رہ کر پتھر پھوڑنا اس سے اچھا ہے کہ آدمی زنجیروں میں جکڑا ہوا ادبی تعلیم پاتا ہو، ان پر اب غالباً یہ کھل جائیگا کہ میرے مشورے کی بنیاد کیا تھی۔

چھٹا باب

جوشِ خدمت

میری وکالت اچھی طرح چل رہی تھی۔ مگر یہ میرے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا۔ مجھے بہت دن سے اس خیال نے بےچین کر رکھا تھا کہ میں اپنی زندگی میں اور سادگی پیدا کروں اور اپنے ہم جنسوں کی کوئی محسوس خدمت انجام دوں۔ ایک روز میرے پاس ایک کوڑھی آیا۔ میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ اسے کھانا کھلا کر رخصت کر دوں۔ اس لئے میں نے اسے اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ اور اس کی مرہم پٹی اور خبرگیری کرنے لگا۔ مگر اس طرح کب تک کام چلتا۔ نہ تو مجھ میں اتنی استطاعت تھی اور نہ یہ میرا ارادہ تھا کہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔ اس لئے میں نے اسے پابند مزدوروں کے ہسپتال میں بھیج دیا۔

مگر اس سے مجھے تسکین نہیں ہوئی مجھے یہ آرزو تھی کہ رفاہ عام کا کوئی مستقل کام کروں۔ ڈاکٹر بوتھ سینٹ ایڈان کی مشن کے سردار تھے۔ یہ بڑے رحمدل آدمی تھے اور مریضوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ پارسی رستم جی کی فیاضی کی بدولت ہم نے ڈاکٹر بوتھ کی نگرانی میں ایک خیراتی ہسپتال کھلوایا۔ میں اس ہسپتال میں تیمارداری کی خدمت انجام دینے لگا۔ دوا تقسیم کرنے میں مجھے ایک سے لیکر دو گھنٹے تک لگ جاتے تھے اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اتنا وقت اپنے دفتر کے کام سے بچا کر ہسپتال کے دوا خانے میں کمپونڈر کا کام کیا کروں گا۔ وکالت میں مجھے زیادہ تر دفتری کام کرنا پڑتا تھا یعنی پنچایت اور انتقال جائداد کا کام۔ کبھی کبھی مجھے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کے لئے بھی جانا پڑتا تھا لیکن اکثر مقدمے بہت سادے ہوتے تھے۔ اور مسٹر خان نے جو میرے بعد جنوبی افریقہ

آئے تھے اور میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس بات کا ذمہ لے لیا کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو ان مقدموں کو سنبھال لیا کرینگے۔ اس طرح مجھے اس چھوٹے سے ہسپتال میں کام کرنے کے لئے وقت مل گیا۔ اس میں مجھے روز صبحکو (ہسپتال آنے جانے کا وقت ملاکر) دو گھنٹے صرف کرنا پڑتے تھے۔ اس کام سے میرے قلب کو کچھ تسکین ہوئی میں مریضوں کے حالات دریافت کرکے ڈاکٹر سے بیان کیا کرتا تھا اور پھر دوا بنا کر تقسیم کرتا تھا۔ اس طرح مجھے ہندوستانی مریضوں سے جن میں سے اکثر تامل تیلیگو یا شمالی ہندوستان کے پابند مزدور تھے۔ ملنے جلنے کا موقع ملا۔

یہ تجربے اسوقت میرے بہت کام آئے جب میں جنگ بوئر میں رضاکار کی حیثیت سے بیمار اور زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کر رہا تھا۔

مجھے بچوں کی تربیت کا خیال ہر وقت رہتا تھا جنوبی افریقہ آنے کے بعد میرے دو لڑکے اور ہو چکے تھے۔ ہسپتال میں کام کرنے سے مجھے ان بچوں کی تربیت میں بڑی مدد ملی۔ مجھے اپنی آزادی پسند طبیعت کی بدولت اکثر تکلیفیں اٹھانا پڑتی تھیں جب میری بیوی کے بچہ ہونیوالا تھا۔ تو ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ بہترین طبی امداد حاصل کیجائے لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ڈاکٹر اور دائی نے وقت پر دھوکا دیا تو ہم کیا کریں گے؟ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ دائی ہندوستانی ہو۔ لیکن تربیت یافتہ دائی کا ملنا ہندوستان ہی میں مشکل ہے پھر آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں کیا حال ہوگا۔ اس لئے میں نے طبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا کہ وضع حمل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے جو ضروری باتیں ہیں وہ معلوم ہو جائیں۔ میں نے ڈاکٹر تربھوونداس کی کتاب "ما نے شکیھان" رہنمائے مادراں" پڑھی۔ اور دونوں بچوں کی پرورش اس کی ہدایتوں کے مطابق شروع کی مگر اس میں کہیں کہیں اپنے تجربے سے بھی کام لیتا تھا۔ دونوں مرتبہ دو دو مہینے کے لئے دائی بھی رکھی گئی۔ لیکن اس کا اصل کام میری بیوی کی مدد کرنا تھا۔ بچوں کی پرداخت میں خود کرتا تھا۔

دوسرے بچے کی پیدائش میرے لئے بڑی آزمائش کا موقع تھا۔ میری بیوی کو درد زہ اچانک شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر فوراً نہیں آسکتا تھا اور دائی کے لانے میں بھی دیر ہوئی۔ اگر وہ موجود بھی ہوتی تو اس سے وضع حمل میں کوئی مدد نہ ملتی۔ مجھے خود دائی کا کام کرنا پڑا۔ ایسے اکثر تر بھوونداس کی کتاب کا مطالعہ بہت کام آیا میرے اوسان قائم رہے۔ ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا۔

میرے خیال میں بچے کی مناسب تربیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ والدین ان کی پرورش اور پرداخت کے عام اصول جانتے ہوں۔ ان اصولوں کے مطالعے سے ہر ہر قدم پر فائدہ محسوس ہوا۔ اگر میں ان باتوں کو سیکھکر کام میں نہ لاتا تو میرے بچوں کی عام صحت اتنی اچھی نہ ہوتی جتنی اب ہے۔ ہمارے دل میں ایک غلط خیال یہ جم گیا ہے کہ بچے کو اپنی زندگی کے پہلے پانچ سال میں کچھ سیکھنا نہیں پڑتا ہے حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے بچہ پہلے پانچ سال میں جو چیزیں سیکھتا ہے۔ وہ بڑا ہوکر کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ بچے کی تعلیم حمل قرار پاتے ہی شروع ہوجاتی ہے اس خاص لمحے میں والدین کی جو جسمانی اور ذہنی حالتیں ہوتی ہیں وہ بچے میں بھی پیدا ہوجاتی ہیں پھر حمل کے زمانے میں اسے ماں کی کیفیتوں، خواہشوں، مزاج اور طرز معاشرت کا اثر پڑتا رہتا ہے ولادت کے بعد بچہ والدین کی حرکات و سکنات کی نقل کرتا ہے اس لئے بہت برسوں تک اس کی نشو و نما بالکل انہیں پر منحصر ہوتی ہے۔

جو میاں بیوی ان باتوں کو سمجھ لیں گے وہ کبھی محض اپنی شہوانی خواہش پوری کرنے کے لئے مباشرت نہ کریں گے۔ بلکہ صرف اسوقت ہمبستر ہونگے جب انہیں اولاد کی خواہش ہو میرے نزدیک یہ خیال انتہائی جہالت پر مبنی ہے کہ جماع بھی کھانے پینے کی طرح جسم کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ یہ وہ فعل ہے جس پر دنیا کے وجود کا انحصار ہے اور چونکہ دنیا شاہد حقیقی کی بازی گاہ اور اسکے حسن کی جلوہ گاہ ہے اسلئے اس فعل کو راہ پر لگا کر اس سے دنیا کی منظم نشو و نما کا کام لینا چاہئے جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائیگی وہ دل میں ٹھان لیگا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے شہوانی خواہش کو ضبط کرنا چاہئے اور بچوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی فلاح کے طریقے خود سیکھنا اور آئندہ نسلوں کو سکھانا چاہئے۔

ساتواں باب

"برہمچاریہ"[1]

اب ہم اس موقعے پر پہونچ گئے ہیں جب میں برہمچاریہ کا عہد کرنے کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہا کرتا تھا۔ میں شادی کے بعد سے ایک بیوی کا پابند رہنے کا قائل تھا۔ کیونکہ بیوی سے عہد وفا نباہنے کو بھی میں حق کی محبت کا ایک جزو سمجھتا تھا۔ مگر یہ حقیقت مجھپر جنوبی افریقہ آنے کے بعد کھلی کہ بیوی سے بھی "برہمچاریہ" برتنا ضروری ہے۔

میں یہ ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ کس چیز نے یا کس کتاب نے مجھے اس طرف توجہ دلائی مگر مجھے خیال پڑتا ہے کہ اس میں جزو غالب رائچند بھائی کا اثر تھا جن کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں۔ مجھے ان سے اس معاملے میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ مجھے ابتک یاد ہیں۔ میں نے ان سے مسز گلیڈاسٹن کی تعریف کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی بڑی وفادار ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ مسٹر گلیڈاسٹن کے لئے دارالعوام میں خود چائے بناتی ہیں اور یہ بھی ان دونوں کی با اصول زندگی کا ایک اصول بن گیا ہے۔ میں نے یہ واقعہ رائچند بھائی سے بیان کیا اور اسی سلسلے میں کہا میاں بیوی کی محبت بھی کیا اچھی چیز ہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "تم ان دونوں چیزوں میں سے کسے زیادہ قابل قدر سمجھتے ہو۔ اس محبت کو جو یہ خاتون بیوی کی حیثیت سے مسٹر گلیڈاسٹن سے رکھتی ہیں یا اس پرخلوص خدمت کو جو وہ بغیر ان تعلقات کے انجام دیتیں؟ فرض کرو وہ ان کی بہن یا ان کی خادمہ ہوتیں اور ان کا اتنا ہی خیال رکھتیں جتنا اب رکھتی ہیں۔ تو کیا تم ان کی تعریف کرتے؟ کیا ایسی بہنوں یا ایسی خدمتوں

---

(۱) تجرد و عصمت کی زندگی۔

کی مثالیں موجود نہیں ہیں؟ فرض کرو۔ تمہارا کوئی خدمت گار تم سے اتنی ہی محبت رکھتا اور تمہاری ایسی ہی خدمت کرتا تو تمہیں ایسی ہی خوشی ہوتی جو مسز گلیڈ اسٹن کے معاملے ہوتی ہے؟ ذرا اس بات پر جو میں نے سمجھائی ہے غور کرنا۔"

رائچند بھائی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ اسوقت ان کے الفاظ بہت تلخ معلوم ہوتے تھے مگر انھوں نے میرے دل کو تسخیر کر لیا۔ میں نے سوچا کہ واقعی خادم کی وفاداری بیوی کی محبت سے بدرجہا زیادہ قابل تعریف ہے۔ بیوی کو میاں سے محبت ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان دونوں میں وہ رشتہ ہوتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ ایک بالکل قدرتی چیز ہے۔ لیکن نوکر کو آقا سے اتنی محبت پیدا کرنے کے لئے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کا نقطہ نظر آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آنے لگا

میں نے اپنے دل میں کہا تو پھر مجھے اپنی بیوی سے کس طرح کا تعلق رکھنا چاہیئے کیا وفاداری اسی کا نام ہے کہ میں اسے اپنی شہوت رانی کا ذریعہ بناؤں؟ جب تک میں نفسانی خواہشوں کا بندہ ہوں میری وفاداری کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ میری بیوی کبھی مجھے ترغیب نہیں دلاتیں۔ اس لئے اگر میں دل پر رکھ لوں تو "برہمچاریہ" کا عہد کرنا کوئی بڑی بات نہیں جو کچھ دقت ہے وہ میرے ارادے کی کمزوری اور میری بوالہوسی کے سبب سے ہے۔

میرے ضمیر میں یہ احساس پیدا ہونے کے بعد بھی مجھے دوبارہ ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ میری سعی کا محرک کوئی اعلیٰ جذبہ نہ تھا۔ میرا اصلی مقصد یہ تھا کہ اور بچے نہ ہوں۔ انگلستان کے قیام کے زمانے میں میں نے مانع حمل تدبیروں کے متعلق کتابیں پڑھی تھیں۔ میں نے جو باب نباتاتی مشرب کے متعلق لکھا ہے اس میں ڈاکٹر ایلنسن کی انضباط ولادت کی تحریک کا ذکر کیا ہے اس کا مجھ پر کچھ عارضی اثر ہوا تھا لیکن اس سے زیادہ اور دیرپا اثر ڈاکٹر ہلس کے خیالات کا ہوا جو ان طریقوں کے مخالف تھے اور

بیرونی کوشش کی بجائے اندرونی کوشش پر یعنی ضبط نفس پر زور دیتے تھے۔ اس لئے جب میں نے دیکھا کہ مجھے اور بچوں کی خواہش نہیں ہے تو میں ضبط نفس کی سعی کرنے لگا یہ بڑا کٹھن کام تھا۔ ہم میاں بیوی الگ الگ کمروں میں سونے لگے۔ میں نے یہ التزام کیا کہ بستر پر اسوقت تک نہ جاؤں گا جب تک دن بھر کے کام سے تھک کر چور نہ ہو جاؤں لبظاہر یہ کوششیں زیادہ کارگر نہیں معلوم ہوتی تھیں لیکن جب میں پچھلے زمانے پر غور کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ ان ناکام کوششوں کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ اور آخری فیصلہ اسی مجموعی اثر کا نتیجہ تھا۔

قطعی ارادہ میں نے کہیں ۱۹۰۶ء میں جاکر کیا۔ اسوقت تک ستیاگرہ شروع نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے اس کا سان گمان تک نہ تھا۔ میں جنگ بوئر کے تھوڑے دن بعد زولو بغاوت کے زمانے میں نٹال کے شہر جوہانسبرگ میں وکالت کر رہا تھا میں نے اپنا فرض سمجھکر اپنی خدمات نٹال کی حکومت کے سامنے پیش کیں۔ اور میری درخواست قبول ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے چلکر معلوم ہوگی۔ یہاں تو مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس کام کے سلسلے میں میں نے بڑے انہماک سے ضبط نفس کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا۔ اور معمول کے مطابق اپنے رفیقوں سے اس پر مبادلۂ خیالات کیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ توالد و تناسل کا مشغلہ قومی خدمت کے منافی ہے۔ مجھے زولو "بغاوت" کی مہم میں کام کرنے کی وجہ سے میرا جوہانسبرگ کا گھر اور درہم برہم ہوگیا۔ اپنی خدمات پیش کرنے کے ایک مہینے کے اندر مجھے وہ مکان چھوڑنا پڑا۔ جسے میں نے اتنی محنت سے آراستہ کیا تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو فینکس لے گیا۔ اور وہاں اس ہندوستانی ایمبولینس کور کی نگرانی کرنے لگا جو نٹال کے فوج کے ساتھ تھی ہمیں روز کڑی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں۔ ایک بار چلتے چلتے یہ خیال بجلی کی لہر کی طرح میرے ذہن میں دوڑ گیا کہ اگر میں اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں

تو مجھے بال بچوں اور دھن دولت کا خیال چھوڑ کر "دنیا پرست" یعنی مرد مجرد کی زندگی بسر کرنا چاہیے۔

"بغاوت" کی مہم میں میرے کل چھ ہفتے صرف ہوئے۔ مگر یہ مختصر عرصہ میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوا۔ نذر اور عہد کی حقیقت میرے دل پر پہلے سے زیادہ روشن ہو گئی۔ مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ عہد سے سچی آزادی کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ کھلتا ہے۔ اب تک مجھے کامیابی نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میرا ارادہ مضبوط نہیں تھا۔ اور مجھے اپنی ذات پر اور توفیق الٰہی پر بھروسہ نہ تھا۔ اور میرا دل شک کے تلاطم خیز سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عہد نہ کرنے سے انسان ترغیبوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور عہد کر لینا گویا نفس پرستی سے گذر کر سچی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ جو شخص یہ کہے "میں کوشش کا قائل ہوں۔ عہد کر کے اپنے ہاتھ پیر باندھنا نہیں چاہتا" تو وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی طبیعت کمزور ہے۔ اور جس چیز سے وہ بچتا ہے۔ اس کی تمنا اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی ہے۔ ورنہ آخری فیصلہ کرنے میں کون سی ایسی دشواری ہے؟ کہ جس سانپ کے متعلق میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے ڈسے گا اس سے بھاگنے کا میں قطعی عہد کر لیتا ہوں۔ محض بھاگنے کی کوشش پر قناعت نہیں کرتا۔ مجھ معلوم ہے کہ محض کوشش کرنے میں یقینی موت کا احتمال ہے۔ محض کوشش کے معنی تو یہ ہوئے کہ میں اس یقینی بات سے بےخبر ہوں کہ سانپ میری جان لیکر رہے گا اسی طرح ہر معاملے میں محض کوشش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص عمل کی ضرورت ابھی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے دل میں اکثر اس قسم کے شبہے پیدا

---

(۱) رضاکاروں کا دستہ جو زخمیوں اور بیماروں کی خدمت کے لئے فوج کے ساتھ رہتا ہے۔

ہوتے ہیں، "فرض کرو کہ میرے خیالات آگے چلکر بدل جائیں" میں عہد کرکے اپنی آزادی کیوں کھو دوں؟ مگر ایسے شبہے بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ جس چیز کو چھوڑنا ہے اسکے ترک کے متعلق ابھی ہمارے خیالات پوری طرح صاف نہیں ہوئے اسی لئے نشکلانند نے کہا ہے۔

"اشیا کا ترک بغیر خواہشات کے ترک کے کاغذ کی ناؤ ہے"۔

اس لئے اگر واقعی کسی شے کی خواہش دل سے نکل گئی ہے تو اس کے ترک کا عہد لازمی اور قدرتی بات ہے۔

آٹھواں باب

برہمچاریہ (۲)

اچھی طرح بحث کرنے کے بعد اور خوب سوچ سمجھ کر میں نے ۱۹۰۶ء میں برہمچاریہ کا عہد کر لیا۔ میں نے ابھی تک اپنے خیالات کا ذکر اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا مگر عہد کرتے وقت میں نے ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بے تامل منظور کر لیا۔ مگر آخری فیصلہ کرنا میرے لئے سہل نہ تھا۔ میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے جذبات کو کیونکر روکوں۔ اس زمانے میں یہ عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ شوہر اپنی بیوی سے ہمبستری ترک کر دے۔ مگر میں خدا کا نام لیکر اور اس کی مدد پر بھروسا کر کے عہد کر گذرا۔

جب میں اس عہد کے بعد کی زندگی پر جسے اب بیس سال ہو گئے غور کرتا ہوں تو میرا دل خوشی اور حیرت سے معمور ہو جاتا ہے۔ ضبط نفس کی کوشش میں ۱۹۰۱ء سے کر رہا تھا۔ اور اس میں کم و بیش کامیابی بھی ہوئی تھی۔ لیکن خوشی اور آزادی کا جو احساس عہد کرنے کے بعد ہوا۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ عہد کرنے سے پہلے مجھے ہر وقت ترغیب سے مغلوب ہو جانے کا خوف رہتا تھا۔ اب یہ عہد ہر ترغیب کے مقابلہ میں سپر کا کام دیتا تھا۔ برہمچاریہ کی عظیم الشان قوت کا مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا تھا۔ عہد کرنے کے وقت میں فینکس میں تھا۔ ایمبولینس کے کام سے فارغ ہوتے ہی وہاں آیا تھا۔ فینکس سے میں جوہانسبرگ واپس آ گیا۔ یہاں آئے ایک مہینے کے قریب ہوا تھا کہ ستیاگرہ شروع ہو گیا۔ گویا برہمچاریہ کا عہد مجھے بغیر میرے علم کے اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ ستیاگرہ کوئی پہلے سے سوچی ہوئی تجویز نہ تھی۔ یہ خود بخود بغیر میرے ارادے

کے شروع ہوگئی۔ لیکن یہ میں جانتا تھا کہ یہ میری پچھلی تمام جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہے۔ میں نے جو ہانسبرگ میں اپنے مصارف بہت گھٹا دیئے تھے اور فینکس آکر "برہمچاریہ" کا عہد کرلیا تھا۔

یہ بات شاستروں کے مطالعے سے نہیں سیکھی تھی کہ مکمل "برہمچاریہ" سے "برہما" کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے تجربے سے آہستہ آہستہ یہ احساس ہوگیا تھا اس کے متعلق شاستر کے "اشلوک" میری نظر کے آگے چلکر گزرے۔ عہد کے بعد سے مجھے روز بروز اس حقیقت کا علم ہوتا جاتا ہے۔ کہ "برہمچاریہ" میں ہمارے جسم، ہمارے ذہن اور ہمارے روح کی سلامتی ہے۔ کیونکہ اب "برہمچاریہ" میرے لئے کوئی کٹھن ریاضت کا معاملہ نہ تھا بلکہ تسکین اور راحت کا سرچشمہ ہر روز مجھے اس میں ایک نئی خوبی نظر آتی تھی۔

لیکن اگر یہ میرے لئے روزافزوں مسرت کا سرمایہ تھا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی سہل کام تھا۔ اب چھپن سال کی عمر میں بھی مجھے اس کی دشواریاں محسوس ہوتی ہیں۔ مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ "برہمچاریہ" برتنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے اور اس میں انسان کو ہر لحظہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں قدم ڈگمگا نہ جائے۔

اس عہد کی پابندی کے لئے پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ انسان ذائقے کے معاملے میں ضبط نفس سے کام لے۔ میں نے دیکھا کہ ذائقے کو پوری پوری طرح قابو میں رکھنے سے اس کی پابندی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اس لئے اب میں غذا کے متعلق جو تجربے کرتا تھا۔ ان میں صرف نباتاتی مشرب کی رعایت نہ ہوتی تھی بلکہ برہمچاری نقطہ نظر کا بھی لحاظ تھا۔ ان تجربوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ "برہمچاری" کی غذا قلیل، سادہ، بے مسالے کی اور ممکن ہو تو بے پکی ہونا چاہیے۔

چھ سال کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ "برہمچاری" کے لئے بہترین غذا تازہ پھل اور اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ ہیں۔ اس غذا کے استعمال کے دوران میں میرا دل

شہوانی خواہشوں سے جسقدر پاک رہا اتنا اس کے چھوڑنے کے بعد کبھی نہیں رہا۔
افریقہ میں جہاں میں سوائے تر اور خشک میووں کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ مجھے "برہمچاریہ"
کے لئے کوئی خاص سعی نہیں کرنا پڑتی تھی۔ لیکن جب سے میں نے دودھ کا استعمال
شروع کیا ہے اس عہد کی پابندی کے لئے بڑی سخت کوشش کی ضرورت ہوتی
ہے آگے چلکر معلوم ہوگا کہ میں نے پھل چھوڑکر دودھ کیطرف کیوں رجوع کیا۔ یہاں
اتنا کہدینا کافی ہے کہ میرے نزدیک دودھ کے استعمال سے یقیناً "برہمچاریہ" برتنے
دشواری ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ہر برہمچاری کے لئے دودھ ترک
کردینا لازمی ہے یہ تو متعدد تجربوں کے بعد بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ مختلف غذاؤں
استعمال کا "برہمچاریہ" پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مجھے اب تک دودھ کا کوئی ایسا بدل نہیں ملا
جو عضلات کی نشوونما میں بھی مدد دیتا ہو۔ اور آسانی سے ہضم بھی ہوجاتا ہو۔ میں۔
ڈاکٹروں ویدوں حکیموں سب سے پوچھ دیکھا۔ مگر کوئی مجھے ایسی چیز نہ بتا سکا۔ اس
گو میں جانتا ہوں کہ دودھ ایک حد تک محرک ہے۔ مگر میں فی الحال کسی کو اس کے ترک کر
کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

"برہمچاریہ" کو مدد دینے کی خارجی تدبیروں میں سے روزہ بھی اتنا ہی ضروری
ہے جتنی غذا کی سادگی اور قلت۔ حسی لذت کی خواہشیں اتنی قوی ہیں کہ انھیں قابو میں
رکھنے کے لئے جب تک ہر طرف سے گھیرا نہ ڈالا جائے کام نہیں چلتا۔ ہر شخص جانتا ہے
کہ غذا نہ ملنے سے ان کا زور ٹوٹ جاتا ہے اس لئے میرے نزدیک حسیات کو قابو میں
لانے کی غرض سے روزہ رکھنا بہت مفید ہے۔ بعض لوگوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ یہ سمجھ
کہ محض فاقے سے شہوانی خواہشوں سے نجات مل جائے گی وہ معدے کو تو خالی رکھتے ہیں
مگر تصور میں طرح طرح کی لذتوں کے مزے لیا کرتے ہیں۔ اور ہر وقت سوچا کرتے ہیں
کہ جب روزہ کھولیں گے تو یہ کھائیں گے اور یہ پئیں گے۔ اس طرح کے روزے سے نہ

ذائقے کو قابو میں لانے میں مدد ملتی ہے اور نہ شہوانی خواہش کو دبانے میں۔ روزہ تبھی مفید ہوتا ہے جب دل بھی بھوکے جسم کا ساتھ دے یعنی جن چیزوں کو جسم نے ترک کیا ہے ان سے دل بھی پھر جائے۔ دل ہی شہوانی خواہشوں کی جڑ ہے۔ اس لئے روزے کا فائدہ محدود ہے کیونکہ ممکن ہے کہ روزہ رکھ کر بھی انسان بدستور خواہشوں میں گھرا رہے پھر بھی شہوانی خواہشوں کا استیصال بے روزے کے ناممکن ہے۔ اس لئے "برہمچاریہ" میں یہ ایک ناگزیر چیز ہے۔ برہمچاریہ کے بہت سے طالب اس وجہ سے ناکامیاب ہوتے ہیں کہ دوسری خواہشوں کی باگ وہ اسی طرح ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں جیسے غیر برہمچاری اس لئے ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو انتہائی گرمی میں یہ کوشش کرتا ہے۔ کڑاکے کے جاڑے کا لطف اٹھائے۔ برہمچاری اور غیر برہمچاری کی زندگی میں نمایاں حد فاصل ہونا چاہیے۔ دونوں میں جو مشابہت ہے وہ محض دیکھنے کی ہے۔ اور وہ جو فرق ہے وہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ دونوں اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں۔ مگر برہمچاری ان سے خدا کے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور دوسرا شخص بے حقیقت کھلونوں کو دیکھتا ہے۔ دونوں اپنے کانوں کو کام میں لاتے ہیں مگر پہلا ذرے ذرے سے خدا کی حمد سنکر وجد کرتا ہے اور دوسرا واہیات باتوں پر سر دھنتا ہے۔ دونوں اکثر رات کو دیر تک جاگتے ہیں۔ مگر پہلا سارا وقت عبادت میں بسر کرتا ہے اور دوسرا بیہودہ رنگ رلیوں میں گنواتا ہے۔ دونوں کھانا کھاتے ہیں مگر پہلا صرف اس لئے کھاتا ہے کہ اس کا جسم جو خدا کا گھر ہے صحت کیساتھ قائم رہے۔ اور دوسرا دنیا بھر کی چیزیں ٹھونس کر اس پاک گھر کو گندی نالی بنا دیتا ہے۔ غرض دونوں میں بعد المشرقین ہے اور جوں جوں دن گذرتے جائیں گے یہ فاصلہ کم نہیں ہوگا۔ بلکہ اور بڑھتا جائے گا۔

"برہمچاریہ" کے معنی ہیں خیال قول اور عمل میں ضبط نفس سے کام لینا۔ مجھے روز بروز اس قسم کے ضبط کی ضرورت کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ ترک لذات کی بھی "برہمچاریہ"

کیطرح کوئی حد نہیں۔ مکمل "برہمچاریہ" انسان کی کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتا بہت سے لوگوں کے لئے یہ محض ایک نصب العین رہے گا۔ "برہمچاریہ" کے طالب کو ہمیشہ اپنی کوتاہیوں کا احساس رہتا ہے وہ اپنے دل کے گوشوں سے چھپی ہوئی خواہش کھود کھود کر نکالتا ہے اور ان سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے جب تک خیال پوری طرح ارادے کا تابع نہ ہو جائے مکمل "برہمچاریہ" حاصل نہیں ہوسکتا۔ غیر ارادی خیال ایک نفسی کیفیت ہے اور اسے دبانے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے نفس کو دباتا ہے جو کرہ ہوا کو دبانے سے بھی زیادہ مشکل ہے تاہم چونکہ انسان کے دل میں خدا کا جلوہ موجود ہے اس لئے وہ نفس کو بھی قابو میں لا کر رہتا ہے۔ یہ چیز مشکل ضرور ہے مگر یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ سب سے اعلیٰ مقصد ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ کوشش کرنا پڑتی ہے۔

مگر یہ بات مجھے ہندوستان آکر معلوم ہوئی کہ ایسا "برہمچاریہ" محض انسان کی کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسوقت تک میں اس دھوکے میں تھا کہ محض پھل کھانے کا التزام تمام نفسانی خواہشوں کے مٹا دینے کے لئے کافی ہے اور میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مجھے کسی اور تدبیر کی ضرورت نہیں۔

مگر مجھے اپنی روحانی کشمکش کی داستان وقت سے پہلے بیان نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ یہاں میں اتنا کہدینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے "برہمچاریہ" برتنا چاہتے ہیں۔ انہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے بشرطیکہ انہیں خدا پر عقیدہ اور اپنی سعی پر بھروسہ ہو

پرہیزگاروں کے نفس سے محسوس اشیا کا خیال دور ہوجاتا ہے مگر ان کی لذت کا اثر رہجاتا ہے جب خدائے برتر کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو یہ اثر بھی زائل ہوجاتا ہے۔ (بھگوت گیتا ۲-۵۹)

اس لئے "موکشا" کے طالبوں کے لئے آخری وسیلہ خدا کا نام اور اس کی توفیق ہے یہ حقیقت مجھ پر ہندوستان آنے کے بعد کھلی۔

نواں باب

سادہ زندگی

میں نے عیش و آرام کی زندگی شروع کی تھی مگر یہ صرف چند روز رہی۔ گو میں نے اپنے مکان کے آراستہ کرنے میں بہت اہتمام کیا تھا۔ مگر مجھے اس سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں میں نے مصارف میں کتر بیونت شروع کر دی۔ میرا دھوبی ایک تو دھلائی بہت لیتا تھا۔ دوسرے وقت پر کپڑے نہیں دیتا تھا اس لئے دو تین درجن قمیض اور کالر بھی میرے لئے کافی نہیں ہوتے تھے۔ کالر روز بدلنا پڑتا تھا اور قمیض روز نہیں تو ایک دن بیچ۔ اس سے بہت خرچ پڑ جاتا تھا جو میرے خیال میں بالکل فضول تھا۔ اس خرچ کو بچانے کے لئے میں نے کپڑے دھونے کا سامان خریدا اور اس مضمون پر کتاب خرید کر پڑھی۔ اس طرح میں نے کپڑے دھونا سیکھ لیا اور اپنی بیوی کو بھی سکھا دیا۔ اس سے میرا کام تو ضرور بڑھ گیا۔ مگر ایک نئی چیز تھی اس لئے لطف بھی آتا تھا۔

میں نے جو پہلا کالر اپنے ہاتھ سے دھویا تھا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں نے کالر میں پیچ ضرورت سے زیادہ تھوپ دی۔ استری کافی گرم نہیں کی اور جلنے کے خوف سے کالر کو اچھی طرح دبایا بھی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالر خاصا سخت تو ہو گیا۔ مگر اس میں سے پیچ ٹپکتی جاتی تھی۔ میں یہی کالر لگا کر عدالت میں گیا۔

میرے ہم چشم بیرسٹروں نے میرا مذاق اڑایا۔ مگر مجھے اس زمانے میں بھی اس کا

کوئی پروا نہ تھی کہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔

میں نے کہا "بھئی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ہاتھ سے کالر دھونے کا یہ پہلا موقع ہے اسی لئے پیچ بھری رہ گئی۔ مگر میرا اس میں کوئی ہرج نہیں اور پھر یہ فائدہ بھی ہے کہ آپ لوگوں کے لئے تفریح کا سامان ہوگیا۔"

ایک دوست نے پوچھا "آخر کیوں؟ کیا یہاں دھوبیوں کی کمی ہے؟"

میں نے جواب دیا "دھلائی بہت دینا پڑتی ہے۔ کالر کی دھلائی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی اس کی قیمت اور پھر ہمیشہ دھوبی کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اس سے میں بہت بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوؤں۔"

گر میں اپنے دوستوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی خوبی محسوس نہ کرا سکا۔ تھوڑے دن میں مجھے اتنی مہارت ہوگئی کہ اپنے کپڑے بڑی آسانی سے دھو لیتا تھا اور میرے دھوئے کپڑے دھوبی کے یہاں کے کپڑوں سے کسی طرح بُرے نہیں ہوتے تھے میرے کالر ویسے ہی سخت اور چمکدار ہوتے تھے جیسے دوسروں کے۔ جب گوکھلے جنوبی افریقہ آئے تو ان کے پاس ایک مفلر تھا۔ جو انھیں مہادیو گوبند رانا ڈے نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ وہ اس نشانی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے۔ جب جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا تو اس کے باندھنے کا موقع آیا۔ گر یہ مل دل گیا تھا۔ اور اس پر استری کی ضرورت تھی۔ اتنا وقت نہ تھا کہ دھوبی کے یہاں دھلوایا جائے۔ میں نے کہا لائیے میں اپنا ہنر آزماؤں۔

گوکھلے نے کہا "میں وکالت میں تمہاری قابلیت پر بھروسہ کر سکتا ہوں نر دھوبی کے کام میں نہیں۔ تم نے اسے خراب کر دیا تو پھر میں کیا کروں گا؟ تم جانتے ہو یہ مجھے کسقدر عزیز ہے؟"

یہ کہکر انھوں نے بڑے شوق سے اس تحفے کے ملنے کا قصہ سنایا۔ مگر میں نے اصرار کیا اور انھیں یقین دلایا کہ میں بہت عمدگی سے کام کروں گا۔ آخر اجازت مل گئی اور میں نے اسپر استری کر دی۔ جسے دیکھکر وہ میرے ہنر کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا اس سے انکار کرتی مجھے کوئی پروا نہ تھی۔

جس طرح میں نے دھوبی کی پابندی سے نجات پائی۔ اسی طرح نائی کا بھی محتاج نہیں رہا۔ وہ لوگ جو انگلستان جایا کرتے ہیں سب کے سب داڑھی مونڈنا سیکھ جاتے ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اپنے ہاتھ سے بال کاٹنا کوئی بھی نہیں سیکھتا۔ مجھے یہ بھی سیکھنا پڑا۔ ایک بار میں پریٹوریا میں ایک انگریز حجام کے یہاں گیا۔ اس نے حقارت کے انداز میں میرے بال کاٹنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی۔ مگر میں نے فوراً ایک بال کاٹنے کی مشین خرید لی اور آئینہ سامنے رکھکر اپنے بال کاٹنے لگا۔ سامنے کے بال کاٹنے میں تو مجھے کم و بیش کامیابی ہوئی۔ مگر گردن کے بال خراب ہو گئے۔ عدالت میں میرے دوست انھیں دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

"گاندھی" یہ تمہارے بالوں کو کیا ہوا۔ چوہے کتر لے گئے؟"

"نہیں گورے حجام نے میرے کالے بالوں کو ہاتھ لگانے میں اپنی ذلت سمجھی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ اپنے ہاتھوں سے کاٹوں گا۔ چاہے کیسے ہی خراب کیوں نہ کٹیں!"

اس جواب سے میرے دوستوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔

حجام نے جو میرے بال کاٹنے سے انکار کیا۔ اس میں اس کا قصور نہ تھا۔ اگر وہ کالے آدمیوں کا کام کرتا تو اس کے یورپی گاہک چھوٹ جاتے۔ ہم بھی تو اپنے بھائیوں کو اچھوتوں کا کام نہیں کرنے دیتے۔ مجھے اس سلوک کا بدلہ جنوبی افریقہ میں ایک

بار نہیں بیسیوں بار ملا۔ اور چونکہ میرا عقیدہ تھا کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔
اس لئے مجھے اس پر غصّہ نہیں آیا۔

میری سادگی اور اپنی مدد آپ کرنے کے اصول نے آگے چلکر جو انتہائی صورتیں اختیار کرلیں ان کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ ان کا بیج بہت دن پہلے بویا جا چکا تھا۔ اس کے جڑ پکڑنے اور پھولنے پھلنے کے لئے صرف پانی دینے کی ضرورت تھی۔ اور یہ آبیاری آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔

دسواں باب

جنگ بوئر

میں ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۹ء تک کے بہت سے واقعات کو چھوڑ کر صرف جنگ بوئر کا ذکر کرتا ہوں۔

اعلان جنگ کے وقت مجھے ذاتی طور پر بوئروں سے ہمدردی تھی۔ مگر ان دنوں میرا خیال تھا کہ ایسے معاملات میں مجھے یہ حق نہیں کہ دوسروں کو اپنی انفرادی رائے پر چلاؤں میں نے "جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ" میں اس اندرونی کشمکش کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اور یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں جن لوگوں کو اس کے معلوم کرنے کا شوق ہو وہ اس کتاب کو پڑھیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کے جذبے نے مجھے اس لڑائی میں انگریزوں کی طرف کھینچ لیا میں نے سوچا۔ اگر میں سلطنت برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے حقوق کا طالب ہوں تو میرا فرض ہو کہ اس سلطنت کی حفاظت میں شرکت کروں۔ میرا ان دنوں یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو کامل آزادی صرف سلطنت برطانیہ کی مدد سے اور اس کے ماتحت رہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے مجھے جتنے ساتھی مل سکے۔ سب کو جمع کر کے میں نے ایک ایمبولنس کور بنائی۔ اور حکومت نے اس کی خدمات قبول کر لیں۔

انگریزوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ ہندوستانی بزدل ہوتے ہیں، جوکھم سے گھبراتے ہیں۔ اور ان کی نظر اپنے فوری فائدے سے آگے نہیں جاتی اس لئے بہت سے انگریز دوستوں نے میری تجویز کی مخالفت کر کے میرے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔

مگر ڈاکٹر بوتھ نے دل و جان سے اس کی حمایت کی۔ انھوں نے ہماری ایمبولینس کور کو کام سکھایا۔ ہم نے اس کام کی اہلیت کے طبی تصدیق نامے حاصل کئے۔ مسٹر لاٹن اور مسٹر ایسکومب انجہانی نے بڑے جوش کے ساتھ ہماری تجویز کی تائید کی۔ اور خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ ہم میدان جنگ میں جانے کی درخواست کریں۔ حکومت نے ہمارا شکریہ ادا کیا لیکن یہ کہا کہ ابھی آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں مگر میں اس انکار سے ماننے والا نہ تھا۔ ڈاکٹر بوتھ کے ذریعے سے میں نٹال کے بشپ (اسقف) سے ملا۔ ہماری کور میں بہت سے عیسائی بھی تھے وہ میری تجویز سنکر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ہماری خدمات کے قبول کئے جانے میں مدد کریں گے۔

واقعات بھی ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ بوئروں نے توقع سے زیادہ جرأت، بہادری اور استقلال دکھایا۔ آخر ہماری خدمات قبول کرلی گئیں۔

ہماری کور میں کل گیارہ سو آدمی تھے جن میں چالیس افسر تھے۔ ان میں سے تین سو آزاد ہندوستانی تھے اور باقی سب پابند مزدور تھے۔ ڈاکٹر بوتھ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری کور نے اچھا خاصا کام کیا۔ ہمارا مقام محاذ جنگ کے پیچھے تھا اور صلیب احمر کی حفاظت میں تھے۔ مگر ایک بار ایک نازک موقع پر ہم سے میدان جنگ میں کام لیا گیا۔ ہم تو خود یہی چاہتے تھے۔ ابتدا میں جنگی افسر ہمیں گولہ باری کی زد میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے مگر اسپیون کاپ کی پسپائی کے بعد صورت حال بدل گئی۔ ہمارے پاس جنرل بلر کا پیام آیا کہ گو آپ لوگ اس پر مجبور نہیں کہ اپنی جان خطرے میں ڈالیں لیکن آپ زخمیوں کو میدان جنگ سے لے آیا کریں تو حکومت آپ کی بہت ممنون ہوگی۔ ہم نے بے تامل منظور کرلیا اس لیے اسپیون کاپ کے معرکے میں ہم خط جنگ پر موجود تھے۔ ان دنوں ہمیں زخمیوں کو ڈولی میں اٹھا کر بیس پچیس میل روز چلنا پڑتا تھا۔ منجملہ ان کے ہمیں جنرل ووڈگیٹ کے سے سپاہیوں کو اٹھانے کا فخر حاصل ہوا۔

چھ ہفتے کے کام کے بعد کور کے لوگ چھٹی پر بھیجدیے گئے۔ اسپیون کاپ اور
وال کرانز کی شکستوں کے بعد برطانوی سپہ سالار نے لیڈی اسمتھ وغیرہ کو دھاوا کر کے مدد
پہونچانے کا خیال ترک کر دیا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں تاکہ اس عرصے
میں انگلستان سے اور ہندوستان سے مدد پہونچ جاسے۔

اس موقعے پر حقیر خدمت کی بہت تعریف کی گئی۔ اور لوگوں کی نظر میں ہندوستانی
کی وقعت بڑھ گئی۔ اخباروں نے مدحیہ نظمیں شائع کیں۔ ترجیع بند لکھے گئے جنکے آخر میں
اس مضمون کا مصرعہ آتا تھا۔ "لاکھ کچھ ہو پھر ہم سلطنت کے فرزند ہیں"۔

جنرل بلر نے اپنی رپورٹ میں کور کے کام کی تعریف کی اور اس کے افسروں کو تمغہ
جنگ عنایت کیا۔

ہندوستانیوں میں تنظیم پہلے سے بہت بہتر ہو گئی مجھے پابند مزدوروں سے اچھی
طرح ملنے کا موقع ملا۔ ان میں زیادہ بیداری پیدا ہو گئی۔ اور ان کے دل میں اس
خیال نے جڑ پکڑلی کہ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ تاملی۔ گجراتی، سندھی سب بھارت ماتا
کے بیٹے ہیں۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ اب ہندوستانیوں کی شکایتیں رفع کر دیجائیں
گی۔ ان دنوں فرنگیوں کے طرز عمل میں نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ لڑائی کے زمانے
میں ہم سے اور فرنگیوں سے بہت اچھے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ہمیں ہزاروں گوروں
سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ہم سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔ اور ہمارے شکر گذار تھے
ہم ان کی خدمت کے لئے آئے ہیں

میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کروں جس کی یاد
بہت خوشگوار ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت کی انتہائی خوبی
آزمایش کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ ہم شیولی کیمپ جا رہے تھے۔ جہاں لارڈ رابرٹس
کے بیٹے لفٹنٹ رابرٹس نے کاری زخم کھا کر جان دی تھی۔ ہماری کور کو یہ فخر حاصل ہے

کہ ان کی لاش میدان جنگ سے اٹھا کر لائی - اس روز بڑی سخت گرمی تھی۔ ہر شخص پیاس سے بیتاب تھا۔ راہ میں ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جہاں ہم اپنی پیاس بجھا سکتے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ پہلے کون پانی پینے جائے۔ ہم چاہتے تھے کہ پہلے گورے پی لیں تب ہم جائیں۔ مگر انہیں یہ گوارا نہ تھا۔ اور وہ ہم سے اصرار کر رہے تھے۔ دیر تک یہ خوشگوار مقابلہ ہوتا رہا جس میں ہر فریق دوسرے کو آگے بڑھا کر خود پیچھے رہنا چاہتا تھا۔

گیارہواں باب

حفظان صحت کا اہتمام اور قحط کا امدادی کام

مجھے یہ بات ہمیشہ سے بُری معلوم ہوتی ہے کہ ہیئت اجتماعی کا کوئی رکن بیکار رہے مجھے یہ گوارا نہیں کہ اپنی قوم کی کمزوریوں پر پردہ ڈالوں یا ان سے چشم پوشی کروں۔ اگر میں ایک طرف اپنی قوم کے حقوق کے لئے لڑتا ہوں تو دوسری طرف اس کے عیوب کی اصلاح بھی کرتا ہوں۔ اس لئے جب کہ میں نے نٹال کی سکونت اختیار کی تھی میں ہندوستانیوں کے سر سے ایک الزام دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ان پر لگایا جاتا تھا۔ اور ایک حد تک بجا تھا۔ اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی پھوہڑ ہوتے ہیں اپنے مکان اور گرد و پیش کی زمین صاف نہیں رکھتے۔ قوم کے سرآوردہ افراد اپنے مکانوں کی صفائی کرنے لگے تھے۔ مگر مکانوں کا معائنہ صرف اس زمانے میں شروع ہوا جب ڈربن میں طاعون پھیلنے کا خوف تھا میونسپلٹی کے ممبروں نے اس کام کو پسند کیا۔ اور اس میں ہماری مدد کی کیونکہ وہ خود چاہتے تھے کہ ہم اُن سے اتحاد عمل کریں۔ اس اتحاد عمل کی بدولت انہیں بھی آسانی ہوئی اور ہماری دقتیں بھی کم ہو گئیں۔ کیونکہ جب کبھی وبا پھیلتی ہے تو انتظامی افسر عموماً بیصبری سے کام لیکر سختیاں شروع کر دیتے ہیں اور جن لوگوں سے خفا ہوتے ہیں ان سے تشدد کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ہماری قوم نے خود حفظان صحت کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے وہ اس تشدد سے محفوظ رہی۔

مگر مجھے بعض باتوں میں بڑی سخت مایوسی ہوئی میں نے دیکھا کہ جب میں اپنی قوم کے لئے حقوق کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ بڑی خوشی سے ساتھ دیتی ہے مگر جب اس

سے کہتا ہوں کہ اپنا فرض ادا کرے۔ تو اتنی مستعدی نہیں دکھاتی۔ کہیں لوگوں نے مجھے ذلیل کیا۔ اور کہیں اخلاق سے پیش آئے۔ لیکن میری بات پر کوئی توجہ نہیں کی۔ لوگ اتنی زحمت نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ اپنے محلوں کو صاف رکھیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ اس کام میں روپئے سے امداد دیں بالکل فضول تھا۔ ان تجربوں سے مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ لوگوں کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے لئے بیحد صبر کی ضرورت ہے۔ اصلاح کی فکر صرف اصلاح کرنے والوں کو ہوتی ہے۔ سماج کو نہیں ہوتی۔ اس سے تو سوائے مخالفت، نفرت، اور ایذا رسانی کے کوئی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔ اصلاح کرنیوالا جس چیز کو جان کے برابر عزیز رکھتا ہے۔ اُسے سماج تنزل سے تعبیر کرتی ہے۔ اور کیوں نہ کرے؟

تاہم اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو اس ضرورت کا احساس ہو گیا کہ اپنے مکان اور محلے صاف رکھنا چاہیئے۔ میری وقعت حکام کی نظر میں بڑھ گئی۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ اگر میں ایک طرف اپنے قوم کی شکایتوں کو ظاہر کرتا ہوں اور اس کے حقوق پر زور دیتا ہوں تو دوسری طرف اس کی اندرونی اصلاح میں بھی اتنی ہی سرگرمی سے کام لیتا ہوں۔

البتہ ایک کام ابھی باقی تھا وہ یہ کہ نوآباد ہندوستانیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ بھارت ماتا کی محبت اور خدمت اُن پر فرض ہے۔ ہندوستان غریب ملک ہے نوآباد ہندوستانی دولت کی تلاش میں جنوبی افریقہ آتے ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ اپنی کمائی کے ایک حصے سے اپنے ہموطنوں کی آڑے وقت میں مدد کریں۔ یہ فرض ان لوگوں نے اس قحط کے زمانے میں جو ۱۸۹۷ء سے ۱۸۹۹ء تک پڑا تھا، ادا کیا۔ انھوں نے ۱۸۹۷ء میں قحط کے امدادی کام میں بہت معقول چندہ دیا۔ اور ۱۸۹۹ء میں اس سے بھی زیادہ دیا۔ ہم نے انگریزوں سے بھی چندہ مانگا اور انھوں نے اچھی خاصی رقم دی۔

پابند مزدوروں تک نے چندہ میں شرکت کی۔ اور یہ طریقہ جو جنوبی افریقہ میں قحط کے زمانے میں شروع ہوا تھا اب تک جاری ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہماری قوم پر مصیبت پڑتی ہے تو جنوبی افریقہ کے ہندوستانی برابر معقول رقمیں چندے میں بھیجتے ہیں۔

اس طرح میں نے جنوبی افریقہ میں جو خدمت ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر قدم پر حق کے نئے نئے پہلو نظر آئے۔ حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے۔ اور اسے جتنا زیادہ سینچیے اتنا ہی زیادہ پھل دیتا ہے۔ حق کے معدن کو جتنا گہرا کھودیے۔ اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے ہیں۔

بارہواں باب

ہندوستان کو واپسی

جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی آفریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے وقت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں نہ صرف ہونے لگے۔

وطن میں میرے احباب میری واپسی پر مُصر تھے اور مجھے یہ خیال ہوا کہ میں ہندوستان کی زیادہ خدمت کر سکوں گا۔ جنوبی افریقہ کے کام کو سنبھالنے کے لئے خانصاحب اور مدنسکھ لال جی نظر موجود تھے۔ اس لئے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی۔ یہ درخواست بڑی مشکل سے منظور ہوئی اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر میری ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔ مجھے یہ شرط بڑی سخت معلوم ہوئی مگر اس محبت کی وجہ سے جو مجھے اپنے وطنی بھائیوں سے تھی میں نے اسے منظور کر لیا۔ میرا آبائی نے کہا ہے

"میرے مالک نے مجھے باندھ رکھا ہے محبت کے کچے دھاگے میں میں
اس کا غلام ہوں!!"

میرے لئے یہ بھی برادرانہ رشتہ محبت کا توڑنا ممکن نہ تھا۔ زبان خلق نقارۂ خدا کہلاتی ہے۔ میں اپنے دوستوں اور وطنی بھائیوں کے کہنے کو کیونکر ٹال سکتا تھا؟ میں نے یہ شرط قبول کر لی۔ اور مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔

میرے تعلقات اس زمانے میں صرف نٹال تک محدود تھے۔ نٹال کے ہندوستانیوں نے مجھ پر مہر و محبت کا مینہ برسا دیا۔ ہر جگہ رخصتی جلسوں کا انتظام کیا گیا اور مجھے قیمتی تحفے دیئے گئے۔

جب میں پہلی بار یہاں سے ہندوستان جا رہا تھا تب بھی مجھے تحفے دیئے گئے تھے۔ مگر اس مرتبہ رخصت میں بیحد جوش و خروش تھا۔ تحفوں میں سونے چاندی کی چیزوں کے علاوہ بعض جڑاؤ چیزیں بھی تھیں۔

مجھے ان تحفوں کے قبول کرنے کا کیا حق تھا؟ اگر میں انھیں قبول کر لیتا تو اپنے دل میں کیونکر سمجھتا کہ میں اپنے بھائیوں کی خدمت بلا معاوضہ کر رہا ہوں؟ سوائے چند تحفوں کے جو میرے موکلوں نے دیئے تھے، اور سب مجھے قومی خدمت کی وجہ سے دیئے گئے تھے۔ پھر میں اپنے موکلوں اور رفیقوں میں فرق بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے موکل بھی مجھے قومی کاموں میں مدد دیتے تھے۔

ایک سونے کا کنٹھا جس کی قیمت پچاس گنی تھی میری بیوی کو دیا گیا تھا لیکن یہ تحفہ بھی میری قومی خدمات کی وجہ سے ملا تھا۔ اس لیے اس میں دوسرے تحفوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جس شام کو یہ تحفے دیئے گئے تھے اس کے بعد کی رات مجھے جاگتے گذری میں الجھن اور پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سیکڑوں کی قیمت کے تحفوں کو پھیر دینا کچھ سہل نہ تھا مگر انھیں رکھ لینا میرے لیے اس سے بھی زیادہ دشوار تھا۔

میں نے سوچا کہ فرض کیجئے میں انھیں رکھ لوں تو میرے بچوں پر اور میری بیوی پر اس کا کتنا خراب اثر پڑے گا۔ انھیں میں یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اپنی زندگی قومی خدمت میں گذاریں۔ اور خدمت کو معاوضے سے بے نیاز سمجھیں۔

ہمارے گھر میں قیمتی زیور نہیں تھے۔ کیونکہ ہم روز بروز سادگی اختیار کرتے جاتے تھے۔ ہم سے سونے کی گھڑیاں باندھنا سونے کی زنجیریں اور انگوٹھیاں پہننا کیونکر نبھ سکتا تھا؟ انہیں دنوں میں لوگوں پر تاکید کر رہا تھا کہ زیوروں کی ہوس چھوڑیں پھر میں ان زیوروں کو کیسے لیتا؟

آخر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے بیٹھکر ایک خط کا مسودہ لکھا کہ میں ان چیزوں کو قومی کاموں کے لئے وقف کرتا ہوں اور پارسی رستم جی اور چند اور اشخاص کو وقف کا متولی مقرر کرتا ہوں۔ صبح کو میں نے اپنی بیوی بچوں سے مشورہ کیا اور خدا خدا کر کے اس بوجھ کو اپنے سر سے ہٹایا۔

مجھے یقین تھا کہ اپنی بیوی کو اس بات پر آمادہ کرنے میں مجھے کسیقدر دقت ہوگی۔ مگر بچے آسانی سے مان لیں گے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ بیوی کو سمجھانے میں بچوں کو اپنا وکیل بناؤں گا۔

بچے فوراً راضی ہوگئے۔ انھوں نے کہا "ہمیں ان قیمتی زیوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ یہ زیور اپنے وطنی بھائیوں کو لوٹا دیں۔ اگر ہمیں ضرورت ہوگی تو جب چاہیں گے دوسرے زیور خرید لیں گے۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا "تو پھر تم اپنی والدہ کو بھی سمجھا دو گے؟" انھوں نے کہا "کون سی بڑی بات ہے۔ یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجئے۔ وہ خود تو زیور پہنتی نہیں۔ اگر لیں گی تو ہمارے لئے ہی لیں گی۔ پھر جب ہمیں یہ منظور نہیں تو انہیں واپس کرنے میں کیا عذر ہوگا؟"

انھوں نے کہنے کو تو کہدیا۔ مگر جب کرنے کا وقت آیا تو مشکل پڑی۔

میری بیوی نے کہا "تمہارے بچے زیور نہیں چاہتے تو نہ چاہیں۔ انہیں تم

پھسلا کر جو چاہو کہلوا لو۔ مگر میری بہویں جو آئیں گی؟ ان کو زیور کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟ کیسکو کیا خبر کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ لوگوں نے جو تحفے اتنی محبت سے دیئے ہیں وہ لوٹا دوں۔"

بحث کا دریا امنڈ آیا۔ اور آخر میں آنسوؤں کا سیلاب آ گیا۔ مگر بچے اپنی بات پر اڑے رہے اور میں بھی نہ پسیجا۔"

میں نے نرمی سے کہا" بچوں کی شادی کا ابھی کیا ذکر ہے؟ ہمیں ان کا بیاہ کم سنی میں تو کرنا نہیں جب بڑے ہو جائیں گے تو آپ نپٹ لیں گے۔ اور پھر ہم ان کے لئے ایسی دلہنیں کیوں لانے لگے جنہیں زیور کا شوق ہو؟ اور فرض کرو زیور کی ضرورت بھی ہو تو میں تو موجود ہوں تم مجھ سے کہنا۔

" اور کیا! تمہیں سے تو کہوں گی میں نے تمہیں اتنے دن میں خوب دیکھ لیا۔ تم نے میرے پیچھے پڑ کر میرا سارا زیور لے لیا۔ بہوؤں کے لئے تم ضرور زیور خریدو گے! بچوں کو تو تم ابھی سے سادھو بنانے کی فکر میں ہو۔ نہیں صاحب میں یہ زیور واپس نہیں ہونے دوں گی۔ اور یہ تو کہو میرا کنٹھا واپس کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ میں نے کہا" آخر یہ کنٹھا تمہیں میری ہی خدمت کیوجہ سے ملا ہے۔"

"یہ سچ ہے، اگر وہ تمہاری خدمت ہوئی یا میری خدمت بات ایک ہی ہے۔ میں نے جو تمہارے کام کی خاطر دن رات مشقت اٹھائی وہ کسی گنتی ہی میں نہیں؟ تم نے دنیا بھر کے مردوے میرے گھر میں لا کر بھر دیئے مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ اور مجھے ان کی مرہم پٹی کرنا پڑی۔"

یہ باتیں میرے دل پر تیر کیطرح لگیں۔ مگر میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ زیور لوٹا کر رہوں گا۔ اپنی بیوی کو میں نے کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ جتنے تحفے ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۱ء تک ملے تھے، سب واپس کئے گئے۔ ایک وقف نامہ لکھا گیا اور یہ سب چیزیں ایک

بنک میں جمع کردی گئیں کہ میں خود یا وقف کے متولی انھیں جس طرح چاہیں قومی کاموں میں صرف کریں۔

اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے قومی کاموں کے لئے روپئے کی ضرورت ہوئی اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ وقف سے مدد لوں۔ مگر ہمیشہ مجھے یہ روپیہ چندوں سے مل گیا اور وقف کی رقم میں ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آئی۔ یہ وقف اب تک موجود ہے۔ ضرورت کے وقت اس سے روپیہ لیا جاتا ہے۔ اور اس کی آمدنی جمع ہوتے ہوتے ایک معقول رقم ہو گئی ہے۔

مجھے آج تک کبھی اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا۔ اور میری بیوی کو بھی رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ دانشمندی کا فعل تھا۔ اس نے ہمیں بہت سی ترغیبوں سے بچایا۔

میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ قومی کام کرنے والوں کو قیمتی تحفے قبول نہیں کرنا چاہئے۔

(※)

تیرھواں باب

پھر ہندوستان میں

غرض میں پھر ریس روانہ ہوگیا۔ جہاز کا ایک مقام مارشیس میں بھی تھا اور چونکہ
یہاں کئی دن ٹھہرنا تھا اس لئے میں شہر جاکر وہاں کی زندگی مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ ایک
رات میں اس نوآبادی کے گورنر سر رابرٹ برس کا مہمان رہا۔

ہندوستان پہونچکر میں کچھ دن تک سارے ملک کا دورہ کرتا رہا۔ ۱۹۰۱ء
میں کانگریس کلکتے میں ہورہی تھی اور اس کے صدر مسٹر ڈنشا واچا تھے (جواب سر
ڈنشا واچا کہلاتے ہیں) میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میرے لئے کانگریس کی شرکت کا
یہ پہلا موقع تھا۔

بمبئی سے میں اسی گاڑی میں سوار ہوا جس میں سر فیروز شاہ مہتا تھے کیونکہ
مجھے ان سے جنوبی افریقہ کے معاملات کے متعلق باتیں کرنا تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ
بڑی شان سے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے لئے ایک ڈبہ رزرو کرا لیا تھا۔ اور مجھے
حکم تھا کہ ایک خاص اسٹیشن سے کچھ دور تک ان کے ڈبے میں سفر کروں اور جب موقع
ملے گفتگو کرلوں۔ چنانچہ میں مقررہ اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے ساتھ
مسٹر واچا اور مسٹر چمن لال سیتلواد تھے۔ (جواب سر چمن لال کہلاتے ہیں۔) یہ تینوں
آپس میں سیاسی معاملات پر گفتگو کررہے تھے۔ سر فیروز شاہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا
بھئی گاندھی ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ جو رزولیوشن تم چاہتے ہو اسے ہم ضرور پاس
کرادیں گے۔ مگر ہمیں اپنے ہی ملک میں کون سے حقوق حاصل ہیں؟ میرے خیال میں

جب تک ہمیں اپنے ملک میں قوت نہ حاصل ہوجائے۔ تمہاری نوآبادیوں کی بھی ایسی ہی خراب حالت رہے گی جیسی ہماری ہے"۔

میں ہکابکا رہ گیا۔ مسٹر سیتلواد کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی تھی۔ مسٹر واچا نے میری طرف رحم اور قلق کی نظروں دیکھا۔

میں نے سر فیروز شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر بھلا میرا جیسا شخص بمبئی کے بے تاج کے بادشاہ سے کیا پیش پاتا۔ میں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ مجھے رزولیوشن پیش کرنے کی اجازت مل گئی۔

مسٹر واچا نے میری ہمت افزائی کے لئے کہا "بھئی رزولیوشن مجھے ضرور دکھالینا"۔

غرض ہم کلکتے پہونچ گئے۔ صدر کو مجلس استقبالیہ کے اراکین بڑی دھوم دھام سے کیمپ میں لے گئے۔ میں نے ایک رضا کار سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں۔ وہ مجھے رپن کالج لے گیا جہاں بہت سے ڈیلیگیٹ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری قسمت نے یاوری کی۔ لوکمانیہ بھی اسی حصے میں ٹھہرائے گئے جس میں میں تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ ایک دن بعد آئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جہاں لوکمانیہ ہوں وہاں ان کا دربار بھی ضرور رہوگا۔ اگر میں مصور ہوتا تو آج بھی ان کی تصویر اسی انداز میں کھینچ دیتا جس طرح میں نے انہیں بستر پر بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ منظر میری نظروں میں پھر رہا ہے۔ ان کے پاس بیشمار اشخاص ملنے کے لئے آئے تھے مگر مجھے ان میں سے صرف ایک صاحب یعنی امرت بازار پتر کا کے ایڈیٹر بابو موتی لال گھوش ہی ابتک یاد ہیں۔ ان لوگوں کا ہنسنا بولنا، قہقہے لگانا اور حاکم قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرنا مجھے کبھی نہ بھولے گا۔

مگر میں اس کیمپ کے انتظام کا ذکر کسیقدر تفصیل سے کروں گا۔ رضا کار آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آپ ایک شخص سے کسی کام کو کہئے۔ وہ دوسرے پر ٹالدیتا تھا

دوسرا تیسرے پر اور یہ سلسلہ یوں ہی آگے چلا جاتا تھا۔ رہے ڈیلیگیٹ سو وہ کسی شمار میں نہ تھے۔

میں نے چند رضاکاروں سے ملاقات پیدا کی۔ جب میں نے انھیں جنوبی افریقہ کے قصے سنائے تو انھیں کسیقدر شرم آئی۔ میں نے انہیں خدمت کا راز سمجھانا چاہا۔ وہ سمجھ تو گئے مگر خدمت کوئی خود رو درخت نہیں کہ ہر زمین پر اُگ آئے۔ اس کے لئے پہلی شرط خلوص نیت ہے اور دوسری تجربہ۔ ان نیک دل بھولے نوجوانوں میں خلوص کی کمی نہ تھی۔ مگر تجربہ انھیں ذرہ برابر نہ تھا۔ کانگرس سال میں تین دن اپنی بہار دکھا کر غفلت کی نیند سو جاتی تھی۔ یہ جو سال میں تین دن تماشا سا ہو کر رہجاتا تھا اس میں انھیں کیا تجربہ حاصل ہو سکتا تھا؟ اور ڈیلیگیٹوں کا بھی وہی حال تھا جو رضاکاروں کا۔ یہ بھی اس سے زیادہ یا اس سے بہتر تجربہ نہیں رکھتے۔ وہ خود کوئی کام نہیں کرنا چاہتے تھے بس بیٹھے رضاکاروں کو حکم دیا کرتے تھے "جاؤ یہ کام کر لاؤ، جاؤ وہ کام کر لاؤ"۔

یہاں بھی چھوت کا خاصا تجربہ ہوا۔ تامل لوگوں کا باورچیخانہ اور باورچیخانوں سے دور تھا۔ تامل ڈیلیگیٹ کھانا کھاتے وقت دوسرں کی جھلک بھی دیکھ لیں تو چھوت ہو جاتی تھی اس لئے ان کے واسطے کالج کے احاطے میں علیحدہ باورچیخانہ بنایا گیا اور اس کے آس پاس ٹٹیاں لگادی گئیں اس میں دھوئیں کا یہ عالم تھا کہ دم گھٹتا تھا۔ اسی بے دروازے صندوق میں کھانا پکتا تھا یہیں کھایا جاتا تھا۔ اور یہیں برتن دُھلتے تھے۔ مجھے تو یہ ورن دھرم کی مسخ کی ہوئی صورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنے جی میں کہا جب کانگرس کے ڈیلیگیٹوں کا یہ حال ہے تو جن لوگوں کی یہ نمایندگی کرتے ہیں ان کا حال تو اور بھی بدتر ہوگا۔ یہ خیال کر کے میں نے ایک آہ سرد کھینچی اور دم بخود ہو گیا۔

غلاظت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہر جگہ پانی گڑھوں میں جمع رہتا تھا۔ پاخانے بہت تھوڑے

ا۔ ہندو سماج کی چار تقسیمیں اور ان کے فرائض۔

تھے اور ان میں اس بلا کا تعفن تھا کہ اس کے خیال سے اب بھی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے رضا کاروں کو اسپر توجہ دلائی۔ انھوں نے صاف کہدیا "یہ ہمارا کام نہیں بھنگی کا کام ہے"۔ میں نے ایک شخص سے جھاڑو مانگی۔ وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہیں سے جھاڑو لاکر پاخانہ صاف کیا۔ مگر اس سے صرف میرا کام چلا۔ آدمی بہت تھے اور پاخانے تھوڑے اس لئے بار بار صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی اس لئے مجھے اسی پر قناعت کرنا پڑی کہ اپنی فکر کر لوں۔ اور دوسروں کو اس بدبو اور غلاظت کی کوئی پروا بھی نہ تھی۔

اس سے بھی بڑھکر سنئے۔ بعض ڈیلیگیٹ رات کو بے تامل اپنے کمروں کے آگے برآمدے میں رفع حاجت کرتے تھے۔ ایک روز صبح کو میں نے رضا کاروں کو یہ غلیظ دکھایا کوئی اسے صاف کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ اس لئے مجھے تنہا یہ عزت حاصل کرنا پڑی اب حالت بہتر ہو گئی ہے مگر اب بھی بعض ایسے ناسمجھ ڈیلیگیٹ ہیں جو کانگرس کیمپ کے اندر جہاں جی چاہتا ہے رفع حاجت کرکے کیمپ کو غلیظ کرتے ہیں اور بہت کم رضا کار اسے صاف کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔

یہ حالت دیکھکر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر کانگرس کے اجلاس میں کچھ روز کی توسیع کر دی جاتی تو وبا پھیلنے کا پورا پورا امکان ہو جاتا۔

چودھواں باب

محرر اور خدمتگار

ابھی کانگرس کا اجلاس شروع ہونے میں دو دن تھے۔ میں نے پہلے سے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ اپنی خدمات کانگرس کے دفتر کے لئے پیش کروں گا تاکہ کچھ تجربہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ کلکتے پہونچتے ہی ہاتھ منہ دھوکر سیدھا کانگریس کے دفتر میں پہنچا بابو بھوپندر ناتھ باسو اور گھوشال بابو سکریٹری تھے۔ میں نے بھوپندر بابو کے پاس جاکر اپنی خدمات پیش کیں۔ انھوں نے میری طرف دیکھکر فرمایا "میرے یہاں تو کوئی کام نہیں۔ گر ممکن ہے گھوشال بابو آپ کو کوئی کام دیں۔ مہربانی کرکے ان کے پاس جائیے۔"

میں ان کے پاس گیا انھوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور مسکراکر کہا "میں تمہیں صرف محرری کا کام دیسکتا ہوں، تم کروگے؟

میں نے جواب دیا "ضرور کروں گا۔ میں اسی لئے آیا ہوں کہ جو کام بھی ملے اسے انجام دوں بشرطیکہ وہ میری قابلیت سے بڑھکر نہ ہو۔"

انھوں نے کہا "شاباش نوجوانوں میں یہی خلوص ہونا چاہیئے۔" ان رضاکاروں کو مخاطب کرکے جو ان کے گرد کھڑے تھے کہنے لگے "سنتے ہو یہ نوجوان کیا کہہ رہے ہیں؟

پھر میری طرف مڑکر بولے "لو یہ ان خطوط کا انبار ہے جن کا جواب دینا ہے۔ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور کام شروع کردو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس سیکڑوں آدمی آتے ہیں اب میں ان سے باتیں کروں یا ان دخل در معقولات دینے والوں کو جواب دوں

جنھوں نے خطوں کے مارے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے؟ میرے پاس کوئی ایسے محرر نہیں جن کے سپرد یہ کام کرسکوں بہت سے خطوں میں کوئی کام کی بات نہیں مگر مہربانی کرکے ان پر ایک نظر ڈال لو۔ ان میں سے جو جواب کے قابل ہوں ان کا جواب دیدو۔ اور اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھ سے پوچھ لو۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انھوں نے مجھ پر اتنا اعتبار کیا۔

گھوشال بابو نے جب مجھے یہ کام دیا۔ اسوقت تک مجھ سے بالکل واقف نہیں تھے بہت دیر کے بعد انھوں نے مجھ سے میرا نام و نشان پوچھا۔

مجھے اس خطوط کے انبار کو پڑھنے اور اس کا جواب دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ذرا سی دیر میں میں نے یہ کام نپٹا دیا۔ گھوشال بابو بہت خوش ہوئے وہ بڑے باتونی آدمی تھے گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ جب انھیں میرے حالات معلوم ہوئے تو افسوس کرنے لگے کہ میں نے تمہیں محرری کا کام دیا۔ مگر میں نے انھیں یہ کہکر مطمئن کر دیا۔

"آپ کچھ تردد نہ کیجیے میری آپ کے آگے کیا حیثیت ہے؟ آپ کی عمر کانگرس کی خدمت میں گذری ہے اور آپ میرے بزرگ ہیں میں محض ایک ناتجربہ کار نوجوان ہوں۔ یہ کام میرے سپرد کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کیونکہ مجھے کانگرس کے کام کا شوق ہے اور آپ کی بدولت مجھے یہ نادر موقع ملا ہے کہ اس کام کی جزدیات کو سمجھ لوں۔"

گھوشال بابو نے کہا "شاباش" قومی کام کرنیوالوں کا یہی خیال ہونا چاہئے۔ مگر آج کل کے نوجوانوں کو اس کا احساس نہیں ہے بیشک میں کانگرس کو اسوقت سے جانتا ہوں جب سے یہ قائم ہوئی۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں یہ دعوٰی کرسکتا ہوں کہ اس کے قائم کرنے میں میں بھی مسٹر ہیوم کے ساتھ شریک تھا۔

اس طرح ہم دونوں میں خاصی دوستی ہوگئی۔ وہ بڑے اصرار سے مجھے دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

گھوشال بابو کی قمیض کے بٹن ان کا خدمت گار لگایا کرتا تھا۔ میں نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور مجھے اس میں بڑی خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہمیشہ سے بزرگوں کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا تو وہ اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے کام مجھ سے لینے لگے۔ جب میں ان کی قمیض کے بٹن لگاتا تھا تو وہ کہتے جاتے تھے: "دیکھتے ہو، کانگریس کے سکریٹری کو اپنی قمیص میں بٹن لگانے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام رہتا ہے" گھوشال بابو کے بھولے پن پر مجھے ہنسی آتی ہے لیکن اس سے میرے خدمت کے شوق میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ان کی خدمت سے مجھے اتنا فائدہ پہنچا جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح واقف ہوگیا۔ مجھے اکثر لیڈروں سے ملنے اور گوکھلے اور سریندرناتھ جیسے شیر مردوں کے طرز عمل کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اس بات پر بھی غور کیا کہ یہاں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور یہ دیکھکر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ہمارا سارا کاروبار انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ قوت عمل کو کفایت کے ساتھ صرف کرنے کا کسی کو خیال تک نہ تھا۔ کہیں ایک شخص کا کام کئی آدمی کرتے تھے۔ اور کہیں ضروری کام اس لئے رہجاتے تھے کہ کوئی کرنیوالا نہ تھا۔

گو میں ان چیزوں کو تنقیدی نظر سے دیکھتا تھا۔ مگر میری طبیعت میں اتنی رواداری تھی کہ میں سمجھتا تھا شاید موجودہ حالت میں اس سے بہتر کام نہیں ہوسکتا۔ اور اسی وجہ سے میں نے کسی کام کی بیقدری نہیں کی۔

پندرہواں باب

کانگریس میں

خدا خدا کرکے میں کانگرس پہنچا۔ اس دل بادل خیمے کو، رضا کاروں کی شاندار صفوں کو، اور ڈائس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھکر میری آنکھیں کھل گئیں میں دل میں کہتا تھا کہ اس عظیم الشان اجتماع میں مجھے کون پوچھیگا۔

خطبۂ صدارت ایک مستقل کتاب تھی۔ اسے اول سے آخر تک پڑھنا بالکل ناممکن تھا۔ اس لئے صرف اس کے چند حصے پڑھے گئے۔

اس کے بعد سبجکٹس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہوا۔ گوکھلے مجھے کمیٹی کے جلسوں میں لیجایا کرتے تھے۔

سر فیروز شاہ نے میرے رزولیوشن کو پیش کرانے کا وعدہ کرلیا تھا مگر میں اس فکر میں تھا کہ دیکھوں یہ سبجکٹس کمیٹی میں کب پیش ہوتا ہے اور کون پیش کرتا ہے کیونکہ ہر رزولیوشن کے ساتھ طویل طویل تقریریں ہوتی تھیں اور وہ بھی انگریزی میں اور ہر رزولیوشن کی تائید کوئی مشہور لیڈر کرتا تھا۔ اس نقار خانے میں بھلا میری طوطی جیسی آواز کو کون سنتا۔ جب میں نے دیکھا کہ رات ہونے آئی اور وہ رزولیوشن اب تک نہیں پیش ہوا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آخری رزولیوشن بہت جلدی جلدی نپٹائے جارہے تھے۔ اب گیارہ بج چکے تھے۔ میں گوکھلے سے ملکر ان کو اپنا رزولیوشن دکھا چکا تھا۔ اس لئے میں نے ان کی کرسی کے پاس جاکر ان کے کان میں کہا "مہربانی کرکے میرے معاملے میں کچھ کیجیے"۔ انھوں نے کہا "میں تمہارے رزولیوشن کو بھولا نہیں ہوں۔ تم دیکھتے

ہو کتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ دم لینے کی فرصت نہیں۔ مگر میں اس کا خیال رکھوں گا کہ تمہارا رزولیوشن نظرانداز نہ ہونے پائے۔"

اتنے میں سر فیروز شاہ مہتا نے کہا "اب تو سب رزولیوشن ہو گئے۔"

گوکھلے چلا اٹھے۔ "نہیں نہیں، ابھی جنوبی افریقہ والا رزولیوشن باقی ہے۔ مسٹر گاندھی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

سر فیروز شاہ نے پوچھا۔ "آپ نے وہ رزولیوشن دیکھا ہے؟"

"جی ہاں، دیکھا ہے۔"

"آپ کو پسند ہے؟"

"ہاں اچھا خاصا ہے۔"

"اچھا گاندھی، اپنا رزولیوشن پڑھ کر سناؤ۔"

میں نے کانپتے ہوئے وہ رزولیوشن پڑھا۔

گوکھلے نے اس کی تائید کی۔

سب چلا اٹھے۔ "بالاتفاق منظور۔"

مسٹر واچا نے کہا۔ "گاندھی تمہیں اس پر تقریر کرنے کے لئے پانچ منٹ ملیں گے۔"

مجھے اس کارروائی سے بالکل خوشی نہیں ہوئی۔ کسی شخص نے رزولیوشن کو سمجھنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ ہر شخص کو جانے کی بہت جلدی تھی۔ اور چونکہ گوکھلے اس رزولیوشن کو دیکھ چکے تھے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں خیال کیا گیا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں یا سمجھیں۔

صبح اٹھ کر میں اپنی تقریر کی فکر میں الجھ گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ پانچ منٹ میں کیا کہہ سکوں گا۔ میں نے اچھی طرح تیاری کر لی تھی۔ مگر اس وقت مناسب الفاظ ذہن میں نہیں آتے تھے۔ میں یہ طے کر چکا تھا کہ اپنی اسپیچ پہلے سے نہیں لکھوں گا۔ بلکہ وقت کے

وقت تقریر کروں گا۔جنوبی افریقہ میں روانی سے تقریر کرنے کی مشق ہو گئی
اسوقت کام آئی۔

جیسے ہی میرے رزولیوشن کا وقت آیا مسٹر واچا نے میرا نام لیکر
ہو گیا میرے سر میں چکر آرہے تھے۔ کسی شخص نے ایک نظم چھپوا کر ڈ
میں تقسیم کی تھی جس میں غیر ملکوں میں جا کر رہنے کی تعریف کی
میں نے یہ نظم پڑھی اور اسی سلسلے میں ان مصیبتوں کا ذکر کرنے لگا جو نوآباد
کو جنوبی افریقہ میں اٹھانا پڑتی ہیں عین اسوقت مسٹر واچا نے گھنٹی بجا ئی
کہ ابھی پانچ منٹ نہیں ہوئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس گھنٹی سے یہ اطلاع
ہے کہ دو منٹ میں تقریر ختم کر دو۔ میں نے دوسروں کو تیس تیس بلکہ پینتالیس
منٹ تقریر کرتے سنا تھا۔ اور ان کے لئے کبھی گھنٹی نہیں بجائی گئی تھی مجھے
ناگوار ہوا اور میں گھنٹی بجتے ہی بیٹھ گیا۔ مگر میرا طفلانہ خیال تھا کہ یہ نظم سر فیروز
کی بے توجہی کا کافی جواب ہے۔ رزولیوشن کے پاس ہونے میں تو کوئی شک
ان دنوں وزیٹروں اور ڈیلیگیٹوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر شخص
تھا۔ اور سب رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوتے تھے۔ میرے رزولیوشن کا بھی
ہوا۔ اس لئے میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ مگر میرے لئے یہی
کی بات نہ تھی کہ اسے کانگرس نے پاس کر دیا۔ اور مجھ پر کیا موقوف ہے جس شخص
کو کانگرس کی تائید گویا سارے ملک کی تائید ہے وہی اس بات پر خوش ہوتا۔

سولہواں باب

لارڈ کرزن کا دربار

کانگرس ختم ہوگئی۔ مگر مجھے جنوبی افریقہ کے کام کے سلسلے میں ایوانِ تجارت کے ممبروں اور کچھ اور لوگوں سے ملنا تھا۔ اس لئے میں کلکتے میں ایک مہینہ اور ٹھہر گیا۔ اس بار میں نے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند نہیں کیا بلکہ بعض دوستوں نے انڈیا کلب کے منتظموں سے میرا تعارف کرا دیا اور مجھے وہاں ایک کمرا مل گیا۔ اس کے ممبر بعض ممتاز ہندوستانی تھے اور میں یہ چاہتا تھا کہ ان لوگوں سے ملکر انھیں جنوبی افریقہ کے معاملات کیطرف توجہ دلاؤں۔ گوکھلے اکثر اس کلب میں انٹا کھیلنے جایا کرتے تھے۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں ابھی کچھ دن کلکتے میں رہوں گا تو انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میرے ساتھ آکر ٹھہرو۔ میں نے اس دعوت کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا مگر مجھے بے انکے دوبارہ بلائے وہاں جانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ انھوں نے دو ایک دن انتظار کیا۔ اس کے بعد خود آکر مجھے لے گئے۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ میری طبیعت دیر آشنا ہے۔ اور انھوں نے مجھ سے کہا "گاندھی! تمہیں اس ملک میں رہنا ہے ایسی دیر آشنائی سے کام نہیں چلے گا تمہیں تو چاہئے کہ جتنے زیادہ لوگوں سے ممکن ہو میل جول پیدا کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کانگرس کا کام کرو"۔

گوکھلے کی صحبت کا ذکر کرنے سے پہلے میں انڈیا کلب کا ایک واقعہ بیان کرونگا اس زمانے میں لارڈ کرزن نے دربار منعقد کیا۔ بعض راجہ مہاراجہ جو دربار میں بلائے گئے تھے کلب کے ممبر تھے۔ کلب میں میں نے انھیں ہمیشہ نفیس بنگالی دھوتی باندھے قمیض

پہنے اور گلے میں چادر ڈالے دیکھا تھا۔ دربار کے دن کیا دیکھتا ہوں کہ دھوتی کی جگہ پتلون ہیں جیسے خانساماں پہنتے ہیں، اور پیر میں چمکدار بوٹ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی۔ اور میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا کہ آپ نے اپنی وضع کیوں تبدیل کی۔

انھوں نے جواب دیا "ہم جس شامت میں مبتلا ہیں اسے ہمیں جانتے ہیں کسی کو کیا خبر کہ ہمیں دولت اور خطاب کی خاطر کیا کیا ذلتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔"

میں نے پوچھا "مگر یہ خانساماؤں جیسی پگڑی باندھنے اور یہ چمکدار بوٹ پہننے کا کیا سبب ہے؟"

انھوں نے کہا ہم میں اور خانساماؤں میں فرق ہی کیا ہے۔ وہ ہمارے "خانساماں" ہیں۔ اور ہم لارڈ کرزن کے "خانساماں" ہیں۔ اگر میں دربار نہ جاؤں تو آفت آ جائے۔ اگر اپنے معمولی کپڑے پہنکر جاؤں تو مجرم ٹھرایا جاؤں۔ اور کیا آپ کے خیال میں وہاں مجھے لارڈ کرزن سے گفتگو کرنے کا موقع ملے گا۔" اجی توبہ کیجیے۔

مجھے ان صاحب کے دوست پر بڑا رحم آیا۔

اسی سلسلے میں مجھے ایک اور دربار یاد آگیا۔

جب لارڈ ہارڈنگ نے ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تو ایک دربار منعقد کیا گیا اور ظاہر ہے کہ وہاں راجہ مہاراجہ ہی بلائے گئے تھے۔ مگر پنڈت مالوی جی نے مجھے بھی بڑے اصرار سے دعوت دی چنانچہ میں بھی گیا۔

مجھے یہ دیکھکر سخت افسوس ہوا کہ سب مہاراجہ عورتوں کی طرح بن ٹھن کر آئے ہیں۔ یہ لوگ ریشمی پاجامے اور ریشمی اچکنیں پہنے تھے ان کے گلے میں موتیوں کے مالے تھے۔ ہاتھوں میں کنگن تھے۔ پگڑیوں میں زرتار طرّے اور کمر میں تلواریں جن کے قبضے سونے کے تھے۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ نت نیا ار، ان کی بادشاہی کی نہیں ان کی غلامی کی ہیں۔ ہیں

سمجھتا تھا کہ انھوں نے یہ نامردی کے طوق اپنی خوشی سے گلے میں ڈالے ہوں گے۔ مگر معلوم ہوا کہ راجاؤں کے لئے لازمی ہی کہ ایسے موقعوں پر اپنے سارے زیور اور ہیرے موتی لاد کر آئیں میں نے یہ بھی سنا کہ ان میں سے بعض ان چیزوں کے پہننے کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔ اور سوائے دربار وغیرہ کے کبھی نہیں پہنتے

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہی۔ مگر چاہے وہ اور موقعوں پر یہ چیزیں پہنتے ہوں یا نہ پہنتے ہوں یہی کیا کم قابل افسوس ہی کہ انھیں وائسرائے کے دربار میں ایسے زیور پہنکر آنا پڑے جو صرف بعض مخصوص عورتیں پہنتی ہیں۔

دولت، قوت اور عزت کی خاطر انسان کو کن کن ذلتوں اور گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

سترہواں باب

ایک مہینہ گوکھلے کی صحبت میں[1]

میں گوکھلے کے یہاں جاکر رہا تو وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ میں پہلے ہی دن سے بے تکلف ہوگیا وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے میری ضروریات معلوم کرکے ایک ایک کی فراہمی کا اہتمام کرتے تھے۔ اتنا اچھا تھا کہ میری ضروریات بہت کم تھیں اور چونکہ میں نے اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ڈالی تھی اس لئے مجھے نوکر کی حاجت بھی بہت کم ہوتی تھی۔ ان پر اس بات کا کہ میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں، اور میری صفائی، باضابطگی اور استقلال کا بڑا اثر ہوا۔ اور وہ اکثر میری تعریفیں کرکے مجھے شرمندہ کر دیتے تھے۔

وہ مجھ سے کوئی بات نہ چھپاتے تھے۔ مجھے ان سب بڑے آدمیوں سے جو انکے پاس آیا کرتے تھے، ملاتے تھے۔ ان لوگوں میں سے ڈاکٹر پی سی رائے (جو اب سر پی سی رائے کہلاتے ہیں) کی تصویر میرے حافظہ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ بہت قریب رہتے تھے اور اکثر آیا جایا کرتے تھے۔

انھوں نے ڈاکٹر رائے کو مجھ سے یہ کہکر ملایا۔ "یہ پروفیسر رائے ہیں جو آٹھ سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں سے صرف چالیس روپئے خود لیتے ہیں اور باقی سب قومی کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔ شادی انھوں نے نہ کی ہے نہ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر رائے کو اسوقت بھی قریب قریب ویسا ہی دیکھا تھا جیسا اب دیکھتا ہوں۔ ان کے لباس میں وہی سادگی تھی جو اب ہے۔ فقط اتنا فرق ہوا ہے کہ اس زمانہ

میں ہندوستانی لوگوں کا کپڑا پہنتے تھے۔ اور اب کھادی پہنتے ہیں۔ گوکھلے اور ڈاکٹر رانڈے کی گفتگو سننے سے میرا جی کبھی نہیں بھرتا تھا کیونکہ یہ گفتگو قومی مفاد کے متعلق ہوتی تھی یا دوسری حیثیتوں سے تعلیمی اہمیت رکھتی تھی۔ کبھی کبھی ان دونوں کی باتیں سنکر تکلیف بھی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ قومی لیڈروں پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ جنھیں میں شیر سمجھتا تھا اب بھیڑ نظر آنے لگے۔

گوکھلے کو کام کرتے دیکھکر خوشی بھی ہوتی تھی اور تعلیمی فائدہ بھی پہنچتا تھا وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان کے ذاتی تعلقات اور ان کی دوستی بھی قومی مقاصد کے لیے ہوتی تھی۔ ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ ملک کی بھلائی ہوتی تھی اور اس میں بناوٹ یا بناوٹ کا نام بھی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہندوستان کی غلامی اور افلاس کے رنج میں گھلا کرتے تھے۔ اس کے سوا انھیں کوئی فکر نہ تھی۔ مختلف لوگ انھیں مختلف کاموں میں کھینچنا چاہتے تھے۔ مگر وہ سب کو یہی جواب دیتے تھے "یہ آپ خود ہی کیجئے۔ مجھے میرا کام کرنے دیجئے۔ مجھے تو ملک کو آزاد کرانے کی دھن ہے۔ آزادی مل جائے تو پھر اور کاموں کی طرف توجہ کرنے کا وقت آئے گا۔ یہی کام اتنا بڑا ہے کہ میرا سارا وقت اور ساری قوت اس میں کھپ جاتی ہے۔"

انھیں رانا ڈے سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار ہر لحظہ ان کے قول اور عمل سے ہوتا تھا۔ میری ان کی یکجائی کے زمانے میں ایک بار رانا ڈے کی ولادت کا یا شاید وفات کا دن آیا۔ گوکھلے ان دونوں دنوں کی یادگار مناتے تھے۔ اس روز ان کے ساتھ میرے علاوہ پروفیسر کتھواٹے اور ایک سب جج بھی تھے۔ انھوں نے ہملوگوں کو بھی اس رسم میں شریک کیا۔ اور ایک تقریر کی جس میں رانا ڈے کے بہت سے قصے سنائے دوران تقریر میں وہ ضمناً رانا ڈے، تیلانگ اور منڈلک میں باہم مقابلہ کرنے لگے انھوں

MIIIS

نے کہا کہ تیلانگ کا دلکش اسلوب بیان اور منڈلک کا صناحی جوش بہت قابل تعریف ہے۔ منڈلک کو اپنے موکلوں کا اسقدر خیال رہتا تھا کہ ایک بار انھیں ایک مقدمے میں باہر جانا تھا اور گاڑی چھوٹ گئی تو انھوں نے ایک اسپیشل ٹرین کرائے پر لی۔ تاکہ عدالت میں وقت پر پہنچیں اور ان کے موکل کا ہرج نہ ہو۔ مگر راناڈے ان سب سے بڑے ہوئے تھے ان کا ذہن ہمہ گیر تھا وہ صرف ایک قابل جج ہی نہیں تھے بلکہ مورخ ماہر اقتصادیات اور مصلح کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ باوجود جج ہونے کے وہ کانگرس میں شریک ہوتے تھے۔ اور سب لوگوں کو ان کی دانشمندی پر اس قدر بھروسا تھا کہ ان کے فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔ گوکھلے ان ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے جو ان کے گرو کی ذات میں جمع تھیں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

اس زمانے میں گوکھلے کے پاس ایک گھوڑا گاڑی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ بعض وجوہ سے وہ گھوڑا گاڑی رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے میں نے ان سے شکایت کے طور پر کہا "آپ ٹرام میں کیوں نہیں جایا کرتے؟ کیا یہ لیڈری کی شان کے خلاف ہے؟"

انھیں اس سے کسی قدر تکلیف ہوئی اور انھوں نے کہا "تمہیں بھی میری نیت کا اندازہ نہیں ہو سکا! مجھے کونسل سے جو الاؤنس ملتا ہے اسے میں اپنی ذاتی آسائش پر نہیں صرف کرتا۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ تم آزادی سے ٹرام میں بیٹھ سکتے ہو۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ جب تم میری طرح شہرت کی بلا میں گرفتار ہو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ٹرام میں آنا جانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ تم نے خواہ مخواہ یہ کیوں سمجھ لیا کہ لیڈر جو کچھ کرتے ہیں اپنے آرام کے لئے کرتے ہیں۔ مجھے تمہاری سادگی بہت پسند ہے۔ میں اپنے امکان بھر سادگی سے رہتا ہوں مگر میرے جیسے شخص کے لئے کچھ نہ کچھ مصارف ضروری ہیں۔"

اس معاملے میں انھوں نے میرا پورا اطمینان کر دیا۔ مگر مجھے ایک اور شکایت تھی جس کا وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔

"لیکن آپ ٹہلنے بھی تو نہیں جاتے۔ اسی وجہ سے آپ کی صحت خراب رہتی ہے کیا قومی کام میں یہ بھی شرط ہے کہ ورزش کا وقت نہ ملے"؟

انھوں نے کہا "تم دیکھتے ہو مجھے کبھی اتنی فرصت ملتی ہے کہ ٹہلنے جاؤں؟

میرے دل میں گوکھلے کا احترام اسقدر تھا کہ میں کبھی ان سے بحث نہیں کرتا تھا اگرچہ اس جواب سے میرا اطمینان نہیں ہوا۔ مگر میں چپ ہو رہا۔ میرا اسوقت بھی یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ خواہ انسان کو کتنا ہی کام کرنا ہو اسے ورزش کے لیے بھی اسیطرح وقت نکالنا چاہیے جیسے کھانے کے لیے نکالتا ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ اس سے مجموعی کام کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

اٹھارہواں باب

ایک مہینہ گوکھلے کی صحبت میں (۲)

گوکھلے کے ساتھ قیام کے زمانے میں میں گھر پر بہت کم رہتا تھا۔

میں نے جنوبی افریقہ میں اپنے عیسائی دوستوں سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان کے عیسائی بھائیوں سے ملوں گا اور ان کی حالت کو مشاہدہ کروں گا۔ میں نے بابو کالیچرن بنرجی کا نام سنا تھا اور ان کا بہت احترام کرتا تھا وہ کانگرس میں بہت پیش پیش تھے۔ اور مجھے ان کی طرف سے وہ شکوک نہ تھے جو عام عیسائیوں کی طرف سے۔ ان کے کانگرس میں شریک نہ ہونے اور ہندو مسلمانوں سے الگ رہنے کی وجہ سے تھے۔ جب میں نے گوکھلے کے سامنے ان سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے کہا "ان سے مل کر کیا کروگے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ مگر مجھے یہ اندیشہ ہو کہ تم ان سے مطمئن نہ ہوگے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں پھر بھی تمہارا جی ان سے ملنے کو چاہتا ہے تو ضرور ملو۔"

میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جسے انھوں نے فوراً منظور کرلیا جب میں ان کے یہاں گیا تو دیکھا کہ ان کی بیوی بستر مرگ پر ہیں۔ ان کا گھربار بالکل سیدھا سادہ تھا۔ کانگرس میں میں نے انھیں کوٹ پتلون پہنے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ وہ قمیص پہنے ہیں اور بنگالی دھوتی باندھے گو میں خود اس زمانے میں کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ مگر مجھے ان کی یہ سادگی بہت پسند ہوئی۔ میں نے بغیر کسی تمہید کے اپنی مشکلات ان کے سامنے بیان کردیں۔ انھوں نے پوچھا۔

"آپ گناہ آدم کے مسئلے کو مانتے ہیں یا نہیں۔"

"میں نے کہا" میں مانتا ہوں۔"

وہ کہنے لگے "بس تو پھر معاملہ صاف ہے۔ ہندو دھرم میں اس گناہ کے عذاب سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ عیسائیت میں موجود ہے۔ گناہ کی جزا ہلاکت ہے اور انجیل کہتی ہے کہ نجات کی صرف ایک صورت ہے۔ مسیح پر ایمان لانا۔"

میں نے بھگوت گیتا کی "بھکتی مرگ" کا ذکر کیا۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی میں نے ان کی عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ وہ میرا اطمینان نہیں کر سکے مگر ان کی گفتگو سے مجھے کچھ فائدہ ضرور پہنچا۔

ان دنوں میں کلکتے کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اکثر مقامات پر پیدل جایا کرتا تھا۔ میں جسٹس متر اور گرو داس بنرجی سے ملا جن سے میں جنوبی افریقہ کے کام میں مدد لینا چاہتا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے راجہ سر پیارے موہن مکرجی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

کالی چرن بنرجی نے مجھ سے کالی مندر کا ذکر کیا تھا اور مجھے پہلے سے بھی اس کے دیکھنے کا شوق تھا کیونکہ میں نے کتابوں میں اس کا ذکر بہت پڑھا تھا چنانچہ ایک دن میں اس مندر میں پہونچا جسٹس متر کا گھر بھی اسی محلے میں تھا۔ اس لئے جس دن میں ان سے ملنے گیا اسی دن مندر چلا گیا۔ راہ میں بھیڑوں کا گلہ نظر آیا جو کالی پر بلیدان کیجانے والی تھیں۔ مندر کی گلی میں فقیروں کی قطار تھی جن میں سادھو بھی تھے میں ان دنوں بھی ہٹے کٹے فقیروں کو بھیک دینے کا مخالف تھا۔ ان کا ایک غول میرے پیچھے لگ گیا۔ اسی شکل کا ایک شخص ایک غلام گردش میں بیٹھا نظر آیا۔ اس نے مجھے روک کر کہا

ؒ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی بنیاد حضرت آدم کے گناہ سے پڑی۔ اس لئے بنی آدم اس کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس کا کفارہ مسیح کی شہادت ہے۔

"بچہ کہاں جاتا ہے" میں نے کہا مندر دیکھنے جاتا ہوں۔

اس نے مجھ سے اور میرے ساتھی سے بیٹھنے کو کہا۔ چنانچہ ہم دونوں بیٹھ گئے میں نے اس سے پوچھا: "آپ اس بلدان کو دھرم کے مطابق سمجھتے ہیں؟"

"کون شخص جانوروں کی جان لینے کو دھرم سمجھے گا؟"

"پھر آپ اس کے خلاف اپدیش کیوں نہیں دیتے؟"

"یہ ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام بھگتی کرنا ہے۔"

"مگر آپ کو بھگتی کرنے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں ملتی؟"

"ہمارے لئے ہر جگہ یکساں ہے۔ دنیا کے لوگ بھیڑ کے گلے کی طرح ہیں۔ جدھر ان کے اگوا لے جائیں چلے جاتے ہیں ہم سادھوؤں کو اس سے کیا؟"

ہم نے زیادہ بحث نہیں کی۔ بلکہ آگے بڑھ گئے۔ مندر کے قریب خون کے نالوں نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھ سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا مجھے بڑی جھلاہٹ اور بے چینی تھی۔ وہ منظر آج تک میرے دل سے محو نہیں ہو سکا ہے۔

اسی رات کو مجھے چند بنگالی دوستوں کی طرف سے کھانے کی دعوت دی گئی وہاں میں نے ایک دوست سے اس وحشیانہ طریقہ عبادت کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا۔ "بھیڑوں کو کچھ محسوس تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ شور و غل سے اور ڈھولک کی آواز سے الم کا حس جاتا رہتا ہے۔"

مجھے یہ بات یقین نہیں آئی۔ اور میں نے ان سے کہا اگر بھیڑ کے زبان ہوتی تو وہ کچھ اور ہی داستان سناتیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس ظالمانہ رسم کو موقوف کرنا ضروری ہے مجھے گوتم بدھ کا قصہ یاد آ گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔

میری آج بھی وہی رائے ہے جو اس زمانے میں تھی۔ میرے نزدیک ایک بھیڑ کی زندگی انسان کی زندگی سے کم قیمتی نہیں ہے۔ مجھے [illegible]

ایک مہینے کی جان لی جائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں ... در ہو اتنا ہی وہ اس کا
مستحق ہے کہ انسان کے ظلم سے بچایا جائے ... خدمت کا اہل نہیں وہ
اس کی حفاظت نہیں کر سکتا میں ابھی ... بانی کروں تب جا کر یہ امید کی
جا سکتی ہے کہ میں ان مہینوں کو اس ناپاک بلدان سے بچا ... گا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس تزکیۂ
نفس اور قربانی کی آرزو میں گھل گھل کر مر جاؤں گا۔ میں ... خدا سے دعا مانگتا ہوں۔ کہ
دنیا میں کوئی نفس قدسی خواہ وہ مرد ہو یا عورت ایسا ... جس کا دل ابدی رحم سے
معمور ہو۔ جو ہمیں اس شرمناک گناہ سے نجات دے، بچا... معصوم جانوروں کی جان
بچائے۔ اور مندر کو اس آلودگی سے پاک کر دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنگال والے
باوجود اس علم، ذہانت، قربانی اور رحم دلی کے اس خونریزی کو کیونکر برداشت کرتے ہیں

انیسواں باب

ایک مہینہ گوکھلے کی صحبت میں (۳)

اس خوفناک بھینٹ کو دیکھ کر جو دھرم کے نام سے کالی پر چڑھائی جاتی ہے مجھے اور بھی شوق پیدا ہوا کہ بنگالیوں کی زندگی کا مشاہدہ کروں میں نے برہمو سماج کے متعلق بہت کچھ سنا پڑھا تھا۔ میں پرتاب چندر موزمدار کی زندگی کے حالات سے واقف تھا۔ بعض جلسوں میں ان کی تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہوا تھا میں نے ان کی کیشب چندر سین کی سوانحعمری بہم پہنچائی۔ اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا۔ اسے پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ سدھرن برہمو سماج اور ادی برہمو سماج میں کیا فرق ہے۔ میں پنڈت شیوناتھ شاستری سے ملا۔ اور پروفیسر کتھوٹے کے ساتھ مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور کی زیارت کے لئے گیا۔ لیکن وہ اس زمانے میں کسی سے نہیں ملتے تھے اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر ان کے گھر برہمو سماج کا ایک جلسہ ہوا جس میں ہم دونوں بلائے گئے۔ یہاں بہترین بنگالی گانا سننے میں آیا۔ اس دن سے مجھے بنگالی گانے کا بڑا شوق ہو گیا ہے۔

برہمو سماج کے دیکھنے کے بعد سوامی ویویکانند کو دیکھے بغیر چین نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے میں بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ بیلور ماٹھ روانہ ہوا۔ اور دور تک یا شاید سارے رستے پیدل گیا۔ مجھے یہ جگہ جو دنیا کے شور و شر سے الگ تھی بہت پسند آئی۔ مگر جب وہاں یہ سنا کہ سوامی جی اپنے کلکتے والے مکان میں بیمار پڑے ہیں اور کسی سے مل نہیں سکتے۔ تو بہت افسوس اور مایوسی ہوئی۔

پھر میں نے بھگنی نیودیتا کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور چورنگی کے ایک عالیشان مکان میں

میں ان سے ملا۔ ان کی شان و شوکت کو دیکھکر میں دنگ ہو گیا۔ اور گفتگو میں بھی میری ان کی میزان نہ پہنچی۔ میں نے گوکھلے سے اس کا ذکر کیا انھوں نے کہا اس سیاب وش خاتون سے تمہارا دل نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مجھے ان سے ایک بار سپتو تجی بادشاہ کے یہاں پھر ملاقات ہوئی۔ جب میں پہنچا تو وہ سپتو تجی کی بوڑھی ماں سے باتیں کر رہی تھیں اور میں نے ان کی ترجمانی کی خدمت انجام دی۔ گو مجھ میں اور ان میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ گر میں نے دیکھا کہ ان کا دل ہندو دھرم کی محبت سے معمور ہے۔ اور مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ میں نے بعد کو کیا۔

میں دن کا کچھ حصہ کلکتے کے سربرآوردہ لوگوں سے ملکر جنوبی افریقہ کے متعلق گفتگو کرنے میں صرف کرتا تھا۔ اور باقی وقت میں شہر کے مذہبی اور قومی اداروں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ میں نے ایک جلسے میں جس کے صدر ڈاکٹر ملک تھے" جنگ بوئر میں ہندوستانی ایمبولینس کور کی خدمات" پر تقریر کی۔ اس موقعے پر بھی انگلشمین کے ایڈیٹر کی ملاقات میرے کام آئی۔ مسٹر سانڈرس اس زمانے میں علیل تھے۔ پھر بھی مجھے انہوں نے اتنی ہی مدد دی جتنی ۱۸۹۶ء میں دی تھی۔ گوکھلے کو میری یہ تقریر پسند آئی جب انھوں نے ڈاکٹر رائے کو اس کی تعریف کرتے سنا تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔

غرض گوکھلے کے ساتھ ٹہرنے کی بدولت مجھے کلکتے میں اپنا کام کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ اور بنگال کے ممتاز خاندانوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اسی سے ان تعلقات کی بنیاد پڑی جو مجھ میں اور اہل بنگال میں ہیں۔

جگہ کی کمی کے سبب سے میں اس یادگار مہینے کے بہت سے واقعات نظرانداز کرتا ہوں۔ صرف برما کے سفر کا ذکر کروں گا۔ کلکتے سے میں چند دن کے لئے برما گیا۔ اور وہاں کے پھنگیوں سے ملا۔ مجھے اُن کی کاہلی دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ میں نے سنہری مندر کی بھی زیارت

کی۔ مجھے وہاں بیشمار چھوٹی چھوٹی قندیلوں کا ملنا پسند نہ آیا۔ اور اس مقدس گھر میں چوہوں کی کثرت دیکھکر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو سوامی دیانند کو موندری میں پیش آیا تھا۔ برمی عورتوں کی آزادی اور مستعدی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مگر مردوں کی آرام طلبی نے اس خوشی پر پانی پھیر دیا۔ ان چند دنوں کے قیام میں مجھے یہ بات محسوس ہوئی کہ جیسے بمبئی ہندوستان نہیں ہے۔ اسی طرح رنگون بھی برما نہیں ہے اور جیسے ہم ہندوستانی انگریزوں کے کمیشن ایجنٹ بن گئے ہیں اسی طرح ہم نے برما میں انگریز تاجروں سے ملکر برمیوں کو اپنا کمیشن ایجنٹ بنا لیا ہے۔

برما سے لوٹ کر میں گوکھلے سے رخصت ہوگیا۔ اُن سے جدا ہونا مجھ پر بہت شاق تھا مگر چونکہ اب بنگال میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کلکتے میں میرا کوئی کام نہیں رہا تھا اس لئے یہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

میرا یہ ارادہ تھا کہ کسی جگہ مستقل قیام کرنے سے پہلے تیسرے درجے میں ہندوستان کا سفر کروں اور یہ معلوم کروں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ میں نے گوکھلے سے اس کا تذکرہ کیا پہلے تو انھوں نے اس خیال کا مضحکہ اڑایا مگر جب میں نے اپنی تجویز تفصیل سے بیان کی تو انھوں نے بڑی خوشی سے اس کی تائید کی۔ اس زمانے میں مسز بیسنٹ بنارس میں بیمار تھیں۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے وہاں جاکر ان کے درشن کرلوں۔

تیسرے درجے کے سفر کے لئے نیا سامان مہیا کرنا ضروری تھا۔ گوکھلے نے اپنے پاس سے مجھے ایک پیتل کا ناشتہ دان دیا۔ اور اس میں پوریاں اور لڈو بھروا دیئے۔ میں نے ایک کرمچ کا تھیلا بارہ آنے میں خریدا۔ اور چھایا کے اونی کپڑے کا ایک لمبا سا اونی کوٹ بنوایا۔ تھیلا اس لئے تھا کہ اس میں یہ کوٹ ایک دھوتی ایک تولیہ اور ایک قمیص

رکھ لوں۔ ان کے علاوہ میرے پاس ایک کمبل اور لوٹا بھی تھا۔ اس سازوسامان سے
میں نے اپنا سفر شروع کیا۔ گوکھلے اور ڈاکٹر رائے مجھے پہونچانے اسٹیشن آئے۔
میں نے ان دونوں سے درخواست کی کہ یہ زحمت نہ اٹھائیں مگر وہ نہ مانے۔ گوکھلے
نے کہا "اگر تم اول درجے میں جاتے تو میں نہ چلتا۔ مگر اب ضرور چلوں گا۔ گوکھلے کو کسی
نے پلیٹ فارم پر جانے سے نہیں روکا۔ وہ ریشمی پگڑی اور دھوتی باندھے اور کوٹ پہنے تھے
ڈاکٹر رائے بنگالی وضع میں تھے۔ انہیں ٹکٹ کلکٹر نے ٹوکا۔ مگر گوکھلے نے کہا کہ یہ میرے
دوست ہیں۔ تو انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔
غرض ان دونوں کی دعائیں لیکر میں روانہ ہوا۔
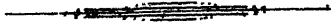
بیسواں باب

بنارس میں

مجھے کلکتے سے راجکوٹ جانا تھا۔ اور رستے میں بنارس، آگرہ، جے پور اور پالن پور ٹھہرنے کا قصد تھا۔ اور مقامات پر بھی ٹھہرتا۔ مگر اتنا وقت نہ تھا۔ ہر شہر میں میں نے ایک دن قیام کیا اور سوائے پالن پور کے سب کہیں معمولی جاتریوں کی طرح دھرم سالوں میں یا پنڈوں کے یہاں مہمان رہا۔ اس سارے سفر میں دمع ریل کے کرایہ کے اکتیس روپے سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔

اس تیسرے درجے کے سفر میں میں نے اکثر پسنجر میں جانے کو ڈاک گاڑی میں جانے پر ترجیح دی۔ کیونکہ ڈاک میں ایک تو مسافروں کی کثرت بہت ہوتی تھی۔ دوسرے کرایہ کسیقدر زیادہ تھا۔

اب بھی تیسرے درجے کی گاڑی اتنی ہی میلی ہیں اور پاخانہ کا انتظام اتنا ہی خراب ہے جتنا اس زمانے میں تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ تھوڑی سی ترقی ہوئی ہو لیکن اب بھی اول درجے اور تیسرے درجے میں جتنا فرق ہے وہ کرائے کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ تیسرے درجے کے مسافروں سے بھیڑوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے۔ اور ان کے ڈبے بھی بھیڑوں کے باڑے معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ میں میں تیسرے درجے میں سفر کیا کرتا تھا۔ مگر ایک بار میں نے اول درجے میں سفر کیا کہ دیکھوں دونوں میں کیا فرق ہے وہاں مجھے کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ جنوبی افریقہ میں تیسرے درجے کے مسافر عموماً حبشی ہوتے ہیں پھر بھی وہاں تیسرے درجے میں ہندوستان سے کہیں زیادہ آسایش ہے۔ جنوبی افریقہ

کے بعض حصوں میں تو تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے گدے دار بنچیں ہیں اور سونے کا بھی انتظام ہے۔ مسافروں کو بٹھانے میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ بہت بھیڑ نہ ہو جائے مگر ہندوستان میں عموماً ہر ڈبے میں مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر بھر جاتے ہیں۔

ایک تو ریلوے کے منتظمین تیسرے درجے کے مسافروں کی آسایش کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ دوسرے یہ مسافر خود اتنے میلے اور بے لحاظ ہوتے ہیں کہ جس شخص کے مزاج میں صفائی ہو۔ اس کے لئے تیسرے درجے میں سفر کرنا ایک مصیبت ہے۔ ان لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ ہر طرح کا کوڑا کچرا ریل کے ڈبے کے فرش پر پھینکتے جاتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر وقت تمباکو پیتے رہتے ہیں، پان چبایا کرتے ہیں۔ اور سارے ڈبے کو اگالدان بنا دیتے ہیں۔ ان کے شور و غل گالی گلوج سے دوسرے مسافروں کو چاہے جتنی تکلیف ہو۔ انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہیں نے ۱۹۰۲ء میں تیسرے درجے کا سفر کیا تھا۔ پھر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک مسلسل کرتا رہا۔ مگر اتنے عرصے میں مجھے تیسرے درجے کی حالت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔

مجھے اس صورت حال کا صرف ایک علاج نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تعلیمیافتہ اپنے اوپر لازم کر لیں کہ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کریں گے، عام مسافروں کی عادتوں کو سدھاریں گے۔ اور ریل کے ملازموں کو کبھی چین نہ لینے دینگے۔ بلکہ جب ضرورت ہوگی شکایتوں کی بھرمار کر دیں گے۔ اپنے آرام کے لئے رشوت یا دوسرے ناجائز ذرائع سے کام نہیں گے اور کسیکو قواعد کی خلاف ورزی نہ کرنے دیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے یقین ہے کہ بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔

افسوس ہے کہ ۱۹۲۰ء کی شدید علالت کے سبب سے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرنے کا معمول ترک کرنا پڑا مجھے اس کا بڑا رنج اور بڑی شرمندگی ہے خصوصاً اس لئے کہ یہ معذوری ایسے زمانے میں پیش آئی جب تیسرے درجے کے مسافروں کی شکایات

رفع کرنے کی تحریک اچھی خاصی چل رہی تھی۔ ریل اور جہاز کے غریب مسافروں کی تکلیفیں جو خود ان کی نامعقول عادتوں سے اور بڑھ جاتی ہیں، وہ ناجائز رعایتیں جو حکومت نے غیر ملکوں کی تجارت کو دے رکھی ہیں۔ اور اسی قسم کی اور چیزیں بجائے خود ایسے اہم مسائل ہیں کہ دو ایک حوصلہ مند اور مستقل مزاج آدمیوں کو اپنا سارا وقت ان کے لئے وقف کر دینا چاہئے۔

تیسرے درجے کے مسافروں کا ذکر یہیں پر چھوڑ کر میں وہ واقعات بیان کرتا ہوں جو بنارس میں پیش آئے۔ میں صبح کے وقت وہاں پہنچا۔ میں نے یہ طے کیا تھا کہ کسی پنڈے کے یہاں ٹھہروں گا۔ جیسے ہی میں گاڑی سے اترا مجھے بہت سے برہمنوں نے آکر گھیر لیا۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کا انتخاب کیا جو دوسروں کے مقابلے میں صاف ستھرا اور معقول معلوم ہوتا تھا۔ آگے چلکر معلوم ہوا کہ یہ انتخاب صحیح تھا اس کا مکان دو منزلہ تھا۔ صحن میں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اس نے اوپری منزل میں ٹھہرایا۔ میں پرانی رسم کے مطابق کھانا کھانے سے پہلے گنگا اشنان کرنا چاہتا تھا۔ پنڈا اس کا سامان کرنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے سے کہدیا تھا کہ میں تمہیں سوا روپے سے زیادہ دکشنا[1] نہیں دوں گا۔ تم اسی لحاظ سے سب کام کرنا۔

وہ اسی فوراً راضی ہو گیا اور کہنے لگا۔ "چاہے جاتری امیر ہو یا غریب دونوں کی سیوا ایک کرنا چاہئے۔ اب رہی دکشنا۔ جو جس کی جیسی حیثیت ہوتی ہے دیدیتا ہے۔" جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ پنڈے نے پوجا وغیرہ کے رسوم ادا کرنے میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ پوجا گیارہ بجے ختم ہوا اور میں درشن کے لئے کاشی وشوناتھ پہنچا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں جب میں بمبئی میں وکالت کرتا تھا میں نے پرارتھنا سماج ہال میں کاشی جاترا پر ایک لکچر سنا تھا۔ اس لئے میں پہلے سے سمجھتا تھا کہ یہاں آکر مایوسی ہوگی۔ لیکن اتنی سخت

---

[1] تحفہ۔ نذر

مایوسی کی توقع نہ تھی۔

مندر میں ایک تنگ گلی سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ جہاں بہیر پھیلتا تھا۔ خاموشی اور سکون نام کو نہ تھا بھیڑ کے ہجوم سے اور دوکانداروں اور جاتریوں کے شور وغل سے ناک میں دم آنے لگا۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں دھیان گیان کی فضا ہونا چاہیئے تھی۔ مگر معاملہ بالکل الٹا تھا۔ یہ فضا تلاش کرنے کے لئے انسان کو اپنے قلب کیطرف رجوع کرنا پڑتا تھا میں نے بعض عبادت گذار بہنوں کو دیکھا کہ دھیان میں ڈوبی ہوئی ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے لیکن اس میں مندر کے منتظمین کی کوئی تعریف نہ تھی۔ ان کا یہ کام تھا کہ مندر میں ایک پاکیزہ، پرسکون اور دلکش جسمانی اور روحانی فضا پیدا کریں۔ اس کے بجائے مجھے وہاں ایک بازار نظر آیا جس میں چالاک دوکاندار مٹھائیاں اور جدید ترین وضع کے کھلونے بیچ رہے تھے۔

مندر کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ سڑے ہوئے پھولوں کا ڈھیر لگا ہے جن کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے۔ مندر کا فرش نفیس سنگ مرمر کا تھا مگر کسی بد مذاق خوش عقیدہ شخص نے اسے جا بجا سے اکھاڑ کر روپئے جڑ دیئے تھے جن سے بدتر گردیں اٹھنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہو سکتی ہے میں جمنا[1] دیوی کے قریب گیا اس کے آس پاس کی جگہ بھی بہت میلی تھی میں نے یہاں خدا کو ڈھونڈھا مگر وہ مجھے نہ ملا میں جھلایا ہوا تھا اور میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ "دکشنا" دوں میں نے ایک پائی نکال کر اس پنڈے کے سامنے پھینکی جو "جمنا دیوی" کا نگراں تھا۔ وہ مجھ پر برس پڑا اور کہنے لگا تو اس اپمان[2] کی سزا میں نرگ[3] میں جائیگا"۔

مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا میں نے کہا "مہاراج میرا جو کچھ انجام ہونا ہے وہ ہوگا مگر آپ کو برہمن ہو کر یہ لام کاف زبان سے نہ نکالنا چاہیئے"۔

اس نے جواب دیا "چل دور ہو مجھے تیری پائی نہیں چاہیئے" اور اس کے بعد گالیوں

---

[1] علم کا کنواں۔ [2] بے ادبی۔ [3] جہنم۔

کی باڑھ چلی میں نے وہ پانی اٹھالی خوش خوش چلا کہ برہمن کے ہاتھ سے پانی بچالی۔ مگر وہ کب چھوڑنیوالا تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ اچھا پانی یہاں دھر دے میں تیرا جیسا نہیں ہونا چاہتا اگر میں تجھ سے یہ پانی نہ لوں تو تیرے لئے بہت برا ہوگا۔

میں نے با دل ناخواستہ پانی اس کے حوالے کی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

اس کے بعد مجھے دوبارہ کاشی وشوانا تھ جانیکا اتفاق ہوا مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ میرے نام کے ساتھ مہاتما کا دُم چھلا لگایا جاچکا تھا جن واقعات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان کا پیش آنا اب ناممکن تھا۔ لوگ میرے درشن کے شوق میں اُمڈے آتے تھے اور مجھے مندر کا درشن نہیں کرنے دیتے تھے۔ مہاتماؤں پر جو کچھ گذرتی ہے انہیں کا دل جانتا ہے۔ پھر بھی اتنا میں نے دیکھ لیا کہ یہاں کے میلے پن اور شور و شغف کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔

اگر کسی کو خدا کے بے حساب عفو اور رحم کی شان دیکھنا ہو تو ان مقدس مقامات کو دیکھے۔ یہ جوگیوں کا داتا لوگوں کو اپنے نام سے کیسی کیسی ریاکاری اور بیدینی کرتے دیکھتا ہے اور درگذر کرتا ہے۔ اس نے مدت ہوئی ہمیں آگاہ کر دیا ہے "جیسا کرنا ویسا بھرنا" کرم کے اٹل قانون سے کسیکو مفر نہیں۔ پھر خدا کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے تو قانون بنا کر گویا دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

مندر کی زیارت کے بعد میں مسز بیسنٹ کے درشن کے لئے گیا مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں۔ میری اطلاع ہوتے ہی وہ باہر تشریف لے آئیں میں تو صرف سلام کے لئے آیا تھا۔ اس لئے میں نے عرض کیا "مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ مجھے صرف سلام کرنا تھا۔ میں آپ کی اس عنایت کا شکر گذار ہوں کہ باوجود علالت کے آپ نے مجھ سے ملنا قبول فرمایا۔ میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

اکیسواں باب

بمبئی میں بس جانے کا ارادہ

گوکھلے کا اصرار تھا کہ میں بمبئی میں بس جاؤں اور وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں۔ قومی کام سے مراد ان دنوں کانگرس کی خدمت تھی۔ اور انھوں نے جو ادارہ قائم کیا تھا۔ وہ بھی زیادہ تر کانگرس ہی کا کام کرتا تھا۔

مجھے گوکھلے کا مشورہ پسند آیا۔ مگر مجھے وکالت چلنے کی کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ میں اب تک پہلی ناکامی کی تلخی کو نہیں بھولا تھا۔ اور مقدمے حاصل کرنے کے لئے خوشامد کرنا مجھے اب زہر لگتا تھا۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے راجکوٹ میں کام شروع کروں۔ وہاں میرے پرانے عنایت فرما کیول رام ماوجی دیو جنھوں نے مجھے انگلستان جانے پر آمادہ کیا تھا، موجود تھے۔ انھوں نے پہلے ہی دن مجھے تین مقدمے لاکر دئے۔ دو اپیلیں تھیں جو پولیٹیکل ایجنٹ کاٹھیاواڑ کے جوڈیشل اسسٹنٹ کے یہاں پیش ہونیوالی تھیں اور ایک ابتدائی مقدمہ جام نگر کا تھا۔ یہ معاملہ کسیقدر اہم تھا۔ میں نے کہا مجھے اپنے اوپر بھروسا نہیں۔ کہ اس مقدمے کی پیروی، جیسی چاہئے، کرسکوں گا۔ کیول رام دیو بولے۔ "تمھیں اپنے جیتنے سے کیا غرض۔ تم تو اپنی سی کوشش کرڈالو۔ آخر میں بھی تو تمہاری مدد کے لئے موجود ہوں۔

دوسری طرف سے سمرتھ جی آنجہانی وکیل تھے۔ میں نے خاصی تیاری کی تھی۔ میں خود تو ہندوستان کے قانون سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ مگر کیول رام دیو نے مجھے

ساری اونچ نیچ سمجھا دی۔ میں نے جنوبی افریقہ جانے سے پہلے دوستوں سے سنا تھا کہ سر فیروز
شاہ مہتا کو قانون شہادت ازبر یاد ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ میں نے یہ بات دل
میں رکھی تھی۔ اور سفر کے دوران میں قانون شہادت اور اس کی شرحوں کا اچھی طرح
مطالعہ کر لیا تھا۔ پھر جنوبی افریقہ میں اتنے دن وکالت کر کے جو تجربہ حاصل ہوا تھا وہ بھی
اسوقت کام آیا۔

میں مقدمہ جیت گیا۔ اور مجھے اپنی قابلیت پر تھوڑا بہت بھروسا ہو گیا۔ اپیلوں
کے بارے میں مجھے کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ ان دونوں میں کامیابی ہوئی۔ ان سب باتوں
سے میری ڈھارس بندھ گئی کہ شاید بمبئی میں بھی کام چلا لوں۔

لیکن بمبئی جانے کے اسباب بیان کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کردوں گا
جس سے مجھے انگریز افسروں کی جہالت اور بدسلوکی کا تجربہ ہوا۔ جوڈیشل اسسٹنٹ کی عدالت
کا کوئی مقام معین نہ تھا۔ وہ ہمیشہ دورے پر رہتا تھا۔ اور وکیلوں اور موکلوں کو اسکے
پیچھے پیچھے جانا پڑتا تھا۔ وکیل جب صدر مقام سے باہر جاتے تھے تو فیس زیادہ لیتے تھے
اس لئے بیچارے موکل پر دوہرا خرچ پڑتا تھا۔ اس کی اس مصیبت کی جج کو کوئی پروا نہ تھی۔

جس اپیل کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ویراول میں سنا جانے والا تھا۔ جہاں
شدت سے طاعون پھیلا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس چھوٹی سی جگہ میں جس کی آبادی
ساڑھے پانچ ہزار تھی، روز پچاس کیس تک ہو جاتے تھے۔ قصبہ قریب قریب خالی ہو گیا
تھا۔ میں ایک دھرم سالے میں ٹھہر گیا۔ جو شہر سے کچھ دور کے فاصلے پر واقع تھا۔ لیکن بیچارے
موکل کہاں ٹھہرتے۔ ان میں سے جو غریب تھے۔ ان کا خدا ہی حافظ تھا۔

میرے ایک دوست نے جن کے چند مقدمے اسی عدالت میں تھے مجھے تار
دیا کہ تم ویراول میں طاعون ہونے کی بنا پر یہ درخواست دیدو کہ پڑاؤ کسی اور جگہ منتقل
کر دیا جائے۔ جب میں نے درخواست دی تو صاحب نے کہا "آپ ڈرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "میرے ڈرنے نہ ڈرنے کا سوال نہیں میں تو اپنی فکر کر لوں گا مگر موکل کیا کریں گے" صاحب بولے "طاعون نے تو اب ہندوستان میں ڈیرہ ڈال دیا ہے اس سے ڈرنا کیا؟ دیراوال کی آب و ہوا بڑی اچھی ہے (صاحب قصبے سے دور سمندر کے کنارے ایک عالی شان خیمے میں رہتے تھے) لوگوں کو کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے"

اس فلسفے کے آگے ساری دلیلیں بیکار ثابت ہوئیں۔ صاحب نے سررشتہ دار سے کہا "مسٹر گاندھی جو کہتے ہیں اسے نوٹ کر لیجئے۔ اور یہ دریافت کر لیجئے کہ کیا واقعی وکیلوں یا موکلوں کو یہاں آنے میں بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے"

ظاہر ہے کہ صاحب نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے مناسب سمجھکر کیا لیکن اسے کیا خبر کہ غریب ہندوستان پر کیسی مصیبتیں گذرتی ہیں؟ وہ کیا جانے کہ ہندوستانیوں کی ضرورتیں، عادتیں خصوصیتیں کیا ہیں؟ جو شخص سونے کی گنیوں سے حساب کرنے کا عادی ہو وہ ایک دم سے تانبے کے پیسوں کی گنتی کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ جس طرح ہاتھی چاہے اپنی طرف سے کتنی ہی کوشش کرے۔ دنیا کو چیونٹی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح انگریز جو ہاتھی کی سی ضرورتیں رکھتا ہے چیونٹی کی زندگی بسر کرنے والے ہندوستانیوں کے طرز خیال کو اختیار کرنے اور اس کے مطابق قانون بنانے سے معذور ہے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل قصے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ باوجود اس کے کہ میری وکالت خوب چل رہی تھی۔ میرا قصد ابھی اور کچھ دن راجکوٹ ہی میں رہنے کا تھا مگر ایک دن کیولرام دیو آکر مجھ سے کہنے لگے "بھئی گاندھی ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم راجکوٹ میں پڑے سوکھا کرو۔ اب تو تمہیں بمبئی میں جاکر رہنا چاہئے۔

میں نے پوچھا "مگر وہاں میرے لئے کام کون فراہم کرے گا؟ کیا آپ میرے اخراجات کا ذمہ لیتے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا "ہاں میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔ ہم

لوگ تمہیں کسی دن بڑے نامی بیرسٹر کی حیثیت سے یہاں بلائیں گے۔ اور عرضداشتیں لکھنے کا کام وہیں بھیجدیا کریں گے۔ یہ تو ہم وکیلوں کے ہاتھ میں ہو کہ جس بیرسٹر کو چاہیں بڑھا دیں جسے چاہیں گھٹا دیں۔ تم نے جام نگر اور رو پڑا وال کے مقدموں میں اپنی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ اس لئے مجھے تمہاری طرف سے پورا اطمینان ہے۔ تمہیں خدا نے قومی کام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ہم تمہیں کاٹھیاواڑ میں گمنامی کی زندگی بسر نہیں کرنے دیں گے۔ اب بتاؤ بمبئی کب جاؤ گے؟"

میں نے کہا "مجھے نٹال سے ایک رقم کا انتظار ہے۔ اس کے آتے ہی چلا جاؤنگا۔ کوئی دو ہفتے میں روپیہ آگیا۔ اور میں بمبئی روانہ ہو گیا میں نے پین گلبرٹ اور سیانی کے دفتر میں کمرے کرائے پر لے لئے۔ اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب میرا مستقل قیام بمبئی میں رہے گا۔

بائیسواں باب

دھرم کی آزمائش

اگرچہ میں نے فورٹ میں دفتر کے لئے کمرے اور گرگام میں مکان لے لیا تھا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ میں یہاں مستقل قیام کروں۔ نئے مکان میں آتے ہی میرا منجھلا بیٹا منی لال جسے چند سال پہلے چیچک کا شدید دورہ ہو چکا تھا، تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اس کے پھیپھڑے میں ورم ہو آیا۔ اور رات کو ہذیان کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ دوا سے کچھ کام نہیں چلے گا۔ مگر انڈے اور چوزے کی یخنی دیجئے اس سے فائدہ ہوگا۔

منی لال اس زمانے میں صرف دس برس کا تھا۔ اس سے تو میں کیا پوچھتا۔ مجھے اس کے ولی کی حیثیت سے خود ہی فیصلہ کرنا تھا۔ یہ ڈاکٹر پارسی تھا۔ اور بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم سب نباتاتی ہیں یہ دونوں چیزیں بچے کو نہیں دے سکتیں۔ آپ کوئی اور چیز بتائیے۔

نیک ڈاکٹر بولا "آپ کے لڑکے کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے دودھ میں پانی ملا کر دیا جائے۔ مگر اس میں کافی غذائیت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بہت سے ہندو گھرانوں میں بلایا جاتا ہوں۔ ان لوگوں کو میں جو کچھ بتاتا ہوں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ خدا کے لئے اپنے بچے پر یہ ظلم نہ کیجئے۔"

میں نے کہا "آپ بالکل بجا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر کو یہی کہنا چاہئے۔ مگر میری ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ اگر لڑکا سیانا ہوتا تو میں یقیناً اسی سے پوچھتا اور جو وہ کہتا وہی کرتا

مگر یہاں تو اس کے بجائے مجھے فیصلہ کرنا ہے۔ میرے خیال میں ایسے ہی موقعے پر انسان کے عقیدہ ... کی آزمائش ہوتی ہے۔ اب چاہے یہ ٹھیک ہو یا نہ ہو مگر میرا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو گوشت انڈے وغیرہ نہیں کھانا چاہیئے۔ زندگی کی ضروریات کی بھی آخر حد ہوتی ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو جان بچانے کی خاطر بھی نہیں کرنا چاہئے۔ میرا مذہب مجھے ایسے موقعوں پر بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں گوشت اور انڈے کھاؤں یا اپنے بچوں کو کھلاؤں اس لیئے مجھے چار و ناچار اس خطرے کا مقابلہ کرنا ہے۔ جس کا آپ کو احتمال ہے۔ آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ آپ کی تدبیر پر عمل کرنے سے تو میں معذور ہوں۔ اس لئے میرا قصد ہے کہ پانی کے علاج سے کام لوں جس سے مجھے واقفیت ہے۔ مگر میں نہ بچے کی نبض دیکھ سکوں گا۔ اور نہ اس کے سینے پھیپھڑے وغیرہ کا معائنہ کر سکوں گا۔ اگر آپ کبھی کبھی آ کر اس کا معائنہ کر لیا کریں اور مجھے اس کی حالت بتا دیا کریں تو بڑا احسان ہو۔

نیک ڈاکٹر میری مشکلوں کو سمجھ گیا۔ اور اس نے میری درخواست قبول کر لی گو منی لال خود کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مگر میں نے اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو اسکو سنائی اور پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

اس نے کہا "آپ تو پانی کا علاج ہی کیجئے۔ مجھے انڈے ونڈے یخنی وخنی نہیں چاہئے۔" اس سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگرچہ یہ میں جانتا تھا کہ میں اسے یہ چیزیں دیتا تو وہ انکار نہ کرتا۔

میں کوہنے کے طریقۂ علاج سے واقف تھا۔ اور اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا میرا خیال تھا کہ فاقے سے بھی فائدہ ہوگا۔ اس لئے میں نے منی لال کو کوہنے کی ہدایت کے مطابق تین تین منٹ کے "ہپ باتھ" دینا شروع کئے۔ اور تین دن تک سوائے لیموں کے آبشورے کے کچھ کھانے پینے کو نہیں دیا۔

پاس چھوڑ کر چوپائی کی طرف ٹہلنے نکل گیا کہ ذرا حواس درست کرلوں۔ دس بج چکے تھے۔ راہگیر اکا دُکا نظر آتے تھے۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ بارالٰہا اس امتحان میں میری عزت تیرے ہاتھ ہے" اور زبان کو رام نام کی رٹ لگی تھی۔ کچھ دیر کے بعد گھر لوٹا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے گھر میں قدم رکھا۔ منی لال نے کہا "بابو تم آگئے؟"

"ہاں بیٹا آگیا"

"یہ چادر تو ہٹا دیئے۔ میرا گرمی کے مارے بُرا حال ہے"

"کیا پسینہ نکل رہا ہے"

"سارا بدن تر بتر ہے۔ خدا کے لئے اب یہ ہٹائیے"

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پسینے کے قطرے موتی کی طرح جھلک رہے تھے۔ بخار کم ہو رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"منی لال۔ بس اب تمہارا بخار اترنے ہی والا ہے۔ ذرا دیر اور پسینہ نکل لے پھر میں چادر ہٹائے لیتا ہوں۔

"نہیں میرے بابو میں ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے اس بھٹی سے نکالئے۔ چاہے پھر کبھی لپیٹ دیجئے گا"

میں نے اُسے سمجھا بُجھا کر چند منٹ اور چادر لپیٹی رہنے دی۔ اس کے ماتھے سے پسینے کی اولتی ٹپک رہی۔ میں نے چادر ہٹائی۔ اور اس کا بدن سکھایا۔ پھر ہم باپ بیٹے ایک ہی پلنگ پر سو گئے۔

دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح کو منی لال کا بخار بہت کم ہو گیا۔ چالیس دن تک اسے صرف پانی ملا۔ دودھ اور پھلوں کا عرق دیا گیا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہ تھا

یہ بڑا موذی بخار تھا۔ مگر اب قابو میں آگیا تھا۔

آج منی لال میرے لڑکوں میں سب سے زیادہ تندرست ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے محض خدا کے فضل سے صحت ہوئی۔ یا پانی کے علاج سے۔ یا غذا اور تیمارداری میں احتیاط کرنے سے؟ ہر شخص اپنے عقیدے کے مطابق جو چاہے سمجھ لے مجھے تو یہ یقین تھا کہ خدا نے میری عزت رکھ لی۔ اور یہی یقین آج تک قائم ہے۔

تیسواں باب

پھر جنوبی افریقہ چلا

منی لال اچھا ہوگیا۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ گرگام والا گھر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس میں سیلن تھی اور کافی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ اس لئے ریواشنکر جگجیون جی کے مشورے سے میں نے یہ طے کیا کہ بمبئی کے مضافات میں کوئی ہوادار بنگلہ لوں۔ میں باندرا اور سانتاکروز میں گشت لگاتا رہا۔ باندرا اس لئے پسند نہیں آیا کہ وہاں مسلخ تھا۔ گھاٹ کوپار اور اس کے گرد و نواح کے مقامات سمندر سے دور تھے۔ آخر ہمنے سانتاکروز میں ایک خوبصورت بنگلہ انتخاب کیا۔ اور چونکہ وہ حفظان صحت کے اعتبار سے بہت اچھا تھا اس لئے اسی کو لے لیا۔

میں نے سانتاکروز سے چرچ گیٹ تک کا اول درجے کا سیزن ٹکٹ خرید لیا مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات اول درجے میں میرے سوا کوئی مسافر نہیں ہوتا تھا اور اسپر میرے نفس کو ایک غرور سا بعض اوقات محسوس ہوتا تھا۔ اکثر میں باندرا تک پیدل جاتا تھا۔ اور وہاں سے تیز گاڑی میں بیٹھتا تھا جو چرچ گیٹ تک بیچ میں کسی اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی۔

مجھے اپنے پیشے میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ میرے جنوبی افریقہ کے موکل اکثر مجھے اپنے مقدمے دیا کرتے تھے۔ اور یہ میرے گذر اوقات کے لئے کافی تھے۔

• ابھی تک مجھے ہائیکورٹ کا کام نہیں ملا تھا لیکن ان دنوں ہائی کورٹ کے

وکلا مشق کے لئے فرضی مقدموں میں بحثیں کیا کرتے تھے۔ اور میں بھی وہاں جایا کرتا تھا۔ اگرچہ بحث میں شریک ہونے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی مجھے یاد ہے کہ جمبیت مرام ناتا بھائی اس میں نمایاں حصہ لیا کرتے تھے۔ دوسرے نومشق بیرسٹروں کیطرح میں بھی ہائی کورٹ میں مقدموں کی بحثیں سننے جایا کرتا تھا لیکن سچ پوچھئے تو مجھے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی اتنی خواہش نہ تھی جتنی سمندر کی ہوا کی۔ جو تھپکیاں دیکر سلا دیتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ صرف میں ہی اس نیند کے مزے نہیں لیتا ہوں بلکہ اور لوگ بھی ہیں وہاں یہ فیشن سا ہوگیا تھا۔ اس لئے اس میں کوئی شرم کی بات نہ تھی۔

تاہم میں ہائی کورٹ کے کتب خانے سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ تھوڑے دن میں ہائی کورٹ کا کام ملنے لگے گا۔

غرض ادھر تو میری وکالت میں کسیقدر اطمینان کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ اور اُدھر گوکھلے جو مجھے ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے، میرے لئے کچھ اور ہی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار میرے دفتر میں آجاتے تھے۔ اکثر اپنے ساتھ ان دوستوں کو لاتے تھے جن سے وہ مجھے ملانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے طریقہ کار سے برابر باخبر رکھتے تھے۔

مگر میری زندگی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے خود جتنے منصوبے سوچے خدا نے کسیکو پورا نہ ہونے دیا۔ اس نے مجھ سے وہی کام لیا جو اسے منظور تھا عین اسوقت جب میں یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا جنوبی آفریقہ سے اچانک یہ تار پہونچا۔ "یہاں چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے۔ مہربانی کرکے فوراً چلے آیئے۔" مجھے اپنا وعدہ یاد آگیا۔ اور میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ میں آنے کے لئے تیار ہوں۔ جب آپ روپیہ بھیجیں گے فوراً روانہ ہو جاؤں گا۔" تار پہنچتے ہی

روپیہ آگیا۔ میں نے اپنا دفتر توڑ دیا۔ اور جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔

میرا قیاس تھا کہ جس کام کے لئے میں جا رہا ہوں اس میں کم از کم ایک سال لگے گا۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ بنگلہ رہنے دوں اور بال بچوں کو اسی میں چھوڑ جاؤں۔

ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ اگر من چلے نوجوانوں کو اپنے ملک میں کام نہ ملے تو انہیں ترک کر کے دوسرے ملکوں میں چلا جانا چاہئے۔ اس لئے میں اپنے ساتھ ایسے چار پانچ نوجوانوں کو لے گیا جن میں مگن لال گاندھی بھی تھے۔

ہمارا خاندان ان دنوں بڑا تھا۔ اور اب بھی بڑا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں سے جتنے پرانی لکیر کو چھوڑ کر باہر جانے کی ہمت رکھتے ہوں انہیں ساتھ لیجاؤں میرے والدان میں سے اکثر کو ریاستوں میں نوکر رکھا دیتے تھے۔ میں انہیں اس طلسم سے نکالنا چاہتا تھا۔ انہیں کسی دوسری جگہ نوکری دلانا میرے اختیار میں نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو بھی میں کبھی نہ دلاتا۔ میری تو یہ خواہش تھی کہ یہ اپنے اوپر بھروسا کرنا سیکھیں۔

لیکن جوں جوں میرا نصب العین بلند ہوتا گیا۔ میں ان نوجوانوں کو بھی اپنی تمید پر آمادہ کرتا گیا۔ اور مگن لال گاندھی کی تربیت میں مجھے بہت بڑی کامیابی ہوئی اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بیوی بچوں سے بچھڑنا اچھے جمائے کارخانے کو توڑنا تھوڑے بے ٹھور ہونا، تھوڑی دیر مجھ پر شاق گذرا۔ مگر میں بے اطمینانی کی زندگی کا عادی ہو چکا تھا میرے خیال میں اس دنیا میں اطمینان کی توقع رکھنا بڑی غلطی ہے۔ یہاں سوائے خدا کے یعنی ذات الٰہی کے کسی چیز کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ یہ سارے کھیل جو دنیا کے پردے پر نظر آتے ہیں، چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ کسی کا بھروسا نہیں کسی کو ثبات نہیں۔ اس پردے کے اندر ایک بلند اور برتر ذات ہے۔ اور وہ سراپا حقیقت ہے۔

خوشا حال اس کے جو حقیقت کی جھلک دیکھ لے۔ جو حق کا دامن تھام لے۔ حق کی تلاش ہی زندگی کی معراج ہے۔

میں عین وقت پر ڈربن پہنچا۔ میرے لئے کام تیار رکھا تھا۔ مسٹر چیمبرلین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی۔ مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لئے عرضداشت مرتب کرنا تھی۔ اور وفد کے ساتھ جانا تھا